سویا مانے یاسر

غلام عباس

سویا مانے یاسر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۵

نیاز احمد نے
این کیو پرنٹر، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

قیمت -/۲۱۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0647 - 2

اردو تحقیق کے دو "خواجگان"

جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب

اور

جناب مشفق خواجہ صاحب

کے نام

جن کی سچی رہنمائی سے یہ مقالہ

مکمل ہو سکا

Hasnain Sialvi

1982ء کے موسم خزاں میں جاپان کے پُر رونق ثقافتی شہر کیوٹو کے ایک تھیٹر میں ایشیائی فلموں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ اس شام پروفیسر کاتاؤکا بھی میرے ساتھ تھے۔ فلم میں وقفہ کے دوران جب ہم کافی پینے لگے تو ہمارے ساتھ ایک نوجوان بھی موجود تھا۔ میں کاتاؤکا صاحب سے فلم کے بارے میں باتیں کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نوجوان کے چہرے پر بننے والے بے شمار نقش بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ اس بچے کی طرح لگا جو اپنی زبان سے ادا ہونے والے پہلے لفظ کے کرب میں مبتلا نظر آتا ہے۔ واقعتاً وہ کرب میں تھا۔ اس نے کافی کی لمبی سی چسکی لی۔ کچھ دیر تک اپنی سیال مخفی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اچانک اس کی زبان سے نکلا "فلم تو بہت خوب ہے" اس کے ساتھ ہی وہ اس کرب سے رہائی پا کر ایک خوش باش بچے کی طرح مسکرانے لگا۔

یہ سویامانے تھا۔۔ "اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز" میں میری کلاس کی ایک نشست پر بیٹھنے والا سال اول کا ایک کم گو طالب علم۔

سویامانے کو پاکستان اور اردو سے گہری محبت ہے، یہ محبت بھی خود ساختہ نہیں فطری سی ہے۔ شاید کسی پچھلے جنم میں اس کا تعلق اس سرزمین سے ضرور رہا ہو گا۔ 1983ء میں جب وہ پہلی بار پاکستان آیا تو میں نے اس کی تواضع پاکستانی کھانوں سے کی۔ اس نے یہ کھانے یوں کھائے کہ جیسے وہ صدیوں سے ان ذائقوں اور خوشبوؤں سے آشنا تھا۔ میرے گھر میں اس نے نمکین کشمیری چائے یوں پی کہ جیسے کوئی ٹھیٹ کشمیری پیتا ہے۔ ایک روز بارش برسی تو وہ لاہور کی مٹی سے اٹھنے والی خوشبو سے بہت متاثر ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گم گشتہ خوشبو کو دریافت کر کے اپنے آپ کو مکمل کر رہا تھا۔ 1989ء میں اس نے اوساکا سے ایم اے کر کے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کا رخ کیا۔ پھر اچانک پتہ چلا کہ وہ "آم" کا اسیر ہو گیا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ کسی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گا اور ایسا ہوا بھی۔ مگر کیا کیا جائے کہ وہ غزل کا طالب علم تھا۔ روایت کے حکم نامہ کے بموجب زلف نے بے وفائی کی۔ وہ ہجر و فراق کی لذتوں اور حرارتوں سے آشنا ہوا۔ اور یوں یامانے نے غزل کے عشق کا تجربہ کر کے اپنے آپ کو مکمل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

لاہور میں اس کے زمانۂ طالب علمی ہی کی بات ہے، میں اسے ملنے کے لئے نیو کیمپس ہوسٹل میں گیا۔ اس کا سارا کمرہ اردو کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب اردو ہی اس کا اوڑھنا

بچھونا بن چکی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے احساس ہوا کہ "اردو" اب اوڑھنا بچھونا ہی نہیں کھانا پینا بھی بن چکی ہے۔

جب وہ اوساکا آتا ہے تو اس کے دوست کہتے ہیں وہ پاکستانی ہو گیا ہے اور جب وہ پاکستان میں ہوتا ہے تو اسے شلوار قمیص اور سرحدی ٹوپی میں دیکھ کر ناآشنا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی ابھی گلگت یا ہنزہ کی بس سے اترا ہے اور شالیمار باغ دیکھنے جا رہا ہے۔

پہلے زمانوں میں بنگال کے جادو کے قصے سنتے تھے۔ اس صدی کے ربع آخر سے صنعت اور ٹیکنالوجی میں جاپان کا جادو بولنے لگا ہے اور وہ بھی ساری دنیا کے سر چڑھ کر ---- اور اب ادب میں جاپان کا جادو بولا ہے "غلام عباس" پر یہ کتاب پڑھیے اور یامانے کی محنت اور خلوص کی داد دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جادو بولے گا اور سر چڑھ کر بولے گا ----

تبسم کاشمیری

10- ستمبر 1995ء

اوراکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز، اوساکا

پیش لفظ

غلام عباس (1909ء تا1982ء) کو جدید اردو ادب میں ایک ممتاز، منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل ہے اور انہیں عموماً بحیثیت افسانہ نگار پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ غلام عباس کی تخلیقات دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں، لیکن ان کا معیار دوسرے افسانہ نگاروں سے کم نہیں۔ اس لئے آج بھی غلام عباس کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

غلام عباس نے اپنی زندگی میں تین افسانوی مجموعے، تین ناولٹ، بچوں کے لئے نظموں کا ایک مجموعہ، بچوں کے لئے کہانیاں، ترجمے اور مختلف قسم کے مضامین لکھے۔ ان تحریروں پر بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے بلکہ غلام عباس کی شخصیت اور فن دونوں پہلوؤں پر محققین اور ناقدین نے مضامین لکھ کر غلام عباس شناسی کے لئے خدمات انجام دی ہیں مگر ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کو دیکھا جائے تو غلام عباس شناسی کے لئے دو باتیں اب بھی پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ہیں، یعنی:

- غلام عباس کے سوانح کے متعلق جتنے تحقیقی مضامین لکھے گئے ہیں وہ اغلاط سے پاک نہیں ہیں اور ان میں مواد کی بھی کمی ہے۔
- غلام عباس کے فن کے بارے میں اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کام نہیں ہوا۔ یعنی غلام عباس کے اسلوب کے بارے میں بہت سے نقادوں نے کہا کہ افسانے میں دھیما پن موجود ہے مگر اس دھیمے پن کے بارے میں اسلوبیاتی حوالے سے بحث نہیں کی گئی، عموماً تاثرات کے مطابق بحث کی گئی ہے۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس مقالے کا تقاضا یہ ہے کہ:

1. غلام عباس شناسی کے لئے بنیادی معلومات یکجا ہو جائیں اور آج تک جتنے تحقیقی مضامین لکھے گئے ہیں، ان کی اغلاط کی تصحیح کی جائے۔
2. غلام عباس کے فن کی خصوصیات کو متن کی ساخت اور اسلوب کے حوالے سے دیکھنا

جائے اور اس سے غلام عباس کی افسانہ نگاری کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے۔
ان تقاضوں کو پورا کرنا اس مقالے کا مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل ماخذ سے استفادہ کیا گیا:

- غلام عباس کی شائع شدہ تحریریں
- غلام عباس کی غیر مطبوعہ تخلیقی تحریریں
- غلام عباس کے سوانح کے متعلق تحریریں
- غلام عباس کے سوانح کے متعلق غیر مطبوعہ تحریریں
- غلام عباس کے حوالے سے شائع ہونے والی نگارشات
- غلام عباس پر لکھی گئی غیر مطبوعہ تحریریں

اس مواد کو اکٹھا کرنا تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک بنیادی کام تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ جتنا مواد جمع کیا جاسکے، اس مقالے میں یکجا ہو جائے۔ اس کاوش کا نتیجہ سوانحی حصے میں پیش کیا گیا ہے۔
دوسرا کام غلام عباس کی تحریروں کو پڑھ کر انہیں فنی نقطۂ نظر سے خصوصیات کے مطابق تقسیم کرنے کا تھا اور اس کام کا نتیجہ فنی جائزے کے حصے میں پیش کیا جارہا ہے۔
اس تحقیقی مقالے کے دو ابواب ہیں۔ ایک سوانح کا تحقیقی جائزہ ہے اور دوسرا فن کا تحقیقی جائزہ اور ہر باب کی کئی ذیلی فصلیں ہیں۔ اس تقسیم کا مقصد یہ ہے کہ یہاں غلام عباس کی پوری زندگی کو آسانی کے لئے تین ادوار میں تقسیم کیا جائے اور ہر دور فنی ادوار میں منقسم ہو۔ ادوار کی تقسیم کے ساتھ غلام عباس کے سوانح کے متعلق جو واقعات سامنے آتے ہیں ان میں ایک دوسرے سے منطقی رابطہ قائم کر دیا جائے۔ اس کام سے غلام عباس کے سوانح کے ہر جزو کو دیکھتے ہوئے ان کی پوری زندگی کا ایک مجموعی خاکہ بھی نظر آجاتا ہے۔
فن کے باب کی ذیلی فصلوں میں فن کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ کرکے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالے کے لئے بہت سی شخصیات کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں صاحب کے پاس حلقہ ارباب ذوق (لاہور) کے سارے مشاعرے کے مضامین کی فہرست موجود تھی۔ انہوں نے اس مکمل فہرست میں سے غلام عباس کا پرانا فائل نکال کر دیا۔ غلام عباس کا "دھنک" جب حلقہ ارباب ذوق (لاہور) میں پڑھا گیا تھا تو وہاں ہنگامہ سا ہوا تھا۔ اس وقت کے اس سلسلے کا ایک اخباری مضمون ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے فائلوں میں محفوظ تھا۔ اس سے "دھنک" کی اشاعت کے بارے میں بعض باتیں واضح ہوئیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع مولانا

عبدالماجد دریا بادی تھا اور عبدالماجد دریا بادی کا تبصرہ "جزیرہ سخن وراں" کی دوسری اشاعت میں شائع ہوا تھا، اس سلسلے میں انہوں نے بعض مفید باتیں بتائیں۔ اسی طرح افسانہ "کتبہ" کے ایک غیر ملکی افسانے سے مماثلت کا بھی ذکر فرمایا۔ فخرالحق نوری صاحب نے ن۔ م۔ راشد کے متعلق خاص طور پر راشد کی دلی کی ملازمت کی وضاحت فرمائی اور اس وضاحت سے غلام عباس کی پہلی شادی اور "جزیرہ سخن وراں" کی پہلی اشاعت کے سنہ کا تعین ہو سکا۔ مرغوب حسین طاہر صاحب نے غلام عباس کے نایاب مضمون 'ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری' کے بارے میں آگاہ کیا۔ یہ مضمون رسالہ "اردو نامہ" میں شائع ہوا تھا۔ اگر طاہر صاحب یہ حوالہ نہ دیتے تو غلام عباس سے متعلق اس طرح کے تحقیقی رسالے کی طرف توجہ منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب نے مجھے اسی مضمون کا عکس عنایت فرمایا تھا۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مرحوم ڈاکٹر سجاد باقر رضوی صاحب جب کراچی میں مقیم تھے تو وہاں ان کی غلام عباس سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے جو واقعات سنائے، وہ سوانح کی تحقیق کے لئے مفید ثابت ہوئے۔

گوپی چند نارنگ صاحب نے اسلوبیاتی اور ساختیاتی مطالعے کے لئے جو طریقہ مجھے بتایا، میری کوشش یہ رہی کہ یہ کام اس کے مطابق ہو جائے۔

ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے ہاں غلام عباس کے ہندوستان میں چھپے ہوئے نسخے "محبت روتی ہے" اور "جزیرہ سخن وراں" محفوظ تھے اور انہی سے غلام عباس کے سوانح میں ایک نیا اضافہ ہو سکا۔ مظفر علی سید صاحب سے پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی تو مظفر صاحب نے غلام عباس کی وفات کے موقع پر پڑھا ہوا اپنا قطعہ عنایت کیا اور غلام عباس کی افسانہ نگاری پر بحث کی۔ آصف فرخی صاحب نے مختصر ملاقات کے باوجود غلام عباس کے بارے میں مفید معلومات مہیا کیں۔ اس طرح بیگم زینب عباس صاحبہ نے اپنی غیر مطبوعہ آپ بیتی کا جو عکس مجھے دیا ہے، اس سے غلام عباس کے سوانح کے متعلق بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ میں ان سب حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اس طرح میرے دوست غلام عباس گوندل صاحب نے مجھے دلی سے شائع شدہ "جزیرہ سخن وراں" کا پہلا ایڈیشن دیا اور زبیر خالد صاحب نے ن۔ م۔ راشد کا انٹرویو (مطبوعہ "ماہ نو" لاہور، "دھنک" مطبوعہ اردو ڈائجسٹ لاہور اور "جزیرہ سخن وراں" کا دوسرا ایڈیشن مجھے دیا۔ زاہد منیر عامر صاحب نے بھی غلام عباس کے متعلق ادبی رسائل ڈھونڈنے میں مدد فرمائی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہی میرا سہارا بن گئی۔ سہیل عباس صاحب کے ساتھ غلام عباس کے فن کے بارے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری صاحب اور پروفیسر کاگایا ہیروشی صاحب کی رہنمائی سے میرا اردو سیکھنے کا شوق اور زیادہ ہوا۔ اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے

غلام عباس کے افسانوں کے جاپانی ترجمے کی فہرست بھیج کر سوانح کے حصے کے لئے نیا اضافہ فرمایا اور پروفیسر آسادہ یوتاکا صاحب نے غلام عباس کی آواز میں ایک کیسٹ جاپان سے بھجوائی جو کراچی سے جاری کی گئی تھی۔ یہ بھی سوانح کے لئے اضافہ ثابت ہوا۔

یہ مقالہ اردو تحقیق کے دو "خواجہ" صاحبان یعنی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کے نام معنون کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب جو اس مقالے کے نگران اور پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر رہے، انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اگست، ستمبر اور نومبر 1991ء کی بہت سی قیمتی صبحیں اور راتیں میری راہنمائی کے لئے صرف کیں۔ یہ مقالہ پہلے میں نے اکیلے بیٹھ کر لکھا تھا اور پھر روزانہ زکریا صاحب کے گھر پر بیٹھ کر تصحیح ہوتی رہی۔ زکریا صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی ذہن اور رہنمائی کے بغیر یہ مقالہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا اور انہوں نے مجھے اورینٹل کالج میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع بخشا ہے۔ اس کے لئے معلوم نہیں کہ یہاں کیسے شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔

اس مقالے میں زینب عباس صاحبہ کی آپ بیتی کے علاوہ جتنی غیر مطبوعہ تحریریں ہیں، وہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ اردو تحقیق میں ایسے محققین بہت کم ہیں جو صحیح معنوں میں سنجیدہ اور مفصل تحقیق کرتے ہیں اور ان میں سب سے بڑا مقام مشفق خواجہ صاحب کو حاصل ہے اور ان کی محبت کا اظہار میں الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ اپنی مصروفیات کے باوجود اردو کے طالب علم کے لئے کبھی گھر کا دروازہ بند نہیں کرتے، وہ سچے "مشفق" ہیں اور مشفق صاحب کے ساتھ کراچی میں جو مختصر وقت گزارا (مگر آہ! یہ لمحہ مختصر) میرے لئے ہمیشہ یادگار رہے گا اور یقین سے کہتا ہوں کہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی زبان و ادب سے محبت کرنے والا شخص ہی سچا انسان ہوتا ہے۔ یہ مقالہ دراصل نومبر 1991ء میں مقالہ برائے ایم اے اردو کے طور پر پیش کیا گیا۔ پھر میں نے اس مقالے میں چند مقامات پر اضافہ کر کے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ 1991ء میں مقالہ مکمل کرنے کے بعد میں جاپان واپس چلا گیا تھا۔ اس لئے اس کے بعد کی غلام عباس شناسی کے سلسلے میں مجھے کم معلومات ملے۔ اس سلسلہ میں جناب طارق ہاشمی (متعلم اورینٹل کالج لاہور) نے میرے مدد کی۔ اس کے لئے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کتابی صورت میں شائع کرانے کے سلسلے میں زاہد منیر عامر صاحب اور محترم سلیم الرحمٰن صاحب کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ ان دونوں کے مشورے کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔

آخری سطروں میں میں اپنے پاکستانی بھائیوں کا نام لکھنا چاہتا ہوں۔ جن لوگوں سے آجکل کم ملاقات ہو رہی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ لاہور کے ان دنوں کی یادیں ہم سب کے دنوں میں اب بھی تازہ تازہ

ہوں گی۔ جاوید اکرام صاحب، زبیر ارشد ملک صاحب، شاہد عثمان صاحب، ندیم افضل ندیم صاحب، شبیر حسین صاحب، محترم عرفان علی صاحب، اور خواجہ عاکف مسعود صاحب۔ پھر سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد صاحب، اعجاز احمد صاحب اور افضال احمد صاحب کے بے حد ممنون ہوں۔

یہ مقالہ اردو کے عاشقوں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اور خواہش یہ ہے کہ میں بھی ان عاشقوں میں شامل ہو سکوں!

سویامانے (یاسر)

اسلام آباد

اپریل 1995ء

فہرست ابواب

پہلا باب:

صفحہ

غلام عباس کے سوانح کا
تحقیقی جائزہ

0 — 0 — 1 غلام عباس کے سوانح سے متعلق بنیادی باتیں

غلام عباس کی سوانح کے متعلق آج تک ① مرزا ظفر الحسن ("غلام عباس" رسالہ "غالب" ا 1975ء کراچی، ص 133 تا 152)، ② صہبا لکھنوی ("غلام عباس" رسالہ "افکار" اکتوبر 1981ء کراچی، ص 27 تا 28)، ③ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ("غلام عباس" "اردو افسانہ اور افسانہ نگار" جنوری 1982ء کراچی، ص 109 تا 111)، ④ سعید مرتضٰی زیدی ("غلام عباس" "تنقید ادب" 1983ء لاہور، ص 267 تا 269)، ⑤ افضال احمد "Ghulam Abbas–A Valedictory" (انگریزی) رسالہ "Third World International" 1983ء، ص 79 تا 81)، ⑥ ڈاکٹر انوار احمد ("غلام عباس" (مختصر سوانحی خاکہ) "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" 1988ء ملتان، ص 254 تا 255)، ⑦ شہزاد منظر ("غلام عباس ایک مطالعہ" 1991ء لاہور، ص 5 تا 17) مضامین پیش کئے جا چکے ہیں۔ [لہ] ان میں سے مرزا ظفر الحسن اور صہبا لکھنوی کے دونوں مضامین مفصل اور جامع ہیں۔ فرمان فتح پوری کے مضمون میں سوانح کے متعلق جو مواد موجود ہے وہ سب مرزا ظفر الحسن اور صہبا لکھنوی کے ہاں نظر آتا ہے بلکہ فرمان فتح پوری نے غلام عباس کے بارے میں اور ان کے افسانوں کے متعلق مجموعی طور پر اپنے تاثرات کا اظہار شامل کیا ہے۔ سعید مرتضٰی زیدی کا مضمون انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کے لئے ہے مگر غلام عباس کی سوانح کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ مواد کہاں سے اخذ کیا گیا ہے؟ ـــــ شہزاد منظر اور سعید مرتضٰی زیدی کے مضامین کے آغاز میں خاصی مماثلت نظر آتی ہے چنانچہ شہزاد منظر کا مضمون مرزا ظفر الحسن، آصف فرخی اور غلام عباس کے اپنے انٹرویو سے استفادہ کرکے لکھا گیا ہے۔ شہزاد منظر کے مضامین 1991ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے مگر مضامین تو اس سے پہلے رسائل میں چھپتے رہے تھے۔ اس لئے امکان ہے کہ سعید مرتضٰی زیدی نے شہزاد منظر سے استفادہ کیا ہو۔ افضال احمد کے مضمون میں بچپن اور آخری زمانے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے مگر درمیانی دور یعنی "آنندی" سے لے کر "کن رس" تک کے زمانے کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے حالانکہ غلام عباس کا فن اس زمانے میں نقطۂ عروج تک پہنچا تھا۔ انوار احمد نے اپنے مضمون

میں صہبا لکھنوی اور فرمان فتح پوری کے مضامین کا حوالہ دیا ہے اور ان کا مضمون تقریباً ان دونوں ہی کا عکس ہے مگر انہوں نے مرزا ظفر الحسن کے مضمون کا حوالہ نہیں دیا حالانکہ انوار احمد کے مضمون میں چند ایسی باتیں موجود ہیں جو مرزا ظفر الحسن کے مضمون سے استفادہ کی گئی ہیں مثلاً غلام عباس نے بی۔ اے کا امتحان تو دے دیا تھا مگر تقسیم ہند کے فسادات کی وجہ سے وہ ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ یہ بات پہلے مرزا ظفر الحسن کے ہاں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے غلام عباس کا یوم پیدائش 17 جنوری 1909ء قرار دیا ہے جبکہ صہبا لکھنوی اور فرمان فتح پوری دونوں نے 17 نومبر 1909ء لکھا ہے۔ شہزاد منظر کے مضمون میں تاریخی ترتیب سے زیادہ شخصیت کی تعمیر کی طرف توجہ دی گئی ہے اور ان کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ غلام عباس کی زندگی کے ایسے عناصر دریافت کرنا چاہتے ہیں جو ان کی افسانہ نگاری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شہزاد منظر نے غلام عباس کی تصانیف کی جو فہرست بنائی ہے اس میں تین غلطیاں ہیں۔ شہزاد منظر نے لکھا ہے کہ ان کا آخری مجموعہ 1981ء میں ''رینگنے والے'' کے عنوان سے چھپا۔ غلام عباس نے اپنے انٹرویو میں اسی عنوان سے مجموعہ چھپوانے کے ارادے کا اظہار تو کیا تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے نوٹ میں ''خوان یغما'' کے عنوان سے مجموعے کے لئے افسانوں کی فہرست بنا چکے تھے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ شہزاد منظر کی کتاب میں غلام عباس کا جو انٹرویو چھپا ہے، اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ غلام عباس کا افسانہ آنندی 1947ء میں لکھا گیا لیکن یہ دراصل 1939ء میں لکھا گیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ غلام عباس 1951ء میں لندن گئے مگر دراصل وہ 1949ء میں گئے تھے۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ غلام عباس کی سوانح کو جاننے کے لئے مرزا ظفر الحسن اور صہبا لکھنوی کے مضامین اچھے ہیں لیکن اس باب میں ان سارے مضامین کے ساتھ مزید حوالوں سے مدد لے کر غلام عباس کی سوانح کے بارے میں ایک مستند اور مفصل مضمون پیش کیا جائے گا۔ آصف فرخی کے انٹرویو میں سوانح کے متعلق بہت دلچسپ مواد موجود ہے یا غلام عباس کی بیوہ زینب عباس صاحبہ کی آپ بیتی (غیر مطبوعہ) بھی غلام عباس شناسی کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس باب میں ان کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے کارناموں کی کیفیات کے ذریعے ان کی ساٹھ سالہ ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی ادبی خدمات کو اور ان کے ادبی مقام کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

سلہ ان مضامین کے علاوہ بھی جب یکم نومبر 1982ء کو غلام عباس کا انتقال ہوا تو اس کے بعد کے اخبارات اور رسائل میں ان کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا گیا تھا۔

غلام عباس کی سوانح کا تحقیقی جائزہ

0 — 1 — 1 ترجمے کا دور (1909ء تا 1939ء)

1 — 1 — 1 ابتدائی دور (1909ء تا 1927ء)

مرزا ظفرالحسن [1]، صہبا لکھنوی [2]، فرمان فتح پوری [3]، سعید مرتضیٰ زیدی [4]، افضال احمد [5] اور شہزاد منظر [6] سب نے غلام عباس کا یوم پیدائش 17 نومبر 1909ء لکھا ہے جبکہ انوار احمد نے نومبر کی جگہ جنوری لکھا ہے۔ [7] یہ ممکن ہے کہ نمبر "گیارہ" کی جگہ "ایک" لکھا ہو لیکن غلام عباس کی بیوہ زینب عباس نے اپنی غیر مطبوعہ آپ بیتی "You Never Can Tell" یا "Out of Paddintion" (647 صفحات پر مشتمل انگریزی تصنیف) میں یوں لکھا ہے:

"Abbas was born in Amritsar in 1907. For thirty years I thought he was was born in 1909, which w... the date given in his passport and on other official documents. But this date related to some early convinience in his early service life." [8]

لیکن اب کوئی ایسا مواد یا چیز اس آپ بیتی کے سوا دستیاب نہیں ہے جس کے ذریعے غلام عباس کے سنہ پیدائش کو 1907ء ثابت کیا جاسکے۔ سارے سرکاری کاغذات، پاسپورٹ، اخبارات، رسائل اور ادبی مضامین میں غلام عباس کا سنہ پیدائش 1909ء لکھا ہوا ہے بلکہ انہوں نے خود اپنے انٹرویو میں 1909ء کہا تھا۔ علاوہ ازیں غلام عباس نے 1950ء کے قریب خود انگریزی میں اپنا سوانحی خاکہ لکھا تھا، تب بھی انہوں نے سنہ پیدائش 1909ء قرار دیا۔ اس لئے یہاں غلام عباس کے سنہ پیدائش کو 1909ء تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اتنا حوالہ بھی دیا گیا ہے کہ کم از کم غلام عباس نے سنہ پیدائش

کے سلسلے میں اپنی بیگم کے ساتھ 1907ء کا ذکر کیا تھا۔

یوں غلام عباس 7 نومبر کو امر تسر میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام بھی غلام عباس تھا۔ بعد میں جب 1925ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ ٹالسٹائی کی کہانی کا اردو ترجمہ کر کے رسالہ "ہزار داستان" میں شائع کیا تھا تو اس وقت ان کا نام "غلام عباس لدھیانوی" تھا۔ [9] پھر 1932ء کے رسالہ "فردوس" میں جب مضمون پیش کیا تھا تو اس وقت ان کے نام کے ساتھ "مولانا" بھی لگا ہوا تھا۔ [10] "لدھیانوی" لکھنے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کے والد کا وطن لدھیانہ ہو گا۔

غلام عباس کے والد کا نام میاں عبدالعزیز تھا اور وہ "ٹائم زیڈر" تھے مگر یہ معلوم نہیں کہ "ٹائم زیڈر" کس قسم کے کام کو کیا جاتا ہے اور غلام عباس ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ [11] ان کا خاندان شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور ان کے بچپن میں جب محرم کا دن آتا تو ان کی والدہ غلام عباس کو امام حسین کا فقیر بنا کر اور کالا لباس پہنا کر لوگوں سے بھیک مانگنے کے لئے بھیجا کرتی تھیں۔ [12] 1980ء یا 1981ء میں انہوں نے زکوٰۃ اور عشر کے سلسلے میں ایک درخواست نامہ بناتے ہوئے لکھا:

"I, Ghulam Abbas, son of M.Abdul Aziz, Muslim, Adult, aged 72, resident of 6/7-H. P.E.C.H. Society Karachi-29, do hereby state on solemn affirmation by Allah that:

1. I am Muslim and follow Shia Fiqah Jafaria.

2. According to faith I am not obliged to pay." [13]

جب غلام عباس کی عمر چار سال کی ہوئی تو اپنی والدہ، نانی اور نانی کی بہن (جن کو پاؤں کی خرابی کی وجہ سے چلنے میں دقت ہوتی تھی) کے ہمراہ امر تسر سے لاہور آ گئے۔ لاہور میں انہوں نے بھاٹی گیٹ کے قریب ایک مکان لیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں بہت سے ادیب رہتے تھے۔ اس لئے حکیم احمد شجاع نے اس علاقے کو "لاہور کا چیلسی" قرار دے کر اسی عنوان سے وہاں رہنے والے ادیبوں کا تذکرہ لکھا تھا۔ "لاہور کا چیلسی" جب کتابی صورت میں چھپی تو اس کے ابتدائیہ میں ڈاکٹر محمد اجمل نے لکھا:

"اس کتاب میں ایک نامور ادیب جناب غلام عباس مرحوم کا ذکر نہیں جو بھاٹی گیٹ میں رہتے تھے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غلام عباس مرحوم نے احمد شجاع صاحب کی زندگی میں وہ شہرت نہیں پائی تھی جو انہیں بعد میں ایک بے مثال ادیب کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔" [14]

جس طرح "لاہور کا چیلسی" میں بھی ذکر آتا ہے اس زمانے میں بھاٹی گیٹ کے ارد گرد اردو کے نامور ادیب، حکیم، طبیب، مفکر اور سیاست دان رہتے تھے اور نیرنگ خیال یا ہزار داستان جیسے ادبی رسائل بھی وہیں سے نکلتے تھے۔[15]

غلام عباس نے بچپن اس ماحول میں گزارا تھا۔ ان ادبی رسائل سے تعلق رکھنے والے شعراء اور ادباء کو دیکھا تھا۔ اس لئے انہیں ابتدائی عمر ہی سے شعر و ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

جب غلام عباس کی شیر خوارگی کے دنوں میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی والدہ نے دوسری شادی کر لی۔[16] اس کے بعد جب غلام عباس کی عمر نو برس ہوئی تو ان کے سوتیلے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔[17] عباس کو سوتیلے باپ سے بہت محبت تھی، سوتیلے باپ کی تجہیز و تکفین کی رسوم کے وقت غلام عباس کو چند پیسے دیئے گئے اور کہا گیا کہ ذرا دور جا کر کھیلیں۔[18] اس وقت کے غلام عباس کی گھریلو صورتحال ان کے ایک افسانہ "تنکے کا سہارا" سے مماثل نظر آتی ہے اور انہوں نے خود ایک مرتبہ یہ لکھا تھا:

"تنکے کا سہارا ۔۔۔ یہ خود مجھ پر ہی گزری ہوئی وارداتیں ہیں۔"[19]

کوئی کمانے والا نہ رہ جانے کی وجہ سے ان کے گھر کی اقتصادی صورتحال بہت خراب تھی مگر غلام عباس کی والدہ اپنے زمانے میں ایسی عورت تھی جس کو شعر و ادب کا شوق تھا اور خود ناول وغیرہ پڑھتی تھی۔ اس لئے اس کو تعلیم کی اہمیت کا بھی شعور تھا۔ جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو اس نے گھر کے سامنے سڑک پر پان، سگریٹ اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔[20]

چھوٹے عباس روزانہ اس دکان سے مٹھائی لے کر دوستوں کے ساتھ کھیلنے میں مشغول رہا کرتے تھے۔ 'آنندی'، 'اوورکوٹ'، 'سایہ'،۔۔۔ جیسے بہت سے افسانوں میں پان والی دکان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ بظاہر اس کا سبب ان کے بچپن کا یہی مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

غلام عباس امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی مادری زبان پنجابی ہی ہو سکتی ہے اور ویسے ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" میں حفیظ ہوشیار پوری کے پنجابی اشعار کے علاوہ اس زمانے کی مقبول پنجابی شاعری کے بول بھی نظر آتے ہیں۔[21] "نیا ادارہ" کے ریاض احمد چوہدری کا کہنا ہے کہ غلام عباس جب بھی مکتبہ جدید یا نیا ادارہ آتے تو پنجابی میں گفتگو کرتے تھے[22] لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی والدہ کا افغان خاندان سے تعلق تھا۔ اس لئے عباس کی نانی اور نانی کی بہن گھر میں فارسی بولتی تھیں۔[23] عباس کی نانی کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں ہوا تھا لیکن نانی کی بہن عباس کو ہمیشہ فارسی قصے اور داستانیں سناتی رہتی تھی۔[24] اب یہ معلوم نہیں کہ نانی کی بہن نے عباس کو داستانیں کون سی زبان میں سنائی تھیں لیکن چونکہ غلام عباس کے غیر مطبوعہ نوٹ میں "کتبہ" کا

فارسی ترجمہ (نامکمل صرف ایک صفحہ کا ہے لیکن خود غلام عباس کی لکھائی میں ہے اور اس پر خود اس کی تصحیح) بھی موجود ہے۔ (25)

اس سے یہ واضح ہے کہ غلام عباس کو فارسی اس قدر آتی تھی کہ اپنے افسانے کا ترجمہ کر اور فارسی آنے کی بڑی وجہ ان کا خاندان تھا۔ اگرچہ غلام عباس کو اپنے افسانوں میں فارسیت کا غلبہ پسند نہیں۔ غلام عباس نے 1963ء میں جب رسالہ پھول کا انتخاب کر کے دیباچہ لکھا تو اس وقت مولوی ممتاز علی کا ایک قول استعمال کر کے اس سے اتفاق کیا:

"آج کل بہت سے لوگ لکھے پڑھے عالم فاضل ہو کر جاہل بنے جاتے ہیں، کسی کو اپنی زبان میں بے ضرورت عربی، فارسی کے مشکل لفظ بولنے کا شوق ہے اور کسی کو اس میں خواہ مخواہ ہندی اور سنسکرت گھسانے کی دھت ہے۔ دونوں فریق غلطی پر ہیں اور ملک کو گمراہ کرتے ہیں۔" (26)

اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ غلام عباس کو فارسی آتی تھی مگر انہوں نے شعوری طور پر اپنے افسانوں میں فارسیت نہیں آنے دی۔

بہرحال لڑکپن میں غلام عباس کے شعر و ادب سے دلچسپی لینے کی وجوہات میں ان کے گھریلو ماحول، والدہ کی تعلیم ادب سے دلچسپی اور نانی کی بہن کی داستان گوئی کا ذکر آنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ خود عباس کو نانی کی بہن کی داستانیں دیر تک یاد رہیں۔ (27)

غلام عباس کا داخلہ دیال سنگھ ہائی سکول لاہور میں ہوا تھا۔ 1922ء میں جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے، انہوں نے "بکری" کے عنوان سے ایک کہانی لکھی۔ جب عباس نویں جماعت میں داخل ہوئے تو استاد نے عباس کی حوصلہ افزائی کی اور عباس خود بھی انگریزی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ کرنے لگے۔ (28)

افضال احمد کے بقول غلام عباس 14 سال کی عمر تک سرشار، شرر، رسوا کے علاوہ "طلسم ہوش ربا" بھی مکمل پڑھ چکے (29) تھے۔ اس طرح مرزا ظفرالحسن کے ہاں بھی یہ ذکر آتا ہے:

"تیرہ چودہ سال کے سن ہی سے انہوں نے پڑھنا لکھنا شروع کر دیا تھا۔ سرشار، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسے ادیبوں کی ساری تخلیقات پڑھ چکے تھے۔ شرر سے بے حد متاثر تھے یہاں تک کہ ان کی تاریخ کی کتب بھی بڑے شوق سے پڑھ چکے تھے۔" (30)

مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ 1924ء یا 1925ء میں جب عباس نویں جماعت میں پڑھتے تھے تو ان کو لاہور کی چند اہم شخصیات سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ وہ انٹرویو میں کہتے ہیں:

"میں (غلام عباس) چغتائی صاحب (عبدالرحمٰن چغتائی) سے پہلی مرتبہ 1924ء یا 1925ء میں

ملا تھا۔ اس زمانے میں رسالہ "نیرنگ خیال" کو نکلے چند ہی مہینے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے ایک دوست ہوتے تھے، بدرالدین بدر۔۔۔ انہوں نے پانوں کی دکان کھولنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر چند ہی روز میں لاہور کے پانی والا تالاب کے قریب ایک موقع کی جگہ دیکھ کر پانوں کی دکان سجالی۔ اس دکان پر اکثر شام کو تاثیر صاحب (ڈاکٹر تاثیر) چغتائی صاحب، حکیم یوسف حسن (مدیر نیرنگ خیال)، ڈاکٹر سید نذیر احمد، مولوی بخش مسلم (لاہوری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے خطیب تھے) اور یہ خاکسار اکٹھے ہوا کرتے۔ ہم لوگ پان پر پان کھاتے رہتے اور ادب اور آرٹ پر باتیں کرتے رہتے۔"(31)

ان شخصیات سے ملاقاتوں کے باعث غلام عباس کے ذہنی ارتقاء میں کافی تیزی سے اضافہ ہوا ہوگا۔ عبدالرحمن چغتائی نے غلام عباس کے مجموعوں "آنندی" اور "جاڑے کی چاندنی" کے سرورق بنائے۔(32)

جب غلام عباس کی عمر 14 سال کی تھی، انہوں نے کسی اشاعت خانہ سے رابطہ قائم کیا اور انگریزی نظموں اور کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کر کے بطور معاوضہ تھوڑا سا پیسہ حاصل کرنے لگے۔ عباس کا رجحان اس زمانے میں انگریزی ادب کے مطالعہ اور ترجمے کی طرف تھا۔ عباس کی تعلیم اور افراد خانہ کی گزر اوقات کے لئے گھر کی زمین اور زیورات بیچے گئے لیکن انگریزی ادب پڑھنے اور لارنس گارڈن میں کھیلنے میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ نویں جماعت کا امتحان پاس نہ کر سکے تو ان کی والدہ نے عباس کا تدریسی سلسلہ ختم کروا دیا۔ پاس نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں غلام عباس کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ مرزا ظفرالحسن نے لکھا ہے:

"غلام عباس کو تین چار برس موسیقی سے گہری دلچسپی رہی اور یہی وہ زمانہ ہے جب انہیں عبدالوحید خاں کا قرب حاصل رہا۔ ابتدا میں جب ان کا سن پندرہ سولہ سال تھا، انہیں وائلن بجانے کا شوق ہوا۔ مال روڈ لاہور پر ایک گوانس کا سکول تھا، جہاں یورپی موسیقی سکھائی جاتی تھی۔ فیس دس پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ غلام عباس نے وہاں داخلہ لیا اور کوئی تین ماہ تک وائلن پر یورپی دھنیں بجانے کی تعلیم حاصل کی۔ لاہور ہی میں ایک اور ہندوستانی موسیقی کا ادارہ تھا۔ گندھرو ودیالیہ، مراٹھے وائلن نواز پنڈت ڈھنڈی راج ہندوؤں اور مسلمانوں کو وائلن سکھاتے تھے۔ غلام عباس پنڈت جی کی وائلن نوازی سے اتنے متاثر ہوئے کہ مغربی موسیقی کو خیرباد کہا اور پنڈت جی کے شاگرد ہو گئے اور ان سے دو برس تک وائلن سیکھتے رہے۔"(33)

عباس کی والدہ نے ایک عزیز کی مدد سے عباس کو سٹیشن کے مال گودام پر ملازمت میں لگایا۔ اس

ملازمت کی تنخواہ تیس روپے تھی۔[39] مال گودام یا سٹیشن کا ذکر غلام عباس کے بعض افسانوں مثلاً 'چکر'، 'فیشنی ہیر کٹنگ سیلون' وغیرہ میں موجود ہے اور خود غلام عباس نے 'چکر' کے پس منظر کے بارے میں لکھا ہے:

''چکر'۔۔۔ کے لکھنے کی یوں تحریک ہوئی کہ دلی آنے سے پہلے میں ایک ایسی جگہ رہتا تھا جہاں کئی تانگے والوں کے گھر تھے۔ یہ تانگے والے رات بھر تانگے چلا کر واپس آتے تو اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کی مالش کیا کرتے، ان کے جسموں پر تھپکیاں دیتے اور ساتھ ساتھ وہ گھوڑوں کو پیارے پیارے ناموں سے پکارتے اور انہیں چمکاتے۔ میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس کی تھی، دن بھر کرکٹ، فٹ بال یا کبڈی کھیل کر میں اتنا تھک جاتا کہ جی چاہتا کوئی میری ٹانگیں دبائے۔ گھر میں، میں اور میری والدہ اور دو بوڑھی نانیاں رہتی تھیں۔ مجھے ان سے ایک حسرت سی بن گئی اور مجھے ان گھوڑوں پر رشک آنے لگا۔ 'چکر' کا بنیادی خیال اس حسرت کا مرہون منت ہے۔ اس حسرت کی یاد ہمیشہ میرے دل میں تازہ رہی چنانچہ اس کے کوئی تقریباً پندرہ برس کے بعد دلی میں کاغذ کے ایک بیوپاری کی دکان میں ایک بہت ضعیف منشی کو دیکھ کر جسے سیٹھ ان کاموں کی فہرست بطور یادداشت لکھوا رہا تھا جو اسے انجام دینے تھے۔ 'چکر' کا افسانہ خود بخود میرے ذہن میں تیار ہو گیا۔''[35]

مال گودام کی ملازمت ملنے کے باوجود چونکہ عباس کو انگریزی ادب کے ترجمہ کا شوق تھا، اس لئے وہ والدہ کا بنایا ہوا کھانا لے کر سٹیشن پر نہیں بلکہ ایک قبرستان کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر ترجمہ کا کام کرتے۔ درخت کے سائے میں کتابیں پڑھنے والے لڑکے کا تصور ''گوندنی والا تکیہ'' کے مرکزی کردار ''سلطان'' کے ہاں نظر آتا ہے۔

کوئی چھ مہینے کے بعد جب عباس کو ترجمہ کا معاوضہ ملا اور غلام عباس نے والدہ کو یہ رقم دی تو والدہ کو بہت حیرت ہوئی۔[36] یوں 17 یا 18 سال کی عمر تک عباس نے متعدد کہانیوں کا ترجمہ کر لیا تھا۔ مرزا ظفر الحسن کے بقول غلام عباس کو اپنی تحریر کا اولین معاوضہ رسالہ ''نیرنگ خیال'' سے ملا۔ مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں:

''انہیں اپنی تحریر کا اولین معاوضہ ''نیرنگ خیال'' سے ملا۔ 1929ء کے سالنامے میں جو بڑے سائز پر چھپا تھا، غلام عباس کا افسانہ ''موت کا درخت'' شائع ہوا اور انہیں بیس روپے دیئے گئے۔''[37]

1925ء میں رسالہ ''ہزار داستان'' کے مدیر حکیم احمد شجاع نے غلام عباس سے فی ہفتہ پانچ روپے کا معاہدہ کر کے ٹالسٹائی کے ناول "The Long Exile" کا ''جلاوطن'' کے عنوان سے

ترجمہ کرایا اور یہ ترجمہ باقاعدگی سے رسالہ "ہزار داستان" میں چھپتا رہا۔ حکیم یوسف حسن کے دوسرے رسالے "تازیانہ" میں بھی غلام عباس نے چند مزاحیہ کالم لکھے تھے۔

"جلاوطن" کے بارے میں خود غلام عباس کا کہنا ہے:

"مجھے صحیح معنوں میں ادب میں 1925ء میں پہچانا گیا۔ میرا افسانہ "جلاوطن" 1925ء میں "ہزار داستان" میں شائع ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے افسانہ لکھتے ہوئے 55 سال ہوچکے ہیں۔ میں نے جب پہلا افسانہ لکھا اس وقت میری عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ یہ دراصل ٹالسٹائی کے ایک افسانے "لانگ اگزائیل" کا ترجمہ تھا۔ اس دور میں میری کیا Vocabulary (ذخیرہ الفاظ) رہی ہوگی۔ میں نے بہت مشکل سے لیکن بہت آسان زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ مجھے یاد ہے "ہزار داستان" نے اس افسانے پر ایک تعریفی نوٹ لکھا تھا، جس میں میری زبان کی سادگی کی تعریف کی گئی تھی جس پر مجھے ہنسی آئی۔ میں نے دراصل 1924ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ جنوری 1925ء میں "ہزار داستان" میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔"(38)

رسالہ "ہزار داستان" حکیم احمد شجاع نے لاہور سے جاری کیا تھا اور ہادی حسین اور عابد علی عابد جیسی ہستیاں بحیثیت ایڈیٹر اس سے وابستہ رہ چکی ہیں۔(39)

اس زمانے میں غلام عباس کے ترجمے نہ صرف "تازیانہ" اور "ہزار داستان" بلکہ "نیرنگ خیال"، "ہمایوں"، "سہیلی"، "امرتسر" جیسے اہم ادبی رسائل میں بھی چھپتے رہے اور اس کی وجہ سے ان کی جان پہچان بھی ہونے لگی۔ یہ سب کچھ 1927ء میں یعنی غلام عباس کے اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے کی بات ہے۔

1927ء تک کی کہانیوں میں 'جلاوطن'، 'بچوں کی محبوبہ'، 'غم نصیب سپاہی'، 'چاند کی بیٹی'، 'جادو کا لفظ'، 'آسیا'، 'ثریا کی گڑیا'، 'نگار خانہ چین'، 'ترکی ٹوپی'، 'برف کی بیٹی'، وغیرہ شامل ہیں اور 'چاند کی بیٹی'، اور 'ثریا کی گڑیا'، چھوٹے سے کتابچے کی صورت میں چھپی تھیں۔ شہزاد منظر نے لکھا ہے:

"بچوں کی کہانیوں اور ڈراموں پر مشتمل ان کی پہلی کتاب "ثریا کی گڑیا" 1925ء میں شائع ہوئی۔"

لیکن صہبا لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے بچوں کے لئے کئی کتابیں تحریر کیں۔ "چاند کی بیٹی" (جاپانی اور دوسری کہانیاں" "جادو کا لفظ" (ماخوذ شدہ ڈرامہ) 1926ء میں "ثریا کی گڑیا" (ڈرامہ) 1927ء میں "برف کی

بٹی" روس اور دیگر کہانیاں 1929ء میں۔"(36)

"نگار خانہ چین" چین کی مختصر نظموں کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ عبدالرحمن چغتائی کو بہت پسند آیا تھا۔ اس سلسلے میں غلام عباس کا کہنا ہے:

"اس میں چینی شاعری کے نمونے نثر میں لکھے گئے تھے۔ میں نے اس کی کئی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا اور چغتائی صاحب کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ تاثیر نے صلاح دی کہ "چینی شاعری کے بہتر نشتر" نام رکھ کر کتاب چھاپ دو مگر میں کوئی تیس چالیس نشتروں سے زیادہ جمع نہ کر سکا۔۔۔ اس واقعے کے کوئی بیس برس بعد جب میں دلی میں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے "آواز" کا ایڈیٹر تھا تو ایک دن اچانک مجھے چغتائی صاحب کا خط ملا، لکھا تھا "جلد سے جلد چینی نظمیں مکمل کر کے مجھے بھیج دو۔ میں ان کی تصویریں بھی بناؤں گا اور شائع بھی کروں گا۔" میں نے معذرت کرتے ہوئے جواب میں لکھا کہ وہ زمانہ گیا جب ایسی چیزوں کی قدر کی جاتی تھی۔ آج کل تو شاید اس قسم کی تحریروں کو پسند ہی نہ کیا جائے۔"(41)

یہ غلام عباس کا ابتدائی دور تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنے شوق سے ترجمہ کرتے تھے جس سے انہیں کچھ رقم بھی حاصل ہو جاتی تھی اور یہی وہ دور تھا جب انہوں نے نانی کی بہن کی داستانوں سے دلچسپی لی اور اسی عہد میں انگریزی کے متعدد ادبی کارناموں کو پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ اس طرح ادبی شعور پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ ان دونوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں دیکھے گھریلو مسائل اور ماحول کی یادوں کو بھی پیش کیا اور یہ واقعات ہی ان کے بیشتر افسانوں کا پس منظر بن کر ہمارے سامنے آنے لگے۔

1928ء میں غلام عباس کی زندگی میں ایک اہم واقعہ آتا ہے اور اس سال کے بعد غلام عباس بحیثیت ادیب باقاعدہ طور پر تخلیقی عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

حواشی

(1) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس' رسالہ "غالب" (1) 1975ء کراچی ص 134

(2) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" اکتوبر 1981ء کراچی ص 27

(3) فرمان فتح پوری غلام عباس' "اردو افسانہ اور افسانہ نگاری" جنوری 1982ء کراچی ص 9

(4) سعید مرتضیٰ زیدی 'غلام عباس' "تنقید ادب" 1983ء لاہور ص 267

(5) افضال احمد 'Ghulam Abbas- A Valedictory' رسالہ "Third World International"

1983ء کراچی ص 80

(6) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" 1991ء لاہور ص 5

(7) انوار احمد 'ڈاکٹر' "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" 1988ء ملتان ص 254

(8) زینب عباس ایضاً (غیر مطبوعہ) س ن' کراچی 263

(9) غلام عباس 'جلاوطن' رسالہ "ہزار داستان" 1925ء لاہور ص 32 تا 39

(10) غلام عباس 'جاپانی شاعرہ عورتیں' رسالہ "فردوس" جلد 5 نمبر 1' ص 5 تا 7

(11) زینب عباس ایضاً ص 263

(12) زینب عباس ایضاً ص 625

(13) غلام عباس 'Declaration' (مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے)

(14) محمد اجمل ڈاکٹر 'ابتدائیہ' "لاہور کا چیلسی" از حکیم احمد شجاع دسمبر 1988ء لاہور ص 5

(15) حکیم احمد شجاع "لاہور کا چیلسی" ص 25 تا 26' 33 تا 34

(16) زینب عباس "You Never Can Tell" ص 263

(17) زینب عباس' ایضاً ص 263 تا 264- سعید مرتضیٰ زیدی اور شہزاد منظر دونوں لکھتے ہیں کہ ان کے دوسرے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب غلام عباس نویں جماعت میں پڑھتے تھے اور والد کے انتقال کی وجہ سے ان کو تدریسی سلسلہ چھوڑنا پڑا تھا- (سعید مرتضیٰ زیدی ص 267' شہزاد منظر ص 5) "نو سال" کی عمر اور "ویں جماعت" کے فرق کی وضاحت بعد میں (حواشی نمبر 33) کی جائے گی-

(18) زینب عباس' ایضاً ص 264

(19) غلام عباس "نوٹ" (عنوان نہیں دیا گیا) س ن' ص 16

(20) زینب عباس "You Never Can Tell" 264

(21) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" 1982ء لاہور

اس کتاب میں مثلاً "جیو مینڈھا لال' جیو مینڈھا سائیں" (ص 38)

"باؤ جی بجلی آئی اے جدی چند واننگن رشنائی اے" (ص)

"میں اے بی سی پڑھ گئی آں' انارکلی وچ وڑ گئی آں" (ص)

وغیرہ نظر آتے ہیں-

(22) ریاض احمد چوہدری 'انٹرویو' 17 اگست 1991ء

(23) زینب عباس ایضاً ص 263' زینب عباس نے نانی اور ان کی بہن کی زبان فارسی لکھی ہے' مگر یہ ممکن ہے کہ یہ زبان پشتو یا دری ہو چونکہ زینب عباس انگریز نژاد ہیں- اس لئے غلام عباس نے ان کو سمجھانے کے لئے پشتو (یا دری) کی بجائے "فارسی" کہہ دیا ہو-

(24) زینب عباس' ایضاً ص 264

(25) یہ نوٹ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے- 12 لائنوں پر مشتمل ترجمہ ہے- آغاز یوں ہوتا ہے- (عنوان نہیں دیا گیا) "دریک فرنگی شہر یک سلسلہ طویلی عمارت ہا است- ہمہ تقریباً یک وسعی دگرد ہر یک باغچہ ای پر فضا- دفتر فانسائے گوناگوں- بزرگ و کوچک در ایں عمارت ہا میماند' و بیش و کم چہار ہزار نفر کار ہا میکنند---"

(26) غلام عباس "پھول" "انتخاب 1963ء کراچی ص 12 تا 13

(27) زینب عباس ایضاً ص 264

(28) سعید مرتضیٰ زیدی نے استاد کا نام "مولوی طالب علی" لکھا ہے (ص 267) اور شہزاد منظر نے "مولوی لطیف علی"

لکھا ہے (ص 5)

(29) افضال احمد "Ghulam Abbas" 1983ء ص 80

(30) مرزا ظفرالحسن ایضاً ص 135

(31) غلام عباس اور آغا عبدالحمید چغتائی 'چند یادیں' (گفتگو) "عبدالرحمن چغتائی شخصیت اور فن" مرتبہ وزیر آغا 1980ء لاہور 85 تا 86

(32) ان شخصیات کے علاوہ زینب عباس نے غلام مصطفیٰ صوفی تبسم سے بھی اس زمانے میں ملاقات ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (زینب عباس ایضاً ص 267)

(33) سعید مرتضیٰ زیدی اور شہزاد منظر نے تدریسی سلسلہ ختم ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ عباس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا مگر یہ ممکن ہے کہ کبھی غلام عباس نے نویں جماعت کا امتحان پاس نہ کر سکنے کا واقعہ چھپا کر والد کے انتقال کو سلسلہ تدریس ختم ہونے کا سبب قرار دیا ہو۔ ان کی بیوہ نے لکھا ہے کہ جب والد کا انتقال ہوا تب عباس کی عمر نو سال کی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ "نو سال" کے الفاظ "نویں جماعت" سے کسی نہ کسی طریقہ سے بدل گئے ہوں۔

(34) مرزا ظفرالحسن 'غلام عباس' 1975ء ص 135

(35) غلام عباس نوٹ (غیر مطبوعہ) س ن

(36) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" لاہور 1991ء ص 105

(37) مرزا ظفرالحسن ایضاً ص 135

(38) شہزاد منظر ایضاً ص 15

(39) صہبا لکھنوی 'غلام عباس'، رسالہ "افکار" کراچی 1981ء ص 27

(40) شہزاد منظر ایضاً 15

(41) غلام عباس اور آغا عبدالحمید 'چغتائی--- چند یادیں'، "عبدالرحمن چغتائی--- شخصیت اور فن" لاہور 1980ء ص 100

2—1—1 پھول کا دور (1928ء تا 1938ء)

1927ء تک کے غلام عباس کے ادبی عمل اور 1928ء کے بعد کے عمل میں تین فرق نظر آتے ہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ 1928ء میں جب غلام عباس رسالہ "پھول" اور "تہذیب نسواں" سے براہ راست وابستہ ہوئے تو وہ باقاعدگی سے ادبی زندگی گزارنے لگے۔ یعنی 1927ء تک تو وہ کبھی کبھار کہانیاں یا ترجمہ پیش کرتے تھے مگر 1928ء کے بعد ان کے لئے ادب روزی کا ذریعہ بھی بن گیا۔ ادب ان کی زندگی میں نہ صرف شعوری سطح پر بلکہ عملی سطح پر بھی اہمیت رکھنے لگا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ 1928ء کے بعد غلام عباس بہت سی کہانیاں "پھول اور تہذیب نسواں" کے لئے لکھنے لگے یعنی "پھول" اور "تہذیب نسواں" کی ادارت حاصل کرنے سے ادب کی طرف ان کا میلان بڑھ گیا۔ اس لئے اس دور کو ترجمہ اور تخلیق دونوں کے حوالے سے بھرپور دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ کے سلسلے میں 1930ء "الحمراء کے افسانے" کی اشاعت بڑی کامیابی سے ہوئی تھی اور 1933ء میں "مجسمہ" اور 1937ء میں "جزیرۂ سخنوران" کی اشاعت بھی ہوئی۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ رسالہ "پھول" سے وابستہ رہنے سے غلام عباس کی واقفیت لاہور سے باہر کے ادباء تک پھیل گئی چونکہ رسالہ "پھول" کے لئے برصغیر کے بہت سے مقامات کے ادباء اپنی کہانیاں پیش کرتے تھے (بلکہ یہ رسالہ دور دور تک یعنی پشاور سے کلکتہ تک شوق سے پڑھا جاتا تھا) اس لئے بہت سے لوگوں کو "غلام عباس" کا نام معلوم ہوا اور اس زمانے میں غلام عباس کے جتنے دوست تھے وہ بھی ادب سے وابستہ تھے۔ یہ دوست لاہور سے نکل کر دوسرے مقامات پر جانے لگے تو ان کی وجہ سے غلام عباس کی واقفیت کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ بعد میں جب غلام عباس کے بچپن کے دوست ڈاکٹر تاثیر رسالہ "کاروان" نکالنے لگے تو عباس نے تاثیر سے رابطہ قائم کیا اور اسی رسالے میں اپنی کہانیاں پیش کیں۔ اس کے بعد دلی کے آل انڈیا ریڈیو کے لئے بھی وہ ڈرامے وغیرہ پیش کرنے لگے بالآخر 1939ء میں ان کو آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔

1928ء سے لے کر 1938ء تک کے یہ دس سال غلام عباس کے لئے بہت اہم تھے۔ وہ اردو

ادب کے قارئین میں متعارف ہو گئے۔ 1939ء میں افسانہ 'آنندی' کے ذریعے "افسانہ نگار غلام عباس" کا مقام ان کو ملا لیکن یہ دس سال غلام عباس کے لئے ایسا دور تھا کہ وہ تخلیق سے زیادہ ترجمے اور ماخوذ تحریروں کے ذریعے اپنے افسانے کی تخلیق کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔

1928ء سے 1938ء تک کا دس سالہ دور "عظیم افسانہ نگار غلام عباس" کے وجود میں آنے سے پہلے ایک پس منظر کا درجہ رکھتا ہے۔

"یہ لاہور کا وہ زمانہ تھا جب پرانی تہذیب پر نئی روشنی کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے تھے اور لوگوں کے رہن سہن، لباس، وضع قطع اور عادات و اطوار میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی جا رہی تھی۔ آئے دن مغرب میں نئی نئی ایجادیں ہو رہی تھیں اور انگریزی عملداری کی بدولت ہندوستان والے بھی اپنی مرضی سے یا اپنی مرضی کے خلاف ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ ادھر ملک میں قدامت پسندوں کی ایک کثیر تعداد ایسی تھی جو ہر نئی چیز کی خواہ وہ مفید ہی کیوں نہ، مخالفت پر تلی رہتی تھی۔

اس کام میں پنجابی زبان کے شاعر بھی خاص طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ لوگ جب کسی نئی چیز کو رواج پاتے ہوئے دیکھتے تو فوراً اسے شعر کا موضوع بنا لیتے۔ جب لاہور شہر کی سڑکوں کو بجلی کے کھمبوں سے آراستہ کیا گیا تو کسی پنجابی شاعر نے جھٹ اس پر نظم لکھ ڈالی۔

"باؤ جی بجلی آئی اے جدی چندوانگن رشنائی اے"

بائیسکل کا رواج ہوا تو اسے "شیطانی چرخہ" کہہ کے اس کا مذاق اڑایا گیا اور دل کے پھپھولے پھوڑے گئے۔

چونکہ یہ نظمیں چار یا چھ صفحوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھیں اس لئے نہ تو ان کی چھپائی میں دیر لگتی اور نہ کچھ خرچ ہی زیادہ آتا۔ ایسی کتابیں آئے دن کثرت سے نکلتی رہتیں۔ لوگ انہیں سستے داموں کتب فروشوں سے خرید لاتے اور دن بھر شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گا گا کر انہیں بیچتے پھرتے!

"باؤ جی بن گئے جنٹل مین"

"میں اے بی سی پڑھ گئی آں، انار کلی وچ وڑ گئی آں"

لے لو دو دو پیسے۔۔۔" (۱)

"بدقسمتی سے ان دنوں لاہور میں خدا بخش کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ یہ اقتصادی کساد بازاری کا زمانہ تھا۔ دفتروں میں ملازموں کی تنخواہ میں دس فیصد کی تخفیف کر دی گئی تھی۔ ہر طرف

بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ ہر شخص اشیاء کی گرانی پر نالاں تھا۔"(2)

غلام عباس کے اس ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" میں جو لاہور کا ماحول پیش کیا گیا ہے، وہ اقتصادی کساد بازاری کا زمانہ یعنی 1930ء کے بعد کا دور ہے۔ نئی تہذیب کی آمد کے ساتھ ساتھ لاہور کی معاشرتی فضا بھی بدلتی جا رہی تھی۔ اس اقتباس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ لاہور میں بکثرت رسائل اور کتابیں چھپ رہی تھیں۔ ان میں اخبارات، قصے، داستانیں، مذہبی اور اخلاقی رسائل بھی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر اصلاحی رسائل یا تعلیم کے متعلق رسائل بھی چھپتے تھے اور اس زمانے میں لاہور میں بہت سے اشاعت خانے قائم کئے گئے تھے۔ مثلاً 1935ء میں "مکتبہ اردو" قائم ہوا جہاں سے جدید اردو ادباء کی متعدد تصانیف شائع ہوئیں۔ خاص طور پر 1946ء میں جب مکتبہ اُردو کی تقسیم ہوئی تو "مکتبہ جدید" اور "نیا ادارہ" جیسے جدید اردو ادب کے اہم ادارے قائم ہوئے۔

غلام عباس کا گھر اردو بازار کے قریب ہی واقع تھا اور وہ اس ماحول میں غیر ملکی ادب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ غلام عباس اس زمانے میں اپنے آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اپنے لاہور کے قیام کے دوران مجھے کبھی کبھار مختلف تکیوں میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ کبھی پنجابی کا کوئی مشاعرہ اس کا محرک ہوتا تھا۔ کبھی دو نامی گرامی گویوں کا استادی گانوں کا مقابلہ، کبھی حال و قال کی کوئی محفل اور میں ایک محویت کے عالم میں اس کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے دو تین بڑے روسی ناول پڑھے تھے۔۔۔"(3)

اس سے ان کے بچپن کے ماحول کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ غلام عباس کو کونسی چیزوں سے دلچسپی تھی۔ بہرحال لاہور کے ان اصلاحی رسائل میں دو نامور رسائل تھے۔ ایک "پھول" اور دوسرا "تہذیب نسواں"۔۔۔ یہ دونوں سید امتیاز علی تاج کے دارالاشاعت پنجاب کی جانب سے نکلتے تھے اور غلام عباس نے ان دونوں رسائل میں اپنی کہانیاں شائع کروائیں۔

یہ معلوم نہیں ہے کہ غلام عباس کی امتیاز علی تاج سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لاہور کے پانوں کی مذکورہ دکان پر ملاقات ہوئی ہو یا کہانیاں لکھنے کے سلسلے میں کسی دوسرے مقام پر ملے ہوں۔

زینب عباس لکھتی ہیں کہ غلام عباس کی عمر 16 سال ہونے سے پہلے یعنی میٹرک کی سند حاصل کرنے سے پہلے ان کو رسالہ "پھول" کی ادارت مل گئی تھی (4) لیکن یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح سعید مرتضیٰ زیدی، انوار احمد، افضال احمد اور شہزاد منظر سب نے لکھا ہے کہ جب ان کی عمر 19 سال کی ہوئی (یعنی 1928ء میں) تو ان کو رسالہ کی ادارت ملی۔ اسی طرح خود غلام عباس نے بھی

لکھا ہے کہ 1928ء سے رسالہ "پھول اور تہذیب نسواں" کی ادارت ملی، یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ (5)

رسالہ "پھول" 1909ء میں لاہور کے دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہونے لگا تھا جسے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے جاری کیا تھا۔ حفیظ جالندھری، نشتر جالندھری، عبدالمجید سالک اور وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے ادیب "پھول" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ (6)

یہ بچوں کے لئے ہفت روزہ رسالہ تھا اور 48 سال مسلسل نکلتا رہا اور درمیان میں یہ سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ اس رسالے میں برصغیر کے مختلف مقامات کے مختلف ادیبوں کی تحریریں شامل ہوتی تھیں۔ ان میں متعدد مصنفین ایسے تھے جنہوں نے بعد میں جدید اردو افسانہ نگاری میں نامور ادباء کی حیثیت حاصل کی۔ مثلاً سید امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز علی، شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ۔ اس طرح "پھول" میں چھوٹے بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں لکھی گئیں اور ان کہانیوں کا انتخاب 1963ء میں غلام عباس نے شائع کرایا۔ (7) بعد میں شیما مجید نے تیس جلدوں پر مشتمل باتصویر کتابیں چھپوائیں۔ ان میں غلام عباس کی بیس کہانیاں شامل ہیں۔ یعنی "اندھا فقیر، ایک آنکھ والا دیو، ایک ٹانگ کا بادشاہ، بدصورت چڑیا، بہادر اقبال، بے چارہ سپاہی، جلاوطن، چوں چڑیاں، دنیا کی پہلی تیتری، رونے والا درخت، سبز گیند، سورج مکھی کا پھول، سوئی ہوئی شہزادی، شہزادہ اور گلاب، شہزادی سیلوری، کنول کی شہزادی، کھلونوں کی بستی، معذور لڑکی، ننھا چڑا اور ننھی چڑیا" (8)

رسالہ "پھول" چھوٹے بچوں کے لئے نکلتا رہا تھا اور جس طرح "تہذیب نسواں" خواتین کی اصلاح کے لئے نکلتا تھا۔ اس طرح ایک لحاظ سے بچوں کی اصلاح اس رسالے کا مقصد تھا۔

یہ ضرور ہے کہ غلام عباس ان دونوں رسائل کے ادارتی عملے میں کام کرتے رہے مگر یہ صحیح طرح معلوم نہیں کہ ان کو کون سی حیثیت ملی تھی۔ "انتخاب پھول" میں غلام عباس کا کہنا ہے:

"راقم الحروف کو بھی اسی اسکول سے وابستگی کا شرف حاصل رہا ہے اور اسے فخر ہے کہ جتنے طویل عرصے (1928ء تا 1937ء) اس نے "پھول" کی ادارت کی خدمت انجام دی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد اور کسی ایڈیٹر نے انجام نہیں دی۔" (9)

اسی طرح غلام عباس نے دوسرے موقع پر "پھول" کے بارے میں بتایا ہے:

"پھول اخبار کی خوبی یہ تھی کہ تنخواہ وقت پر ملتی تھی۔ خرابی یہ کہ کم ملتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپے مگر اتنی تنخواہ پر ان کے تمام پیش رو اور ان سے سینئر ادیب کام کر چکے تھے۔" (10)

پھول" میں ایڈیٹر کا نام شائع نہیں ہوتا تھا بلکہ لفظ ایڈیٹر ہی لکھا جاتا تھا۔ دوسری جگہ پر غلام عباس یوں لکھتے ہیں:

"1928 -1937

Editor "Phool" (Children's Weekly in Urdu), Lahore;
Assistant-Editor "Tehzib-i-Niswan" (Women's Weekly in Urdu) Lahore;
Also Write several plays for All India Radio, Dehli." [11]

پھر جب 1932ء میں رسالہ "نیرنگ خیال" میں غلام عباس کی تخلیق "شہزادہ کا سپنا" چھپی تو اس کے ساتھ اس کا نام یوں لکھا گیا ہے:

"از جناب غلام عباس صاحب سب ایڈیٹر پھول" [12]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1932ء میں غلام عباس رسالہ "پھول" کے سب ایڈیٹر تھے۔ رسالہ "پھول" کے پرانے شمارے آج کل مشکل سے ملتے ہیں۔ میرے پاس "پھول" کی فوٹو کاپیاں موجود ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری، دیال سنگھ لائبریری اور حجاب امتیاز علی کے گھر میں اصل شمارے ہیں، یہ ان کا عکس ہیں۔ ان کو دیکھا جائے تو 1928ء کے "پھول" میں سات اسی طرح 1929ء کے "پھول" میں اکیس، 1930ء کے "پھول" میں غلام عباس کی نو کہانیاں موجود ہیں۔ "پھول" ہفت روزہ رسالہ تھا اور ہر شمارے کی ابتداء میں دنیا کے مختلف واقعات کو آسان اور سلیس زبان میں پیش کیا جاتا تھا اور اس خبرنامے کے بعد چار یا پانچ کہانیاں ہوتی تھیں۔ ان شماروں میں سے صرف ایسے پرچوں کا جائزہ لیا جائے گا جن میں غلام عباس کی کہانیاں خبرنامے کے فوراً بعد شامل ہیں اور ان میں سے بیشتر کہانیاں پہلے صفحہ پر پیش کی گئی ہیں۔ 1929ء اور 1930ء میں علی الترتیب اکیس میں سے تیرہ اور نو میں سے پانچ کہانیاں سب سے پہلے پیش کی گئی ہیں۔ کہانی کا سب سے پہلے پیش کیا جانا کہانی اور مصنف کی مقبولیت پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جس شخص کو ایڈٹ کرنے کا حق اور طاقت ہو، وہ اپنی کہانی کو سب سے پہلی جگہ دے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ غلام عباس کا بچوں کی کہانیوں کا تخلیقی عمل 1928ء کے بعد زوردار ہو گیا مثلاً یکم دسمبر 1928ء کے "پھول" میں "نظربندی کا کھیل" شامل ہے [13] اور اسی تاریخ کے "تہذیب نسواں" میں "جنتی چڑیا" بھی پیش کی گئی۔ [14] اسی طرح 6 اپریل 1929ء کے پھول میں "برف کی بیٹی" [15] اور "تہذیب نسواں" "خاندانی تحفہ" [16] موجود ہیں۔ 13 جولائی 1929ء کے "پھول" میں "ایک ٹانگ کا بادشاہ" [17] اور "جگنوؤں کا شکار" [18] دو کہانیاں شامل ہیں۔ 1930ء کے دوران 4 جنوری کے پھول میں "جلاوطن

[19]اور تہذیب نسواں میں "سبز طوطا"[20] پیش کیں اور اس سبز طوطا" کے آخر میں "باقی آئندہ" لکھا ہوا ہے اور عنوان کے ساتھ ساتھ "ایک افسانہ" بھی ہے۔ پھول کی کہانیاں بچوں کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن "تہذیب نسواں" کی کہانیاں خواتین کے لئے تھیں یعنی "کہانی" سے نکل کر "افسانہ" کے قریب تر انداز کی تخلیق بھی غلام عباس کرتے تھے اور "باقی آئندہ" کا مطلب یہ کہ وہ نسبتاً لمبی کہانی بھی لکھ رہے تھے۔

1929ء کے "پھول" میں 21 جنوری سے لے کر 16 فروری تک 9 ہفتوں کے لئے ملکہ مہرنگار،[21] نامی کہانی پیش کی اور جنوری 1930ء کے "پھول" سے ٹالسٹائی کی "جلاوطن" شروع ہوئی اور 25 جنوری تک یعنی چار قسطوں میں چھپی۔ علاوہ ازیں ان میں سے چند کہانیاں کتابچے کی صورت میں بھی چھپیں۔ رسالہ "پھول" میں ایک اشتہار دیا ہوا ہے۔

"غلام عباس صاحب کی کتابیں

الحمراء کے افسانے

ثریا کی گڑیا

جادو کا لفظ یا گستاخ لڑکا

چاند کی بیٹی

ملنے کا پتہ: دفتر اخبار "پھول" لاہور

سید امتیاز علی تاج نے غلام عباس کی کسی کتاب کے بارے میں عبدالرحمٰن چغتائی کے نام خط لکھا اور اس میں یہ کہا کہ شائع کرنے سے پہلے زبان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تاج نے لکھا:

"--- میں نے عباس صاحب کی کتابوں کے مسودوں کو دیکھا۔ کتابیں اچھی خاصی ہیں لیکن اصلاح کی ضرورت سے بے نیاز نہیں۔ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں زبان کا چٹخارہ دینے سے لطف دوبالا ہو سکتا ہے اور اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ میں ان کو شائع کرنے سے پہلے ان پر وقت صرف کروں۔ اجرت پر آپ اس نقطۂ نظر سے غور فرمایئے کہ اس قسم کے لکھنے والے جن کی کتابیں نظر ثانی کے بعد چھپنے کو دی جاسکتی ہیں عام طور پر ساٹھ ستر روپے ماہوار پر مل جاتے ہیں اور وہ ایک مہینے میں اتنی ضخامت کی کم از کم پانچ چھ کتابیں ترجمہ کر سکتے ہیں---"[22]

گویا امکان موجود ہے کہ سید امتیاز علی تاج غلام عباس کے "پھول" کے دور میں اصلاح دیتے تھے یعنی غلام عباس کے اسلوب کی سلاست اور سادگی کی تشکیل میں تاج کا حصہ بھی نظر آتا ہے۔

پھر 1932ء کے رسالے "فردوس" میں "جاپان کی شاعرہ عورتیں" نامی ایک مضمون بھی پیش کیا۔

گیا ہے۔[23] اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس نے نہ صرف انگریزی کہانیوں کا بلکہ مضامین کا بھی ترجمہ کیا تھا اور اس مضمون کے آخر میں "مولانا غلام عباس" لکھا ہوا ہے۔ "مولانا" لگائے جانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غلام عباس اس زمانے میں انگریزی کے ذریعے دنیا کے مختلف موضوعات سے واقفیت رکھنے والے پڑھے لکھے آدمی تھے اور یہ اس زمانے کا دستور تھا کہ ادیبوں کے نام سے پہلے مولانا کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

غلام عباس کے ابتدائی دور کے تخلیقی عمل کا زیادہ تر حصہ ترجمہ تھا۔ غیر ملکی ادبی کارناموں کو اردو میں ترجمہ کرنا ان کا پہلا قدم تھا۔ اس سلسلے میں سب سے کامیاب کام "جلاوطن" اور "الحمراء کے افسانے" ہیں۔

"جلاوطن" ٹالسٹائی کے ناول "The Long Exile" کا ترجمہ ہے اور یہ 1925ء میں رسالہ "ہزار داستان" میں پہلی مرتبہ چھپا۔ "الحمراء کے افسانے" مشہور امریکی ناول نگار واشنگٹن ارونگ کے کارنامے "Tales from Alhambra" کا ترجمہ ہے اور اسے 1929ء میں ترجمہ کیا گیا اور 1930ء میں کتابی صورت میں چھپی۔[24] ان دو ترجموں سے غلام عباس کی ترجمہ نگاری نقطۂ عروج تک پہنچ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تخلیق سے زیادہ ترجمہ پر زور دیا لیکن اس کے بعد غلام عباس تخلیق کی طرف رجوع کرتے چلے جاتے ہیں۔

چونکہ "پھول" پورے ہندوستان کے بہت سے مقامات تک پہنچنے والا رسالہ تھا اس لئے غلام عباس کا یہ عمل زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزر سکا۔ علاوہ ازیں لڑکپن میں جن دوستوں سے ملاقات ہوتی رہی تھی ان میں سے بعض لوگ لاہور سے نکل کر باہر ادبی طور پر فعال تھے۔ مثلاً ان میں سے ایک ڈاکٹر تاثیر تھے۔ تاثیر لاہور سے دلی چلے گئے۔ ڈاکٹر تاثیر پہلے لاہور سے امتیاز علی تاج کے ساتھ رسالہ "کارواں" نکالتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر تاثیر کو دلی کے ادبی اداروں سے بھی وابستگی ہوئی۔ غلام عباس کو اپنی کہانیاں دلی کے رسائل میں بھی پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس طریقے سے غلام عباس کے ادبی عمل کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

غلام عباس کے "پھول" سے وابستہ ہونے کے متعلق ایک بہت اہم بات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے یعنی "پھول" کے لئے کہانیاں لکھنے اور اس کی ادارت کرنے کی وجہ سے غلام عباس کو زبان کی سلاست اور سادگی کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے خود لکھا:

"پھول، ---- ایک اخبار ہی نہیں تھا ایک ادارہ بھی تھا جو ایک طرف تو ملک کے نونہالوں کے دلوں میں علم کی لگن لگاتا، ان کے اخلاق سنوارتا، ان میں ادب کا ذوق پیدا کرتا اور دوسری طرف ملک کے ادیبوں کے ذہنوں کی تربیت کرتا اور انہیں آسان اور سلیس زبان

لکھنا سکھاتا جو ادیب اس کا ایڈیٹر مقرر ہوتا۔ اگر وہ خام ہوتا تو اسے ایڈیٹری کی الف، ب سکھائی جاتی اور اگر پختہ ہوتا تو اسے اپنا آموختہ بھلا کر نئے سرے سے اردو لکھنے کے قواعد و ضوابط سیکھنے پڑتے۔ اس درسگاہ کے معلم تھے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم!

مولوی صاحب بہت روشن خیال بزرگ تھے۔ وہ عربی، فارسی کے بڑے عالم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ کئی دینی اور علمی و ادبی کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ بہت سادہ اور سلیس زبان لکھتے مگر کمال یہ کہ سادگی کے باوجود ان کی تحریر کا عالمانہ وقار اور ٹھوس پن قائم رہتا۔ انہوں نے اردو کو آسان بنانے کے لئے حروف کی املا کے کچھ خاص قاعدے مقرر کئے تھے۔ علاوہ ازیں عبارت میں وقف کے نشان لگانے کا طریقہ بھی رائج کیا تھا۔ اس سے لمبا فقرہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بٹ جاتا اور بچے پورے فقرے کا مطلب آسانی سے سمجھ لیتے۔ "پھول" کے ایڈیٹر کو ان قواعد کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کرنی پڑتی تھی۔

ذیل میں مولوی صاحب کے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے "پھول" کے مضمون نگاروں کی ہدایت کے لئے "پھول" میں چھپوایا تھا۔ اس سے زبان کو آسان بنانے کے بارے میں ان کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔

"پھول" میں وہ مضمون نہیں چھاپے جاتے جن میں مشکل الفاظ یا مشکل خیالات ہوں یا بے جا مبالغہ ہو۔ بہت سے مضمون نویس آسان لفظ تو لکھ دیتے ہیں مگر یہ خیال ذرا نہیں کرتے کہ جو باتیں انہوں نے لکھی ہیں یا جو خیالات انہوں نے ظاہر کئے ہیں، ویسے خیالات بچوں کے دماغ میں کبھی آتے اور ویسے لفظ ان کی زبان سے کبھی بولے بھی جاتے ہیں یا کوئی بچہ اپنی بول چال میں اتنا مبالغہ کبھی کرتا ہے!

آج کل بہت سے لوگ لکھے پڑھے عالم فاضل ہو کر جاہل بنے جاتے ہیں۔ کسی کو اپنی زبان میں بے ضرورت عربی فارسی کے مشکل الفاظ بولنے کا شوق ہے اور کسی کو اس میں خواہ مخواہ ہندی اور سنسکرت گھسانے کی دھت ہے۔ دونوں فریق غلطی پر ہیں اور ملک کو گمراہ کرتے ہیں۔

زبان دریا کے بہاؤ کی طرح ہے، یہ کسی کے قابو کا نہ وہ کسی کے بس کی۔ دریا بھی اپنا راستہ آپ نکال لیتا ہے، زبان بھی اپنے قاعدے آپ بنا لیتی ہے۔ ہم خود ان قاعدوں کو نہیں گھڑ سکتے بلکہ ہمیں وہ قاعدے جو زبان نے خود بنائے ہیں، زبردستی ماننے پڑتے ہیں۔

پس اے مصنفو اور زبان کی درستی چاہنے والو! نہ فارسی عربی لفظ بولنے کا شوق کرو، نہ

ہندی کی چندی نکالنے کی عادت ڈالو۔ تم ہمیشہ وہ زبان بولو اور لکھو جو سب سے آسان ہو جسے بچہ بچہ سیکھ سکتا ہے۔"(25)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کے اسلوب کی سادگی اس زمانے سے شعوری طور پر برقرار رکھی گئی۔

غلام عباس "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے علاوہ بھی "فردوس، نیرنگ خیال" جیسے لاہور سے نکلنے والے رسائل میں بھی کہانیاں پیش کرتے تھے۔ پھر انھوں نے 1933ء میں رسالہ "کارواں" بں اپنا افسانہ "مجسمہ" چھپوایا۔ (26) یہ غلام عباس کا پہلا تخلیقی افسانہ تھا۔ پھر 1934ء میں "محبت کا گیت" کے عنوان سے اسی رسالے میں ایک افسانہ پیش کیا۔ (27)

لیکن خود غلام عباس کو یہ دونوں افسانے پسند نہیں تھے۔ یہ دونوں افسانے رومانی انداز میں لکھے گئے تھے اور اس رومانیت کے بارے میں غلام عباس کہتے ہیں:

"علی عباس حسینی، منشی پریم چند کی تقلید کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو نیاز فتح پوری کے انداز میں لکھتے تھے جیسے ل، احمد اکبر آبادی وغیرہ۔ ان سب پر جو سب سے بھاری تھے، وہ ٹیگور تھے۔ اس زمانے میں ٹیگور ہمارے ذہنوں میں چھائے ہوئے تھے۔ ٹیگور اس دور میں بہت اچھے لگتے تھے کیونکہ ان کی تحریروں میں تھوڑی سی رومانیت شامل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں سب سے پہلے ٹیگور ہی سے متاثر ہوا اور میں نے ان سے متاثر ہو کر دو افسانے لکھے ایک افسانے کا نام تھا "محبت کا دیپ" اور دوسرے کا "مجسمہ"--- ان افسانوں کا بہت ہی شاعرانہ انداز تھا۔ یہ دونوں افسانے امتیاز علی تاج اور محمد دین تاثیر کے جریدے "کارواں" کے دو الگ الگ شماروں میں شائع ہوئے لیکن میں پھر بہت جلد اس سے بھاگا۔ اس کے بعد ہمارے مطالعے میں روسی افسانے کی آمیزش شروع ہوئی۔ ہم نے میخوف (Mekhov چیخوف کی غلطی ہو سکتی ہے) اور گورکی کو پڑھا، پھر خیال ہوا کہ افسانے تو یہ ہیں! چنانچہ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے ان سے متاثر ہو کر افسانے لکھے۔"
(28)

غلام عباس کو ان دونوں افسانوں کا شاعرانہ انداز پسند نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ان افسانوں کو پسند نہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

"یہاں میں ایک ذاتی معاملے کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چغتائی صاحب مجھ پر بڑے مہربان تو تھے ہی، وہ میری تحریروں کی بھی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ وہ جذبے میں آکر چلا اٹھتے: "بھئی کمال کر دیا، دیکھو عباس نے کیا لکھ ڈالا"--- ان کی اس حوصلہ افزائی نے

میری ابتدائی ادبی زندگی کو بڑا استحکام بخشا۔ میں نے متعدد چیزیں محض ان کو خوش کرنے اور ان سے داد لینے کے لئے لکھیں۔ مثلاً "کارواں" کے پہلے پرچے میں جس کی ادارت تاثیر نے کی تھی، میں نے افسانہ "مجسمہ" لکھا اور دوسرے پرچے میں جسے مجید ملک نے مرتب کیا "محبت کا گیت" لکھا۔ یہ دونوں افسانے رومانی قسم کے اور حسن و عشق کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ جنہیں بعد میں، میں نے رد کر دیا تھا۔ یعنی آج تک اپنے کسی مجموعے میں شائع نہیں کیا۔"(29)

یہ دونوں افسانے غلام عباس کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے۔ البتہ انہوں نے غیر ملکی ادب کے جو ترجمے کئے تھے وہ کتابی صورت میں آچکے تھے لیکن ان کا کوئی تخلیقی کارنامہ اس وقت تک نہیں چھپ سکا تھا۔ ان کی تخلیق کی پہلی کتاب "جزیرۂ سخن وراں" تھی۔ یہ افسانہ رسالہ "شیرازہ" میں 1936ء سے 1937ء تک چھپتا رہا۔ اس رسالہ کو چراغ حسن حسرت لاہور سے نکالتے تھے۔ دراصل یہ افسانہ مشہور فرانسیسی طنز نگار آندرے موروا (Andre Moroe) کی تصنیف سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ خود غلام عباس نے لکھا ہے:

"اس کتاب کا بنیادی خیال مشہور فرانسیسی مصنف آندرے موروا کی ایک طنز "وواژاژ اوپے ای دیزارتی کول" سے لیا گیا ہے۔"(30)

لیکن اس کو ان کا پہلا تخلیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ 1941ء میں دلی کے "کتب خانہ ہزار داستان" سے کتابی صورت میں چھپ گیا تھا۔(31) 1961ء میں کراچی سے دوبارہ چھپوایا گیا۔(32) اس میں فیض احمد فیض اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف مقبول ہوئی اور اسی سے اردو ادب میں غلام عباس کی واضح پہچان ہو سکی۔

1937ء میں غلام عباس کو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت ملی تو وہ لاہور سے دہلی چلے گئے۔ وہ دلی میں انگریزی خبروں کا اردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس خبرنامے کا نام "Hindustani News" تھا۔ خبروں کا ترجمہ 1938ء تک کرتے رہے اور 1938ء میں آل انڈیا ریڈیو کے اردو رسالہ "آواز" اور ہندی رسالہ "سارنگ" دونوں کے مدیر مقرر ہوئے۔ غلام عباس نے خود اپنے شخصی تعارف نامے میں لکھا:

"1937-1938

Hindustani News, Translator, All India Radio, Delhi.

1938-1947

Editor "Awaz" (Urdu), "Sarang" (Hindi), fortnightly

journals of All India, Delhi.

Also Broadcast stories and literary talks and produced plays and features." (33)

نگران رسالوں کا مدیر مقرر ہونے کے سلسلے میں تھوڑا سا مسئلہ بھی تھا۔ مرزا ظفرالحسن کے ہاں یہ ذکر موجود ہے:

"آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کے رسالے "آواز" کے پہلے ایڈیٹر آغا اشرف تھے، ان کے بعد مجاز اور پھر غلام عباس ہوئے۔ ان کے تقرر پر اسمبلی میں اعتراض کیا گیا کہ ریڈیو میں بڑی جانب داری برتی جارہی ہے اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو بھرتی کیا جارہا ہے۔ معترض نے غلام عباس کا نام بھی لیا اور کہا کہ ان کے پاس کسی یونیورسٹی کی کوئی سند نہیں ہے۔ پطرس بخاری نے اس کا جواب لکھا کہ اس شخص کو غیر تعلیم یافتہ کہا جارہا ہے جس نے چالیس پچاس بنگالی، روسی اور مغربی ادیبوں کے شاہکاروں کے تراجم مختلف معتبر رسائل میں شائع کئے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے نام تو معترض نے سنے بھی نہ ہوں گے۔ پطرس کو بڑا افسوس ہوا کہ جس وقت اسمبلی میں یہ جواب دیا گیا، معترض صاحب غیر حاضر تھے۔"
(34)

دلی میں بھی وہ "جزیرہ سخن وراں" لکھ رہے تھے اور اس وقت دلی میں اردو کے مشہور شاعر ن۔ م راشد کے ساتھ رہتے تھے اس زمانے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"1937ء میں مجھے "پھول" اخبار کی ایڈیٹری (شپ) چھوڑ کر دلی جانا پڑا جہاں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے کی ایڈیٹری مجھے سونپ دی گئی۔ اس کے کچھ دن بعد پروفیسر احمد شاہ بخاری نے جو اب آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے، مجھ سے کہا کہ راشد ریڈیو میں ملازم ہوگیا ہے۔ فی الحال لاہور میں ہے لیکن عنقریب اسے دلی بلوا لیا جائے گا اور خبروں کے ترجمے کے کام پر لگا دیا جائے گا۔ تم ذرا اس کی دلجوئی کرتے رہنا۔۔۔ چنانچہ چند روز بعد راشد دلی آگئے اور شام کی خبروں کے بلیٹن کے مترجم بن گئے۔ میں نے خبروں کے بعد ان کے دفتر میں جاکر ان سے ملاقات کی۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ تنہا آیا ہوں اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔

اتفاق سے ان دنوں میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا کیونکہ بیوی طویل علالت کی وجہ سے ہسپتال میں تھی اور والدہ نے بھی اس کی تیمارداری کے لئے ہسپتال ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی چنانچہ میں نے کہا، تم میرے ہاں کیوں نہیں آرہتے۔ راشد مان گئے اور تقریباً ایک،

میرے پاس ہی رہے اور یوں ہماری شناسائی نے رفتہ رفتہ ایک گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی---

---وہ (راشد) میرے مختصر ناول "جزیرہ سخن وراں" کے بڑے مداح تھے اور ہرچند میں نے ایک معصوم شرارت کے تحت اس ناول میں ان کا کردار ایک باغی شاعر کے طور پر استعمال کر کے اسے سخن ناشناسوں کے ہاتھوں پٹوا بھی دیا تھا مگر اس کے باوجود ان کی ستائش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ اس کے کئی سال بعد بھی انہوں نے ریڈیو پاکستان سے "میری پسندیدہ کتاب" کے عنوان سے "جزیرہ سخن وراں" کے بارے میں ایک طویل انٹرویو براڈ کاسٹ کیا تھا۔"(35)

اس بات کا ن۔ م راشد نے بھی "میری پسندیدہ کتاب" کے انٹرویو میں ذکر کیا ہے:

"آج سے کوئی انیس بیس برس پہلے دلی میں حسن اتفاق سے عباس صاحب اور میں دونوں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور باہم ایک حد تک شریک کار بھی تھے۔ "ایک حد تک" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عباس صاحب ریڈیو کے رسالے "آواز" کے ایڈیٹر تھے اور یہ نیاز مند دلی ریڈیو اسٹیشن پر تقریروں کا انچارج تھا۔ جب عباس صاحب یہ کتاب لکھ رہے تھے تو اکثر اس کے موضوع اور اس کی بعض تفصیلات کے بارے میں باہم گفتگو بھی ہوا کرتی۔"(36)

اس واقعے کی وجہ سے غلام عباس کے لئے ن۔ م راشد عزیز ترین دوست ہو گئے تھے اور یہ بات راشد کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس کے بعد راشد کی بیشتر نظمیں غلام عباس کے پاس بھجوائی جاتی رہیں۔ مثلاً 16 فروری 1942ء کے خط میں راشد نے اپنی تازہ نظم "دوری" لکھ کے بھیجی۔(37)

"جزیرہ سخن وراں" کی کامیابی کے ساتھ غلام عباس اپنی والدہ اور نانی کی بہن کو لے کر دلی آئے۔(38) آل انڈیا ریڈیو کا 23 جولائی 1927ء سے براڈ کاسٹ شروع ہو گیا اور غلام عباس 1937ء میں باقاعدہ طور پر ملازم ہو گئے۔ 1936ء میں آل انڈیا ریڈیو سے پندرہ روزہ اردو رسالہ نکلنے لگا تو غلام عباس کو پہلا مدیر مقرر کیا گیا۔ اس رسالے کا نام "آواز" تھا۔ پھر اس سال میں ہندی کا رسالہ بھی نکلنے لگا تو اس رسالے کا نام غلام عباس نے "سارنگ" تجویز کیا۔ اس زمانے میں ریڈیو کے ملازمین کو اردو ہندی دونوں زبانوں سے واقفیت ضروری تھی۔ غلام عباس نے بھی ہندی اس وقت باقاعدگی سے سیکھی تھی بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے ایک بار ہندی میں افسانہ لکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اپنے انٹرویو میں غلام عباس نے کہا:

"میں نے ہندی میں امتحان بھی دیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ میں جن دنوں آل انڈیا ریڈیو میں لیا

گیا۔ اس زمانے میں اردو اور ہندی کا جاننا ضروری تھا۔ دونوں زبانیں چلتی تھیں۔ مجھے ایک ایسے پرچے "آواز" کا ایڈیٹر بنا دیا گیا جس کا نصف حصہ اردو میں اور نصف ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ جسے ہندی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اسے خواہ مخواہ اردو کے ساتھ ہندی کا حصہ پہنچ جاتا تھا اور جسے اردو کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اسے بھی ہندی کے ساتھ اردو کا حصہ پہنچ جاتا تھا۔ اس بارے میں میری تجویز تھی کہ رسالے کے دو ایڈیشن شائع کرنے چاہئیں۔ حکام نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہی ہندی رسالے کا نام رکھ لو۔ چنانچہ میں نے ہندی پرچے کا نام "سارنگ" رکھا۔ "سارنگ" عجیب و غریب لفظ ہے جس کے سترہ اٹھارہ مختلف معنی ہیں۔ اس زمانے میں محکمہ جاتی طور پر فیصلہ ہوا کہ ہر شخص ہندی کا امتحان ضرور پاس کرے۔ چنانچہ جو پہلی کلاس بنی، اس میں سجاد سرور نیازی، میں اور دو تین اور لوگ شامل ہوئے۔ ہم سب چھ مہینے تک ہندی سیکھتے رہے، میں نے ایک عقل مندی یہ کی کہ ماسٹر جی سے دوستی کر لی۔ اس سے مجھے ہندی سیکھنے میں خاصی مدد ملی۔ موسیقی میں پہلے سے جانتا تھا۔ موسیقی سے دلچسپی کی وجہ سے ہندی سے واقفیت ضروری تھی۔ لاہور میں ہندی کا ایک مہاودیالہ تھا جس میں، میں دو سال تک طالب علم تھا جس کی وجہ سے مجھے ہندی لکھنی پڑھنی آ گئی تھی۔ ہندی آنے کی وجہ سے میں نے ہندی میں ایک بار افسانہ بھی لکھا۔ اس میں الفاظ بھی سب ہندی کے تھے لیکن یہ چل نہ سکا چنانچہ میں نے پانچ چھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے۔"(39)

مدیر ہونے کے ساتھ وہ ریڈیو میں کہانیاں اور ادبی گفتگو نشر کرتے اور ڈرامے اور لمبی اقساط والے پروگرام کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ (40)

اب ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے ریڈیو کے کون کون سے پروگراموں میں حصہ لیا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رسالہ "آواز" میں بھی ان کا کوئی مضمون شائع ہوا تھا یا نہیں۔ 1991ء کے آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ اردو کے ڈائریکٹر محمود ہاشمی کے بقول وہ صرف مدیر رہے اور ان کا کوئی خاص ادبی مضمون اس رسالے میں شائع نہیں ہوا تھا۔ (41)

تاہم غلام عباس کا ایک اپنا قلمی مسودہ موجود ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سے پروگراموں سے وابستہ رہے۔ اس میں لکھا ہے:

"پیارے بچو! ادھر آؤ، دیکھو ہم نے تمہارے دل بہلاوے کا کیسا سامان نکالا ہے۔ اب سے پہلے تمہارے ابا میاں، امی جان، بھائی جان سب کے سب ریڈیو پر بس اپنی ہی مطلب کی چیزیں سنا کرتے تھے۔ کبھی گانا سن لیا، کبھی تقریر سن لی، کبھی خبریں اور کبھی آٹے دال کا

بھاؤ--- تمہاری دلچسپی کی کوئی بات نہ ہوتی تھی لیکن اب ہم نے انتظام کر لیا ہے کہ اگر ہر روز نہ سہی تو کم سے کم ہفتے میں ایک بار آدھ گھنٹہ ریڈیو تم سے اور فقط تم سے باتیں کرے، تمہیں اپنی اچھی کہانیاں اور پیارے گیت سنائے--- زمین پہ پھول آسماں پہ تارے

(یہ نظم جناب اختر شیرانی ایڈیٹر رسالہ رومان لاہور نے لکھی ہے)

خدا کی قدرت کے ہیں نظارے   زمیں پہ پھول آسماں پہ تارے

ہے ہیں یہ کیسے پیارے پیارے   زمیں پہ پھول آسماں پہ تارے

بچوں کا ترانہ (یہ نظم گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب ایم۔اے نے لکھی ہے)

ہاں وہ مرا خدا ہے

ہاں وہ مرا خدا ہے

جس نے بنائی دنیا جس نے بسائی دنیا

گلشن کھلائے جس نے دریا بہائے جس نے" (42)

اس مسودے سے غلام عباس کے رجحانات کے ایک اہم عنصر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی انہیں بچوں کے ادب سے دلچسپی تھی اور یہ بات "پھول" کے مدیر اور سب ایڈیٹر رہنے سے اور متعدد کہانیاں لکھنے سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

غلام عباس نے قیام دلی کے دوران میں بھی رسالہ "پھول" کے لئے کہانیاں لکھی ہوں گی مگر اب وہ دستیاب نہیں ہیں بلکہ "جزیرہ سخن وراں" کے بعد رسالہ "شیرازہ" میں بھی ان کے افسانہ یا ڈرامے شائع ہوتے رہے مثلاً یکم جنوری 1937ء کے "شیرازہ" میں "بیری کا درخت" نامی افسانہ، (43) 8 فروری کو "قوت ارادی کی درسگاہ" نامی ڈرامہ (44) اور 12 فروری 1938ء کو "دیوانہ شوہر" نامی ڈرامہ (45) شائع ہوئے اور ان دونوں ڈراموں کے آخر میں "باقی آئندہ" لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قسطوں پر مشتمل لمبے ڈرامے بھی لکھے تھے۔

اس طرح بطور ملازم غلام عباس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدائی دور میں بچوں کے لئے کہانیاں اور انگریزی کہانیوں کا ترجمہ کرتے تھے اور اسی عمل کے حوالے سے جان پہچان حاصل کی۔ اس لئے غلام عباس نے "ادارہ پھول" میں نو سالہ ملازمت کو اپنی ادبی تربیت، زبان کے نکھار اور اسلوب کے تعین کی مدت قرار دیا ہے۔ (46)

پھر کہانیوں اور ترجموں سے شہرت حاصل کر کے لاہور سے دلی آئے۔ "جلاوطن" اور "الحمراء

کے افسانے "غلام عباس کے ترجموں کی بہترین مثال ہیں۔ پھر "جزیرۂ سخن وراں" (ماخوذ) لکھا تو ان کے نام نے اردو ادب میں ایک مستقل مقام حاصل کیا۔

ترجمہ سے ماخوذ تحریروں کی طرف آنے کے بعد غلام عباس کا تخلیقی عمل خالص تخلیق کی طرف رجوع کرتا نظر آتا ہے۔ پھر افسانہ "آنندی" کی کامیابی سے وہ "افسانہ نگار غلام عباس" کا اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں لیکن مجموعہ "آنندی" میں ایسے افسانے بھی موجود ہیں جو ماخوذ ہیں۔ اس سے غلام عباس کے ادبی رجحانات کے تغیر کا علم ہوتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس ایضاً ص 51 تا 53

(2) غلام، ایضاً ص 59

(3) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" لاہور 1982ء ص 8

(4) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن ص 268

(5) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ) س ن

(6) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (ا)" کراچی 1975ء ص 136

(7) غلام عباس (مرتبہ) "انتخاب پھول" کراچی 1963ء

(8) یہ کتابیں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے شائع ہوئیں مگر سنہ اشاعت درج نہیں اور مرتبہ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ہر کہانی کون کونسے شمارے سے لی گئی ہے۔

(9) غلام عباس، ایضاً ص 13

(10) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (ا)" کراچی 1975ء ص 136

(11) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ"، (غیر مطبوعہ) "Tehzik" "K" کا "ط" ہوگا۔ یہ ٹائپ رائٹر میں بنایا گیا ہے اور بناتے وقت غلطی ہوئی ہوگی۔

(12) غلام عباس 'شہزاد کا سپنا' رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور 1936ء ص 76

(13) غلام عباس 'نظر بندی کا کھیل'، رسالہ "پھول" لاہور یکم دسمبر 1928ء، ص 712 تا 713

(14) غلام عباس 'جنتی چڑیا'، رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور یکم دسمبر 1928ء، ص 1168

(15) غلام عباس 'برف کی بیٹی'، رسالہ "پھول" لاہور 6 اپریل 1929ء ص 183 تا 186

(16) غلام عباس 'خاندانی تحفہ'، رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور 6 اپریل 1929ء ص 328 تا 330

(17) غلام عباس 'ایک ٹانگ کا بادشاہ'، رسالہ "پھول" لاہور 1929ء ص 379 تا 382

(18) غلام عباس 'جگنوؤں کا شکار'، ایضاً ص 382 384

(19) غلام عباس 'جلاوطن'، رسالہ "پھول" لاہور 1930ء ص 6 تا 9

(20) غلام عباس 'سبز طوطا' رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور 4 جنوری 1930ء ص 26 تا 31

(21) غلام عباس 'ملکہ مہ نگار' رسالہ "پھول" لاہور 12 جنوری، 19 جنوری، 26 جنوری، 2 فروری، 9 فروری، 16 فروری 1929ء

(22) سید امتیاز علی تاج "عبدالرحمٰن چغتائی کے نام خط" (غیر مطبوعہ) تاریخ نہیں دی گئی مگر اس خط کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ "انارکلی شائع ہو گئی" اس لئے 1930ء یا 1931ء کے قریب کا خط معلوم ہوتا ہے۔

(23) غلام عباس 'جاپان کی شاعرہ عورتیں' رسالہ "فردوس" لاہور نومبر 1932ء ص 11 تا 13

(24) غلام عباس "الحمراء کے افسانے" لاہور 1930ء

(25) غلام عباس (مرتبہ) "انتخاب پھول" کراچی 1963ء ص 11 تا 13

(26) صہبا لکھنوی ص 67، فرمان فتح پوری ص 110 "مجسمہ" فرمان فتح پوری کی تصنیف میں نمونے کے طور پر شامل کیا گیا ہے (ص 112 تا 118)۔

(27) شہزاد منظر نے اس افسانے کا عنوان "محبت کا دیپ" لکھا ہے (شہزاد منظر ص 106) مگر صہبا لکھنوی نے "محبت کا گیت" لکھا ہے اور خود غلام عباس نے دوسرے انٹرویو کے موقع پر "محبت کا گیت" کہا ہے۔ (غلام عباس 'چغتائی --- چند یادیں' "عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن" (مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا) لاہور 1980ء ص 94

(28) غلام عباس 'پینل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 106

(29) غلام عباس 'چغتائی --- چند یادیں' "عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن" (مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا) لاہور 1980ء ص 94

(30) غلام عباس 'پیش لفظ' "جزیرۂ سخن وراں" دہلی 1941ء

(31) غلام عباس، ایضاً

(32) غلام عباس "جزیرۂ سخن وراں" (طبع دوم) کراچی 1961ء

(33) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ)

(34) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس' "اردو افسانہ اور افسانہ نگاری" کراچی جنوری 1982ء ص 142

(35) غلام عباس 'راشد --- چند یادیں' "ن م راشد ایک مطالعہ" (مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی) کراچی 1986ء ص 55 تا 56

(36) ن م راشد 'صدائے بازگشت' رسالہ "ماہ نو" کراچی مارچ 1982ء ص 61 تا 64 (یہ انٹرویو بعد میں "ماہ نو" میں چھپ گیا تھا) عباس اور راشد کے ان دونوں اقتباسات میں اختلاف ہے۔ اس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

(37) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 16 فرورد 1942ء

(38) یہ معلوم نہیں کہ جب غلام عباس لاہور سے دہلی آئے تب ان کی نانی بخیریت تھیں یا نہیں۔

(39) غلام عباس 'پینل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 107 تا 108

(40) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ)

(41) یہ بات محمود ہاشمی صاحب نے 24 اپریل 1991ء کو راقم حروف سے ملاقات کے موقع پر بتائی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ رسالہ "آواز" کے پرانے شمارے آل انڈیا ریڈیو کی لائبریری میں ضرور ہو سکتے ہیں مگر انہیں دیکھنا مشکل ہے۔

(42) غلام عباس "مسودہ" (غیر مطبوعہ) س ن۔ اس مسودے میں صوفی تبسم کی نظم کے بعد حفیظ جالندھری کی نظم "یاں صاحب تم بھی گدھا" ایک صفحہ پر درج ہے اور اس کے بعد تین لطیفے ہیں۔ پھر دو کہانیاں "اشاروں کی بولی" "مرغی کی بہادری" ہیں اور پانچ پہیلیاں اور آخر میں کہانی "ننھی کی گڑیا" ہے جو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ مسودہ کب لکھا گیا لیکن یہ ضرور ہے کہ غلام عباس ریڈیو کے لئے بچوں کے اس انداز کے پروگرام تیار کرتے تھے۔

(43) غلام عباس 'بیری کا درخت' رسالہ "شیرازہ" یکم جنوری 1937ء ص 5 تا 6

(44) غلام عباس 'قوت ارادی کی درسگاہ' رسالہ "شیرازہ" 8 فروری 1937ء ص 139 تا 142

(45) غلام عباس 'دیوانہ شوہر' رسالہ "شیرازہ" 12 فروری 1938ء ص 35 تا 39

(46) مرزا ظفرالحسن 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (1)" کراچی 1975ء ص 137

1-2-0 دوسرا دور

1-2-1 قیام دلی کا دور، افسانہ نگاری کا پہلا دور

(1939ء تا 1947ء)

"یہ افسانے میں نے دلی میں 1939ء سے لے کر 1947ء تک مختلف وقتوں میں لکھے۔ اس لحاظ سے یہ میرے دلی کے قیام کی یادگار ہیں اور ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی افسانوں کا تمدنی اور جغرافیائی پس منظر بھی دلی ہی ہے۔

اگرچہ میں نے 1939ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے تھے مگر اس مجموعہ کی مندرجہ بالا خصوصیت کے پیش نظر ان کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔"(1)

"مجسمہ" اور "محبت کے گیت" یہ دونوں افسانے دراصل اس لئے مجموعہ "آنندی" میں شامل نہیں کئے گئے کہ غلام عباس کو یہ دونوں پسند نہیں تھے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ 1939ء سے قبل بھی غلام عباس نے افسانے لکھے۔ پھر بھی جس طرح غلام عباس نے مجموعہ "آنندی" کے آغاز میں لکھا ہے، 1939ء سے لے کر 1947ء تک کا دلی میں تخلیقی عمل ان کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس اہمیت کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے بارے میں اب کچھ کہنا آسان نہیں مگر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ ترجمہ اور ماخوذ تحریروں سے نکل کر افسانہ کی تخلیق کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ 1939ء کے بعد کے دلی میں قیام کے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے کے غلام عباس کے ذاتی واقعات کو دیکھا جائے تو بعض محققین کا لکھنا ہے کہ 1939ء میں ذاکرہ نامی خاتون سے شادی ہوئی تھی۔(2) 1937ء میں جب غلام عباس دلی گئے اور وہاں انہوں نے "جزیرہ سخن وراں" لکھا تب ان کی بیگم کی طبیعت خراب تھی اور وہ غلام عباس کی والدہ کے ساتھ ہسپتال میں تھی۔ غلام عباس گھر میں اکیلے تھے تو ن۔ م راشد دلی آ کر ان کے گھر میں ٹھہرے اور دونوں "جزیرہ

سخن وراں" پر بحث کرتے رہے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی (ڈاکٹر) کی مرتب کردہ کتاب "ن۔ م راشد ایک مطالعہ" میں لکھا گیا ہے کہ راشد 1939ء میں دلی گئے[3] اور خود راشد نے 1968ء کے ایک انٹرویو میں کہا کہ ستمبر 1935ء تا اپریل 1939ء، راشد کمشنر ملتان کے دفتر میں اسسٹنٹ رہے اور مئی 1939ء میں لاہور میں تین ہفتے آل انڈیا ریڈیو میں بطور پروگرام اسسٹنٹ کام کیا، پھر اسی ماہ کے آخری ہفتے میں دلی تبادلہ ہو گیا۔[4] مگر فخرالحق نوری کے بقول 1937ء تک راشد بہاولپور میں خاکسار تحریک سے وابستہ رہے اور اس وجہ سے حکومت نے 1937ء میں راشد کو دلی منتقل کرا دیا۔[5] اس لئے راشد کا دلی میں مقیم ہونا 1937ء کی بات ہے۔ ویسے 16 فروری 1942ء کے راشد کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس دلی کے منٹو روڈ کے مکان میں رہنے سے پہلے کسی اور جگہ مقیم تھے۔ راشد نے خط میں لکھا:

"نیا مکان مبارک ہو۔ مجھے تو سچ پوچھو تو تمہارے نقل مکانی کرنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ---

بمنزل دی بہیر دگرچہ باشد منزل ماہے!"[6]

بہرحال غلام عباس کی شادی 1937ء کے لگ بھگ ہو چکی ہوگی۔ زینب عباس نے لکھا ہے کہ غلام عباس اور ذاکرہ کی شادی دلی میں ہوئی۔

اس سلسلے میں زینب عباس نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ذاکرہ سے شادی کرنے سے پہلے غلام عباس ایک خوبصورت کشمیری لڑکی "غزالہ" کے ساتھ رہتے تھے اور دونوں کا ایک بچہ بھی تھا لیکن یہ بچہ 4 سال کی عمر میں نمونیا سے مر گیا۔ غزالہ اور غلام عباس کی والدہ کے درمیان جھگڑا ہوتا رہا اور بالآخر غزالہ نے کسی قصائی سے شادی کر لی۔ غزالہ کے جانے کے بعد غلام عباس کی والدہ کو احساس تنہائی کے باعث اپنی بہو کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں ان کی ملاقات ذاکرہ کی چچی سے ہوئی۔[7] ذاکرہ کے بارے میں صہبا لکھنوی نے لکھا ہے کہ ان کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔[8] زینب عباس کا کہنا ہے کہ ذاکرہ کے والدین ان کے بچپن میں انتقال کر چکے تھے اور وہ اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ کلکتے میں دادی کے گھر میں رہیں۔ دادی کے گھر میں بہت بڑا باغ تھا یعنی وہ خاصے دولت مند گھر کی تھیں۔ پھر کلکتے سے دلی چچی کے پاس آئی اور غلام عباس کی والدہ سے ملاقات ہوئی، جب ذاکرہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔[9]

قیام پاکستان سے پہلے غلام عباس کے تین بچے ہوئے۔ 1942ء میں بڑی بیٹی شہزادہ، 1944ء میں دوسری بیٹی ناہید اور 1946ء میں بڑا بیٹا علی سجاد پیدا ہوا۔ دن میں غلام عباس کا رہائشی پتہ یہ تھا:

Manto Road, Dehli.[10]

اور یہ مکان سرکاری کوارٹر تھا۔ یہاں سے وہ روزانہ آل انڈیا ریڈیو جاتے اور راستے میں افسانہ "آنندی" جیسا ماحول دیکھا کرتے تھے۔

چنانچہ غلام عباس نے "آنندی کا پس منظر" نامی مضمون میں لکھا ہے:

"اس افسانے کا خیال مجھے کب اور کس طرح سوجھا۔ اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ افسانہ میں نے سنہ 1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی ہفتے پہلے لکھا تھا۔ ان دنوں میں دلی میں رہتا تھا اور آل انڈیا ریڈیو کے اردو رسالے "آواز" کا ایڈیٹر تھا۔ اسی زمانے میں دلی کا مشہور بازار چاوڑی طوائفوں سے خالی کرایا گیا تھا اور انہیں رہنے کو برن بیسٹن روڈ پر جگہ دی گئی تھی۔ یہ سڑک پرانے شہر کے باہر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ (11) ریلوے لائن اور اس سڑک کے درمیان لوہے کا ایک اونچا کٹہرا بنا تھا۔ اس سڑک پر دن رات تانگوں اور موٹروں کی آمد و رفت تو خوب رہتی تھی مگر یہ سڑک تھی غیر آباد یعنی اس پر رہائشی مکان یا دکانیں وغیرہ نہ تھیں۔۔۔ بس سڑک کے دونوں طرف خالی زمین پڑی تھی۔ غالباً اس کی ویرانی ہی کی وجہ سے دلی کی میونسپل کمیٹی نے اسے شرفائے شہر کے لئے نسبتاً "کم خلل رساں" سمجھ کر طوائفوں کو الاٹ کر دیا تھا تاکہ وہ یہاں مکان بنوا کر اپنا دھندا پھر سے شروع کر سکیں۔

اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کا دفتر پرانی دلی کی علی پور روڈ پر واقع تھا اور گھر نئی دلی کی ایک لین میں یعنی میں شہر کے اس سرے پر رہتا تھا اور دفتر اس سرے پر تھا چنانچہ مجھے دفتر آتے جاتے اکثر اسی برن بیسٹن روڈ سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس طرح اس علاقے کی تعمیری سرگرمیوں پر خواہی نخواہی میری نظر پڑتی رہتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ کئی ہفتوں تک تو یہ جگہ ویسی کی ویسی ویران ہی پڑی رہی مگر پھر رفتہ رفتہ اس میں نشوونما کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے اور راج، مزدور، نقشہ نویس، ٹھیکیدار، انجینئر، منشی، متصدی یہاں چلتے پھرتے نظر آنے لگے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جوش تعمیر جنوں کی حد تک پہنچ گیا اور دن کے علاوہ رات رات بھر گیسوں کی روشنی میں کام ہونے لگا اور یوں چند ہی مہینوں میں کئی مکان بن کر تیار ہو گئے۔

یہ تھا میرا وہ مشاہدہ جو "آنندی" کی بنیاد بنا۔

ایک صناع کو زندگی سے جو مواد حاصل ہوتا ہے، اسے وہ اپنی تخلیق میں جوں کا توں استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنے فہم و ادراک کے مطابق اس میں حذف و اضافہ کرتا، اپنی قوت تخیل سے اسے نیا جامہ پہناتا اور حقیقت سے کہیں زیادہ موثر اور خوبصورت بنا دیتا ہے، اس قطع

وبرید اور انداز فکر سے صناع کی فنکارانہ صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔

میں نے بھی اس مواد کو جو مجھے زندگی سے عطا ہوا تھا اور جس کا مشاہدہ میں نے کیا تھا، اپنے کام میں لانا چاہا۔ میں نے سوچا کہ چاوڑی اور برن ہیمپٹن روڈ کا درمیانی فاصلہ ایک میل سے بھی کم ہے۔ بھلا ایک شہر کے اندر دوسرا شہر بسانا کیسے ممکن ہو گا اور میں نے طوائفوں کی اس نئی بستی کے لئے دلی سے چھ سات میل دور ایک بالکل اجاڑ اور ویران علاقہ منتخب کیا۔

ایسے ویرانے دلی سے قطب صاحب جاتے ہوئے بارہا میری نظر سے گزر چکے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے بس میری خیال بندی ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس کہانی میں میں نے ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش بھی کی یعنی افسانوں کے روائتی کرداروں سے اسے یکسر عاری رکھا اور پورے معاشرے کو اس کے واحد کردار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بھلا جس کہانی میں کردار نہ ہوں، کچھ واقعہ نہ ہو اور اگر ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ پڑھنے والے کی دلچسپی کیسے قائم رکھی جاسکتی ہے۔

یہ خاصا مشکل کام تھا اور اکثر خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں پڑھنے والا تفصیلات سے اکتا کر کہانی کو ادھ بیچ ہی میں نہ چھوڑ دے چنانچہ اس کے سدباب کے لئے بڑے جتن کرنے پڑے۔ میں نے کہیں تو اس کی نثر میں ایک قسم کی ہلکی رغنائیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کہیں نظم منثور (پروز پوئم) کا رنگ دیا۔ افسانوں کے مختلف طبقوں، ان کی عادتوں، خصلتوں، زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی رنگ آمیزی سے پیش کیا، کہیں رنگیں بیانی کہیں زبان کا چٹخارہ۔ اس بہلاوے پھسلاوے سے میرا مقصد یہ تھا کہ قاری کو جیسے تیسے کہانی کے انجام تک پہنچا دیا جائے، اگر میں اس میں کامیاب ہوں گا تو پھر مجھے کچھ فکر نہ ہو گا کیونکہ کہانی کی آخری سطور پڑھ لینے کے بعد قاری پر یکبارگی کی غرض و غائیت ایک (استعجاب) کی صورت میں واضح ہو جائے گی۔

اس افسانے میں، طنز کے پیرائے میں زندگی کا جو فلسفہ، محبت و نفرت، جنگ اور صلح، ظلم اور انصاف کے خواص روز ازل سے ابن آدم کی سرشت میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ اور فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ خواص ابد تک اس میں موجود رہیں۔ اگر دو چار، دس بس یا سو پچاس حکومتیں یا حکمران آپس میں مل کر یہ کوشش کریں کہ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امن قائم ہو جائے تو یہ ان ہونی سی بات ہے۔ اس طرح اگر صدہا پیغمبر اور ان کے حواری یہ چاہیں کہ انسان فرشتوں کی طرح معصوم بن جائیں تو یہ بھی

اک امر محال ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سو دو سو برس کے لئے اصلاح ہو جائے اور شر خیر کی صورت اختیار کر لے مگر بدی کا خمیر اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن موقع پاتے ہی پھوٹ پڑتا ہے۔

آسندی میں ملک و قوم کے چند نام نہاد "خیر خواہ اور دردمند" اپنے شہر سے بدی یعنی زنان بازاری کو نکال کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا مگر زیادہ عرصے نہیں گزرنے پاتا کہ بدی ان کے پڑوس ہی میں ایک نئے اور زیادہ دلاویز روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور شہر کے نام نہاد پاکبازوں کے دلوں کو پہلے سے بھی زیادہ دلفریب انداز سے بھاتی اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔"(12)

قیام دلی کے دوران ڈاکٹر عبادت بریلوی غلام عباس کے گھر کے قریب رہتے تھے۔ غلام عباس اور ڈاکٹر عبادت بریلوی "حلقہ ارباب ذوق" میں باقاعدہ طور پر شرکت کرتے تھے۔ اس لئے وہاں متعدد ادباء سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان ادباء غلام عباس کے ساتھ ن۔ م راشد بھی تھے۔ ن۔ م راشد نے مذکورہ خط میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے:

"---اس خط کے ساتھ اپنی ایک تازہ نظم بھجوا رہا ہوں۔ اس میں کسی قدر "میراجیت" آگئی ہے جس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ یہاں آکر یہی ایک نظم اب تک لکھی ہے یہ میرے رجسٹر میں درج کر دو---"(13)

1942ء میں راشد کو فوج میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس لئے وہ اپنی نظمیں غلام عباس کے پاس بھجواتے تھے مگر فوج میں جانے سے پہلے دلی میں 'حلقہ ارباب ذوق' میں شرکت کرتے تھے۔ غلام عباس اور راشد دونوں نے 'حلقہ ارباب ذوق' کے پہلے جلسے میں شرکت کی۔ 'حلقہ ارباب ذوق' کے پہلے جلسے کے بارے میں عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

"---اور میراجی کی کوششوں سے ان بزرگوں اور دوستوں نے جلسوں میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا۔ ان میں پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حامد علی خاں، ن۔ م راشد، فیض صاحب، سید محمد جعفری، اعجاز حسین بٹالوی، ضیاء جالندھری، غلام عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، محمد خلیل الرحمٰن، پریم ناتھ در اور خاصی تعداد میں نئے ادیب اور شاعر شامل تھے۔"(14)

"مولانا (حامد علی خاں) بھی آکر چند منٹ بیٹھے ہی تھے کہ حلقے کے اس افتتاحی جلسے میں شرکت کے لئے ن۔ م راشد، غلام عباس، سید محمد جعفری، مختار صدیقی، اعجاز بٹالوی، ضیاء جالندھری، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، محمد خلیل الرحمٰن، ریوتی سرن شرما، پریم ناتھ در

اور دوسرے ادیب اور شاعر خاصی تعداد میں آ گئے۔"[15]

'حلقہ ارباب ذوق' سے غلام عباس کا رابطہ اس طرح ابتداء ہی سے ہوا تھا۔ یونس جاوید کے بقول غلام عباس نے 1947ء سے لے کر 1948ء کے درمیان میں حلقہ ارباب ذوق میں ایک افسانہ پڑھا[16] اور یہ 'حلقہ ارباب ذوق' کے ریکارڈ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یکم مارچ 1948ء کو حلقہ ارباب ذوق لاہور میں غلام عباس نے "حمام میں" پڑھا تھا۔[17]

بہر حال غلام عباس کا اس حلقے سے تعلق تھا۔ اس سلسلے میں عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

"تقسیم ہند اور قیام پاکستان تک اس کے اجلاس باقاعدگی سے ہر اتوار کو ہوتے رہے لیکن جب دلی میں تقسیم ہند کے موقع پر فسادات کی آگ بھڑکی تو ادیبوں کا گھروں سے نکلنا اور اینگلو عربک کالج (جہاں حلقہ ارباب ذوق کا جلسہ ہوا کرتا تھا) تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی دو چار ادیب جمع ہو جاتے تھے تو حلقے کا اجلاس ہوتا تھا۔

آخری عجیب و غریب جلسہ مجھے یاد ہے کہ منٹو روڈ پر غلام عباس صاحب کے مکان پر ہوا۔ عباس صاحب کا مکان میری جائے قیام سے بہت قریب تھا۔ میں چھپ چھپا کر پانچ منٹ میں ان کے ہاں پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن غالباً جمعرات اور جمعہ کو میں ان کے ہاں پہنچا تو فسادات پر باتیں ہوئیں پھر حلقے کے اجلاس کا ذکر آیا۔ غلام عباس کہنے لگے، اتوار کو حلقے کا جلسہ میرے ہاں کر لیجیے۔ چند احباب جمع ہو ہی جائیں گے، جلسہ ضرور ہونا چاہیے۔"

میں نے ان کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور اتوار کو چار بجے کے قریب ان کی جائے قیام پر منٹو روڈ پہنچا۔ ادیبوں کو اطلاع تو کر دی تھی لیکن کوئی ان کے ہاں پہنچ نہ سکا۔ صرف ایک صاحب جو شاعر تھے پانچ بجے کے قریب عباس صاحب کے ہاں پہنچے۔ اب ہم تین آدمی ہو گئے۔ میں غلام عباس اور شاعر صاحب (نام ان کا یاد نہیں رہا) سوا پانچ بجے کے قریب میں نے عباس صاحب سے کہا کہ "جلسہ شروع کرتے ہیں، آپ اس اجلاس کے صدر رہیں اور افسانہ بھی پڑھیں۔ میرے پاس مختصر سا مضمون ہے، وہ میں پڑھ دوں گا۔ نظم پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ اب صرف ایک سامع اور چاہیے اس کا کوئی انتظام کیجیے۔"

غلام عباس نے کہا۔ "میرے پاس ایک کتا ہے، اس کو بٹھا لیتے ہیں، وہ ضرور ہماری نگارشات سے لطف اندوز ہو گا۔ بہت سمجھ دار اور فرمانبردار کتا ہے۔"

چنانچہ وہ باہر گئے اور اپنے کتے کو کمرے میں لے آئے، وہ واقعی نہایت مہذب اور شائستہ کتا تھا۔ جتنی دیر ہم لوگ مضمون، افسانہ اور نظم پڑھتے رہے وہ سکون سے بیٹھا رہا بلکہ اطمینان سے سنتا رہا اور اس طرح حلقہ ارباب ذوق دہلی کا یہ عجیب و غریب جلسہ اختتام کو پہنچا۔ شہر

میں فسادات کی آگ بھڑکتی رہی، خون خرابہ ہوتا رہا لیکن اس کے باوجود غلام عباس صاحب کے مکان پر حلقہ ارباب ذوق دہلی کا آخری جلسہ ہوتا رہا۔"[18]

عبادت بریلوی کے اس بیان اور یونس جاوید کی اس تحقیق کی بنا پر کہ غلام عباس نے 1947ء سے 1948ء کے دوران ایک افسانہ پڑھا معلوم ہوتا ہے غلام عباس کی حلقہ ارباب ذوق، سے وابستگی رہی البتہ انہوں نے افسانے کم سنائے کیونکہ یونس جاوید کی تحقیق کے مطابق غلام عباس نے اس کے بعد صرف 1967ء سے 1968ء کے دوران ایک افسانہ سنایا اور یہ "دھنک" تھا۔[19]

کتے والا تذکرہ ذرا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کیونکہ "نہایت مہذب اور شائستہ کتا" یہ بات معروضی انداز میں نہیں بلکہ موضوعاتی انداز میں لکھی گئی ہے لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کو حلقہ ارباب ذوق اور اس کی بقا سے کتنا لگاؤ تھا۔ انتظار حسین نے بھی عبادت بریلوی سے سن کر اپنے مضمون میں یہ واقعہ لکھا ہے۔[20]

اس طرح غلام عباس کی ادباء سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ غلام عباس کے آل انڈیا ریڈیو کے رسائل کے مدیر مقرر ہونے کے سلسلے میں پطرس بخاری کی مدد کا بڑا حصہ تھا۔ پطرس بخاری غلام عباس کے دوست رہے۔ اس سلسلے میں مرزا ظفرالحسن کے ہاں یہ ذکر ملتا ہے:

"غلام عباس سے پطرس نے پوچھا تم اپنا فاضل وقت کس طرح کاٹتے ہو۔ بولے دلی کی گلیاں گھوم کر، کہا ایک دن تھک جاؤ گے، اس لئے چلو میں تمہیں آرام کا ایک ٹھکانا بتاتا ہوں۔ اپنے استاد مرزا محمد سعید کے پاس لے گئے، تعارف کرایا اور کہا یہاں بیٹھا کرو، بہت کچھ سیکھ کر اٹھو گے۔

پطرس نے ایک دن افسانہ لکھا مگر انہیں اس کا کوئی اچھا نام نہیں سوجھا۔ غلام عباس کو سنایا اور کہا اس کا کوئی نام بتاؤ۔ غلام عباس نے کہا۔ "میبل اور میں" پطرس کے مضامین میں یہ افسانہ اس نام سے شامل ہوا ہے۔"[21]

پطرس بخاری نے اپنے دوست کے نام ایک خط میں اس زمانے کا ذکر کیا ہے:

"رات میرے ہاں یاران طریقت کھانے پر جمع تھے۔ تاثیر اور ذوالفقار بھی یہیں تھے۔ ان کے علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض راشد، حسرت، عباس، مجید ملک سب موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک طرح کا مصرعہ دے رکھا ہے:

گماں اور ہی تھا مجھے بدگماں پر

شرط یہ تھی کہ ہر ایک چند اشعار اس طرح پر ضرور لکھ کر لائے چنانچہ سب نے حتیٰ کہ میں نے اور آغا حمید نے بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شیاطین جمع ہوئے۔ غزل بھی کہی

گئی، ہزل بھی بکا گیا اور دونوں اصناف میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اسی طرح مشاعرے کے بعد سنجیدہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ ذوالفقار، تاثیر، حفیظ اور فیض نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ پھر خوش گپیاں ہوئیں۔ رات کے ڈھائی بجے مجمع برخاست ہوا اور میں دور دور رہنے والوں کو موٹر پر گھر پہنچا کر خود سوا چار بجے گھر پہنچا۔" (22)

اس طرح کی ایک رات کو غلام عباس کو ایک واقعہ پیش آیا۔ تو اس نے اس واقعہ سے افسانہ "اوورکوٹ" لکھ ڈالا۔ غلام عباس نے ایک جگہ انٹرویو میں کہا:

"دلی کی بات ہے، ایک مرتبہ رات کے وقت پطرس بخاری اپنے چند عزیز دوستوں کو لے کر میرے گھر آئے۔ میں اس وقت صرف بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس خیال سے کہ پورا لباس تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگ جائے گا۔ میں بنیان پر اوورکوٹ پہن کر اور گلے میں مفلر ڈال کر باہر نکلا تو بخاری صاحب نے کہا چلو ہوا خوری کے لئے، میں اسی طرح ان کے ساتھ چلا گیا۔ راستے میں اچانک خیال آیا کہ خدانخواستہ اسی حالت میں مر جاؤں اور تکفین کے وقت میرے کپڑے اتارے جائیں تو دیکھنے والوں کو تعجب ہو گا کہ اس شخص نے ایک میلی بنیان پہن رکھی تھی۔ یہی خیال میرے افسانے "اوورکوٹ" کا محرک ثابت ہوا۔ اس افسانے کی تحریک دلی میں ہوئی مگر اسے بیک گراؤنڈ میں نے لاہور کا دیا۔" (23)

مگر بعد میں غلام عباس نے دوسرے انٹرویو میں اس رات کے واقعہ کے بارے میں مفصل بات کی ہے چنانچہ آصف فرخی کے انٹرویو میں غلام عباس نے کہا:

"ایک دفعہ دوستوں کے ساتھ میں رات کے دس گیارہ بجے ایک کار میں ہوا خوری کے لئے نکلا تو جلدی میں، میں نے شب خوابی کا جو لباس تھا تو اس کے اوپر اوورکوٹ لے لیا اور گلے میں گلوبند لپیٹ لیا تاکہ معقول صورت معلوم ہو۔ تاثیر، فیض اور پطرس یہ لوگ بیٹھے تھے۔ پطرس موٹر چلا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ایسی گرم جوشی پیدا ہوتی جاتی ہے کہ سب لوگ بات چیت کی دلچسپی میں گم رہے۔ ہوا یہ کہ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا، بس اللہ نے بچا لیا ورنہ ہماری موٹر ٹکرا جاتی۔ اس پر میرے ذہن نے یہ کام کیا۔ اب --- یہ صرف مشاہدہ تھا کہ ہم لوگ بے پروائی سے چلا رہے تھے۔ اس پر دماغ نے سوچا کہ خدانخواستہ اگر ٹکر ہو گئی ہوتی اور ہم لوگ زخمی ہو گئے ہوتے یا مر گئے ہوتے، اب یہ مشاہدے سے احساس بنتا ہے کہ جب ہسپتال میں جا کر میرا اوورکوٹ اتارتے تو اندر سے بنیان نکلتی اور وہ بھی پرانی سی --- کتنی شرم کی بات ہوتی کہ اوپر سے جنٹلمین نظر آ رہے ہیں اور اندر میلی بنیان ہے۔ اس کو میرے ذہن نے بنایا اور خیال آرائی کی۔ اس پر مجھے

خیال آیا تھا کہ ایسا ایک نوجوان ہو گا۔۔۔" (24)

دلی میں رہتے ہوئے غلام عباس نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے دو ڈگریاں حاصل کیں۔ یعنی یکم اکتوبر 1941ء کو ادیب عالم، 1942ء میٹرک اور یکم نومبر کو ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ (25) ان میں سے ادیب عالم اور ایف۔ اے کے سرٹیفکیٹ محفوظ ہیں۔ ادیب عالم کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اس سلسلے میں 13 اپریل 1944ء کو ڈاکٹر تاثیر نے غلام عباس کے نام خط لکھا:

"۔۔۔ لاہور امتحان کیسا رہا۔ تم نذیر (احمد، ڈاکٹر) کے ساتھ کیوں نہ لاہور سے شملہ آ گئے؟۔۔۔ خیر تمہارا دہلی آنا مجھے مفید رہا۔۔۔" (26)

اسی طرح ن۔ م راشد نے بھی 9 مئی 1943ء کو خط میں لکھا ہے:

"تمہارا 28 اپریل کا خط بڑے انتظار کے بعد موصول ہوا۔ شکر ہے کہ تم نے آخر ایف۔ اے کا امتحان دے ڈالا، امید ہے اپنی کامیابی کی خوش خبری کے جلوے جلد لکھو گے۔ تمہاری تھوڑی سی غفلت کی وجہ سے اماں جان اور بھابی کو جو پریشانی اٹھانی پڑی اس کا حال پڑھ کر بڑا قلق ہوا۔" (27)

انوار احمد نے لکھا ہے کہ غلام عباس نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کی مگر امتحان کبھی نہ دیا۔ (28) اس سلسلے میں مرزا ظفرالحسن کے ہاں مفصل ذکر موجود ہے۔ یعنی جب غلام عباس آل انڈیا ریڈیو کے رسائل کے مدیر مقرر ہوئے تو اسمبلی میں اعتراض پیش کیا گیا کہ غیر تعلیم یافتہ آدمی کا تقرر جانبداری ہے۔ اس کے جواب میں پطرس بخاری نے غلام عباس کے حق میں لکھا کہ:

"اس شخص کو غیر تعلیم یافتہ کہا جارہا ہے جس نے چالیس پچاس بنگالی، روسی اور مغربی ادیبوں کے شاہکاروں کے تراجم مختلف معتبر رسائل میں شائع کئے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے نام تو معترض نے سنے بھی نہ ہوں گے۔" (29)

آگے مرزا ظفرالحسن نے لکھا:

"اس واقعے کے بعد پطرس نے نیم مزاحیہ انداز میں غلام عباس سے کہا میں اس وقت تو تمہاری ہر طرح مدافعت کے لئے موجود ہوں لیکن اگر کل میں نہ رہا اور کسی نے اس قسم کا اعتراض کیا تو شاید تمہیں تکلیف ہو۔ بہتر ہے کہ تم یونیورسٹی کی سند بھی حاصل کر لو چنانچہ غلام عباس نے پطرس کی ہدایت کے مطابق پنجاب یونیورسٹی سے پہلے ایف۔ اے پاس کیا اس کے بعد بی۔ اے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں برصغیر کی تقسیم کا ہنگامہ برپا ہو گیا اور غلام عباس بی۔ اے کی بات فراموش کرنے پر مجبور ہو گئے۔" (30)

شادی کے بعد یعنی 1939ء سے غلام عباس نے افسانہ کی تخلیق کی طرف رجوع کیا اور معلوم

ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری میں پوری طرح مشغول ہوگئے۔ 1939ء میں انہوں نے مشہور افسانے "آنندی" اور "اندھیرے میں" لکھے[31] اور 1940ء میں "کتبہ" اور "سیاہ و سفید" لکھے۔

افسانہ "آنندی" کے حوالے سے غلام عباس کی ادبی حیثیت مستحکم ہوئی اور ان کو اعلیٰ درجے کا ادبی مقام ملا تھا۔ اس لئے اس افسانے کے بارے میں نہ صرف انہوں نے خود بلکہ بہت سے محققین اور نقادوں نے بھی لکھا۔ مثلاً انتظار حسین نے اس کا سنہ تصنیف 1932ء لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"آنندی، اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا نقطۂ عروج ہے، یہ افسانہ 1932ء میں لکھا گیا۔"[32]

صہبا لکھنوی نے لکھا:

"1939ء میں انہوں نے اپنا مشہور ترین افسانہ "آنندی" لکھا جو فیض احمد فیض کی ادارت میں شائع ہونے والے مقبول ادبی ماہنامہ "ادب لطیف" کے افسانہ نمبر 1941ء میں پہلی بار شائع ہوا۔"[33]

غلام عباس کے مجموعہ "آنندی" میں آنندی کا سنہ تصنیف 1940ء لکھا گیا ہے۔[34] پھر شہزاد منظر کی کتاب کے انٹرویو میں یوں چھپا ہے:

"میرا پہلا افسانہ، جسے اچھا افسانہ کہنا چاہئے "آنندی" تھا۔ 1947ء میں میرا دہلی میں قیام تھا۔ وہاں مجھے بہت اچھا ماحول ملا، وہاں میں نے "آنندی" کے بارے میں سب کچھ مشاہدہ کیا۔ میں نے اس افسانے میں 1937ء کا پس منظر پیش کیا لیکن یہ افسانہ 1947ء میں لکھا گیا تھا۔"[35]

لیکن 1941ء کے رسالہ "ادب لطیف" میں "آنندی" چھپ چکا تھا اور 1945ء میں رسالہ "انصاری" میں محمد حسن عسکری کا مضمون "کچھ آنندی کے بارے میں" شامل تھا۔[36] علاوہ ازیں 1946ء میں "آنندی" نامی ریڈیو ڈراما غلام عباس کے ہاتھوں لکھا گیا اور نشر بھی کیا گیا[37] اور اسی سال وقار عظیم کے مرتب کردہ رسالہ "نیا افسانہ" میں بھی آنندی شامل کیا گیا تھا[38] اور غلام عباس نے مجموعہ "آنندی" میں 1939ء سے پہلے کے کسی افسانے کو شامل نہیں کیا تھا۔ پھر اگر "آنندی" 1940ء کے بعد لکھا جاتا تو مجموعہ "آنندی" کے سرورق میں 1939ء کا ذکر اتنا ضروری نہیں تھا بلکہ "1940ء" بھی لکھا جا سکتا تھا یعنی "آنندی" کا سال تصنیف 1939ء ہونے کی وجہ سے مجموعہ میں 1939ء کا سنہ دیا گیا ہوگا۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ غلام عباس کا افسانہ "آنندی" 1940ء سے قبل یعنی 1939ء میں لکھا گیا۔

"آنندی" کا قلمی مسودہ آصف فرخی کے پاس محفوظ ہے مگر اس سے سنہ تصنیف کا تعین مشکل ہے۔ مشفق خواجہ کے پاس "آنندی کا پس منظر" نامی غلام عباس کا قلمی مسودہ ہے۔ اس میں انہوں نے یہ جملہ لکھا ہے:

"اس افسانے کا خیال مجھے کب اور کس طرح سوجھا۔ اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ افسانہ میں نے سنہ 1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی ہفتے پہلے لکھا تھا۔۔۔"(39)

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی ہفتے پہلے، کا مطلب یہ ہے کہ جولائی یا اگست 1939ء کی بات ہے کیونکہ دوسری عالمی جنگ ستمبر 1939ء میں شروع ہوئی تھی اور یہ قول درست معلوم ہوتا ہے۔

1939ء میں "آنندی" اور "اندھیرے میں" لکھنے کے بعد، 1940ء میں "کتبہ" اور "سیاہ و سفید" 1943ء میں "سمجھوتہ" 1945ء میں "ناک کاٹنے والے"(40) "چکر" 1947ء میں "جواری" "ہمسائے" "حمام میں" لکھا گیا۔ مظفر علی سید کے بقول جب 1946ء میں وقار عظیم کا مرتب کردہ رسالہ "نیا افسانہ" چھپا تو اس میں مجموعہ آنندی کے بیشتر افسانے شامل کیے گئے تھے۔(41)

8 مئی 1947ء کے شاہد احمد دہلوی کے خط میں لکھا گیا ہے کہ "افسانہ نمبر کے لئے اپنا افسانہ اس مہینے کے اختتام تک عنایت کر دیجئے۔"(42) مگر معلوم نہیں کہ غلام عباس نے افسانہ بھیجا تھا یا نہیں۔ اگر بھیجا ہو گا تو کیا بھیجا تھا؟ اسی طرح 1942ء میں راشد نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا تو اس میں راشد نے غلام عباس کے افسانے کا ذکر کیا۔ راشد نے لکھا:

"اگر "زبیدہ" والی کہانی مکمل ہو جائے۔۔۔ گو مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی کہانیوں کو کبھی "مکمل" نہیں ہونے دیتے یعنی چھپ جانے کے بعد بھی ان پر قلم لگاتے رہتے ہو۔۔۔ بہرحال جب تم پورے طور پر یا قریباً پورے طور پر اس کہانی کی تکمیل کے قائل ہو جاؤ اور یہ کسی رسالے میں چھپ چکی ہو تو مجھے اس رسالے کا تراشہ بھیج دینا۔ چھپنے سے پہلے اس کی نقل کے لئے کہنا تو تمہیں بہت زیادہ زحمت میں ڈالنا ہے، لیکن اس کہانی کا جو پلاٹ تم نے مجھے سنایا تھا میرے ذہن میں تمہاری سب کہانیوں سے زیادہ اجاگر اور زندہ تر ہے۔"
(43)

اس کہانی کا عنوان راشد کے دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ راشد نے 16 مارچ 1944ء کے خط میں لکھا:

"یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ تمہارے افسانوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ اگر مجھے

اپنی کہانی "کامریڈ زبیدہ" کی ایک نقل بھیجنے کی زحمت گوارا کر سکو تو اسی پر تبصرہ لکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ اب تک تو تم نے مختصر سا پلاٹ ہی بتایا ہے۔ تمہاری سب کہانیوں سے زیادہ اس کا پلاٹ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ تاہم تفصیلات کی حد تک یاد رکھنا ممکن نہیں۔ یہ خیال بہت اچھا ہے کہ کہانیوں پر تبصرہ شائع ہو، لیکن اپنے دیباچے میں اس کا مقصد واضح کر دو، ورنہ کہ جیسا تم خود جانتے ہو، لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا نقصان (خطرہ؟) ہے۔"(44)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کامریڈ زبیدہ" نامی ایک افسانہ غلام عباس نے لکھا تھا اور 1944ء میں غلام عباس کو اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپوانے کا خیال تھا مگر معلوم نہیں کہ یہ مجموعہ اس زمانے میں کیوں چھپ نہیں سکا۔

آخر کار مجموعہ "آنندی" قیام پاکستان کے بعد 1947ء میں لاہور سے چھپ گیا لیکن غلام عباس کو "آنندی" کے رسالے میں چھپنے سے شہرت مل چکی تھی۔ محمد حسن عسکری کے مضمون اور خود غلام عباس کے ریڈیو ڈرامے کے حوالے سے اس افسانے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

غلام عباس کا یہ دوسرا دور 1939ء سے 1947ء تک کا ہے، جو قیام دہلی کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ دور "افسانہ نگار غلام عباس کا تشکیلی دور" تھا۔ وہ اس "تشکیل" کے ساتھ ساتھ "تکمیل" تک پہنچ رہے تھے۔ اس لئے ان کو اب اعلیٰ درجے کی ادبی حیثیت حاصل ہو رہی تھی۔

پھر اسے "تشکیلی دور" کیوں کہا جائے؟--- اس کی وجہ یہ ہے کہ 1938ء تک غلام عباس کا رجحان تخلیق سے زیادہ ترجمہ اور ماخوذ تحریروں تک محدود تھا چنانچہ غلام عباس نے مجموعہ "آنندی" میں 1938ء سے قبل کے افسانوں کو شامل نہیں کیا لیکن 1939ء کے بعد وہ اپنے آپ کو "تخلیقی افسانہ نگار" کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔

مجموعہ "آنندی" میں ایسے افسانے موجود ہیں جن کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غیر ملکی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً خود "آنندی" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اناطول فرانس کے افسانے سے مماثلت رکھتا ہے۔ "ناک کاٹنے والے" اور آرنسٹ ہیمنگوے کے افسانہ "The Killers" کے پلاٹ اور کردار دونوں ملتے جلتے ہیں۔ "کتبہ" کے بارے میں بھی کہا گیا کہ "Overcoat" سے اخذ کیا گیا ہے۔(45)

لیکن "آنندی" کی جان اس کہانی کی جزئیات نگاری ہے۔ اس کہانی میں جو مقامی ماحول پیش کیا گیا ہے، اسے پڑھنے سے قاری کو لطف محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح "ناک کاٹنے والے" میں بھی پٹھانوں کا مکالمہ اور ان کی حرکات کی وجہ سے کردار نگاری میں دلچسپی موجود ہے۔ اسی طرح "کتبہ"

کے آغاز میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے اس سے دلی کے افسروں کی روزمرہ زندگی کی خاص کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ساری جزئیات نگاری غلام عباس کے افسانے کی جان ہے۔ اس لئے چاہے یہ سب اخذ کئے گئے ہوں پھر بھی سارے افسانے اپنے مقامی ماحول کو پس منظر بنا کر اعلیٰ درجے کی تخلیق بن چکے ہیں۔

غلام عباس کے پہلے دور یعنی بچپن پر تحقیق کرتے ہوئے ذکر ہوا کہ غلام عباس نے بچپن اور لڑکپن میں بہت سے واقعات کا مشاہدہ کیا اور انھوں نے ان مناظر کو پس منظر کے طور پر لا کر دہلی میں دیکھی ہوئی باتوں کو اپنی تخلیقات میں شامل کر دیا۔ اس طرح جزئیات نگاری کے حوالے سے قاری کو عباس کی کہانیاں محسوس ہوتی ہیں۔

قیام دہلی کا ماحول بعد کے ان کے افسانوں کا پس منظر بن گیا چونکہ وہ سرکاری ملازموں کے کوارٹر میں رہتے تھے، جس کا ذکر "بامبے والا"، "تنکے کا سہارا" اور "کتبہ" میں نظر آتا ہے۔ "بامبے والا" کے متعلق عباس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"کناٹ پلیس نئی دہلی کے نواح میں گورنمنٹ کمیٹی نے اپنے ملازموں کے لئے کئی کوارٹر بنا دیئے تھے۔ ایک زمانے میں اس قسم کے کوارٹر میں رہا کرتا تھا۔ اس کہانی میں، میں نے جو نقشے کھینچے ہیں وہ بیشتر حقیقت پر مبنی ہیں۔" (46)

اس طرح "کتبہ" کے بارے میں غلام عباس نے ایک انٹرویو میں کہا:

"مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ دلی میں حوض قاضی سے فتح پوری مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ تانگے میں جاتے ہوئے ایک سنگ تراش کی دوکان پر ایک پتھر دکھائی دیا، جس پر نام لکھا ہوا تھا اور بس۔۔۔ اس کتبے کو دیکھ کر مجھے فوری خیال یہ آیا کہ اس کتبے میں متعلقہ شخص کے مرنے کے بعد دوسری تفصیلات کا اضافہ کیا جائے گا۔ میرے دماغ میں افسانہ مکمل ہو گیا اور میں نے اسی رات چند گھنٹوں میں افسانہ "کتبہ" لکھ ڈالا۔ یہ افسانہ مجھے بہت پسند ہے۔" (47)

اور اس طرح سے غلام عباس کی پہچان حقیقت نگاری کے حوالے سے ہونے لگی۔

اس پس منظر میں دوسرے دور کو یوں متعین کیا جا سکتا ہے کہ جو مناظر پہلے اور دوسرے دور میں مشاہدہ کئے گئے وہ دوسرے دور میں تخلیق کے ذریعے ہمارے سامنے پیش کئے گئے۔ اس لئے دہلی میں یہ تخلیقی عمل غلام عباس کی افسانہ نگاری کے ارتقاء کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس "آنندی" (طبع دوم) لاہور 1955ء

(2) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی 1981ء ص 28، انوار احمد 'غلام عباس مختصر سوانحی خاکہ' "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" ملتان 1988ء ص 255

(3) ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتبہ) "ن م راشد ایک مطالعہ" کراچی 1986ء

(4) ن م راشد 'ایک مصاحبہ' (غیر مطبوعہ) (ملاقات: نسرین انجم بھٹی) 1968ء

(5) فخرالحق نوری 'ایک مصاحبہ' (ملاقات: سوپامانے، بمقام لاہور) 10 ستمبر 1991ء

(6) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 16 فروری 1942ء

(7) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 320 تا 321

(8) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 28

(9) زینب عباس، ایضاً ص 320 تا 321

(10) 28 فروری 1946ء میں ن م راشد نے غلام عباس کے نام خط لکھا تھا۔ یہ پتا اس خط پر لکھا ہوا ہے۔

(11) دہلی یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے پروفیسر گریش بخش صاحب کے بقول اس دور رن تھمن روڈ کو آج کل دہلی میں "شردا نند روڈ" کیا جاتا ہے مگر عموماً "جی بی روڈ" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں دہلی کی کمیٹی نے کب طوائفوں کو اس علاقے سے نکالنے کا عمل کیا تھا۔

(12) غلام عباس "آنندی کا پس منظر" (غیر مطبوعہ) س ن

(13) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 16 فروری 1942ء

(14) ڈاکٹر عبادت بریلوی 'حلقہ ارباب ذوق' دہلی "مقالات حلقہ ارباب ذوق" (مرتبہ ڈاکٹر سہیل احمد خاں) لاہور 1990ء لاہور ص 18

(15) ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایضاً ص 20

(16) یونس جاوید "حلقہ ارباب ذوق" لاہور 1984ء ص 199

(17) "حلقہ ارباب ذوق" کا رجسٹر جو ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے پاس محفوظ ہے۔

(18) ڈاکٹر عبادت بریلوی 'حلقہ ارباب ذوق' دہلی "مقالات حلقہ ارباب ذوق" (مرتبہ ڈاکٹر سہیل احمد خاں) لاہور 1990ء ص 23 تا 25

(19) یونس جاوید "حلقہ ارباب ذوق" لاہور 1984ء ص 255

(20) انتظار حسین 'ڈاکٹر عبادت بریلوی' "ملاقاتیں" لاہور 1988ء ص 36

(21) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس' رسالہ "غالب (ا)" کراچی 1975ء ص 142 تا 143

(22) پطرس بخاری "پطرس کے خطوط" دہلی، 1978ء ص 60 تا 61۔ یہ خط عبدالمجید سالک کے نام لکھا گیا ہے، لیکن اس خط میں سالک کا ذکر اس انداز میں ہوا ہے جیسے یہ خط کسی دوسرے آدمی کے نام لکھا جا رہا ہو۔

(23) مرزا ظفر الحسن ایضاً ص 147 تا 148

(24) آصف فرخی 'غلام عباس'، "حرف من و تو" کراچی 1986ء ص 35 تا 39

(25) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 27

(26) ڈاکٹر تاثیر "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 13 اپریل 1942ء

(27) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 9 مئی 1944

(28) ڈاکٹر انوار احمد 'غلام عباس--- مختصر سوانحی خاکہ' "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" ملتان 1988ء ص 254

(29) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس' ایضاً ص 142

(30) مرزا ظفر الحسن ص 143

(31) 'آنندی' کے سنہ تصنیف کے بارے میں آگے کی بحث دیکھئے۔ مجموعہ "آنندی" میں مشتمل باقی افسانوں کا سنہ تصنیف اسی مجموعہ کے ہر افسانے کے آخر میں دیا گیا ہے۔ اس مقالے میں یہی سنہ تصنیف دیا گیا ہے۔

(32) انتظار حسین 'ڈاکٹر عبادت بریلوی' "ملاقاتیں" لاہور 1988ء ص 20

(33) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 27

(34) غلام عباس "آنندی" (طبع دوم) لاہور 1955ء ص 256

(35) غلام عباس 'غلام عباس سے مفصل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 106

(36) محمد حسن عسکری 'کچھ آنندی کے بارے میں' رسالہ "انصاری" دہلی یکم فروری 1945ء

(37) اس کا قلمی مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:
"'آنندی' (از غلام عباس)
(تالیاں شور وغیرہ)
مقرر ا اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا مقام شہر کے ایک ایسے---"
اس انداز سے 36 لائن پر مشتمل 9 صفحات کا قلمی مسودہ ہے اور اس میں "30 جنوری 1946ء بی سی" لکھا ہوا ہے۔ "بی سی" کا مطلب براڈ کاسٹ ہوگا۔

(38) غلام عباس 'آنندی' رسالہ "نیا افسانہ" (مرتب: وقار عظیم) دہلی 1946ء

(39) غلام عباس "آنندی کا پس منظر" (غیر مطبوعہ) س ن

(40) 'ناک کاٹنے والے' کا قلمی مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ 22 لائن پر مشتمل 15 صفحات کا افسانہ ہے اور "26 اگست 1945ء" کی تاریخ دی گئی ہے۔

(41) مظفر علی سید "غلام عباس--- آنندی کے بعد" (غیر مطبوعہ، برائے رسالہ "غالب" غلام عباس نمبر ص 1)

(42) شاہد احمد دہلوی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 8 مئی 1947ء

(43) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 8 مئی 1947ء

(44) ن م راشد، ایضاً 16 مارچ 1944ء

(45) غلام عباس کا اپنا افسانہ "اوورکوٹ" ہے اور اس افسانے کے سلسلے میں بھی گوگول کے مشہور افسانہ "Overcoat" سے مماثلت کے بارے میں لوگ بحث کرتے ہیں لیکن ان دونوں میں مماثلت نہیں اور خود غلام عباس نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا کہ "میرا اوورکوٹ گوگول کے اوورکوٹ سے مختلف ہے" (اخبار "جسارت" لاہور 25 جون 1982ء)

(46) غلام عباس "بامبے والا پر نوٹ" (غیر مطبوعہ) س ن، ص 15

(47) مرزا ظفر الحسن ایضاً ص 143

0 – 3 – 1 تیسرا دور

1 – 3 – 1 مجموعہ "آنندی" کی اشاعت اور قیام لندن کا دور

(1947ء تا 1952ء)

افسانہ "آنندی" جب دہلی کے رسالے "ادب لطیف" میں چھپا تو غلام عباس کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ اس لئے 1940ء تک غلام عباس کو خاصی شہرت مل چکی تھی اور پھر پاکستان کا قیام قریب آگیا۔ مرزا ظفرالحسن نے لکھا ہے:

"قیام پاکستان سے کئی ماہ پہلے سے غیر منقسم ہند کے مسلمان ملازمین سرکار سے پوچھا جارہا تھا کہ کون پاکستان جانا چاہتا ہے۔ غلام عباس نے اپنا نام لکھوایا اور پاکستان آگئے۔"[1]

چنانچہ غلام عباس ریل گاڑی سے دہلی سے لاہور آئے۔ اس وقت ان کے پاس قائداعظم محمد علی جناح کا وہ پہلا مسودہ تھا جو قیام پاکستان کے موقع پر پوری قوم کو سنانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔[2] جس ریل گاڑی میں غلام عباس سوار ہوئے تھے، وہ پاکستان جانے والی آخری ریل گاڑی تھی جو حفاظت سے پہنچی۔ اس کے بعد جتنی گاڑیاں آئیں، ان سب پر حملے ہوئے اور فسادات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد غلام عباس کی بچی طاہرہ پیدا ہوئی۔ پھر غلام عباس لاہور سے اپنے گھر والوں کو لے کر کراچی چلے گئے۔ یہ واقعہ بھی 1947ء میں ہوا کیونکہ غلام عباس کو کراچی میں ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی تھی۔ پھر 1948ء میں ان کو ریڈیو پاکستان کے اردو رسالہ پندرہ روزہ "آہنگ" کا پہلا مدیر مقرر کیا گیا۔[3] مرزا ظفرالحسن کے بقول:

"اس وقت کے خراب حالات کی وجہ سے ریڈیو پاکستان کے پروگراموں کا رسالہ 1948ء سے پہلے شروع نہ ہوسکا۔ "آواز" کے مدیر ہونے کی بنا پر ظاہر ہے "آہنگ" کے مدیر بھی

غلام عباس ہی بتائے جاسکتے تھے۔"(4)

غلام عباس نے اپنے ایک شخصی تعارف نامے میں لکھا:

"1947-1948

Editor "Ahang" Murdu fortnightly journal of Radio Pakistan. Karachi." (5)

"Murdu" کا لفظ سمجھ میں نہیں آسکا۔ لگتا ہے کہ "In Urdu" کی جگہ غلطی سے ٹائپ کیا گیا ہو۔

یہ معلوم نہیں ہے کہ غلام عباس نے مکتبہ جدید' لاہور سے کب اور کیسے رابطہ قائم کیا۔ یعنی آیا دہلی سے لاہور آتے ہی رابطہ قائم کیا تھا یا کراچی جانے کے بعد، دراصل "مکتبہ جدید" "مکتبہ اردو" کی تقسیم کے بعد 1946ء میں قائم ہوا اور مکتبہ اردو سے ن۔ م راشد کی کتاب شائع ہو چکی تھی بلکہ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور سجاد ظہیر جیسی شخصیات کی تصانیف اسی ادارے سے چھپ چکی تھیں۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ غلام عباس اپنے مجموعے کو یہاں سے شائع کرانے کی خواہش رکھتے تھے۔ غلام عباس کو پہلے سے یہ مجموعہ چھاپنے کی خواہش تھی۔ پطرس بخاری نے اپنے ایک خط میں لکھا:

"عزیزی دونوں کہانیاں پڑھیں اور ان پر تنقیدیں بھی پڑھیں۔ عصمت کا تعارف تنقید نہیں بعض تاثرات ہیں، لیکن دلچسپ ہیں۔ عسکری نے "آنندی" کو گہری اور تیز نگاہ سے دیکھا ہے اور کہانی کے کسی اہم پہلو کو نظرانداز نہیں کیا۔ بسم اللہ کیجئے اور مجموعے کو اس نقشے کے مطابق چھاپ دیجئے جو آپ نے تجویز کر رکھا ہے۔"(6)

اس خط کی تاریخ 3 فروری ہے مگر معلوم نہیں کس سنہ کا ہے، مگر اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کے ذہن میں مجموعے کے لئے خاص نقشہ بن چکا تھا بہرحال مجموعہ "آنندی" جدید اردو ادب کے مشہور اشاعت خانہ، مکتبہ جدید سے شائع ہوا۔ یہ 1948ء کی بات ہے۔(7)

1948ء سے 1949ء تک ان کو دوسری ملازمت مل گئی۔ وہ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہوئے اور کرنل مجید ملک کے ماتحت اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔(8)

غلام عباس نے خود لکھا:

"1948-1949

Assistant Director of Public Relations, Ministry for Kashmir Affairs, Government of Pakistan " [9]

مجموعہ "آنندی" کی اشاعت کے فوراً بعد اس مجموعے کے متعلق بے شمار تنقیدی مضامین لکھے گئے۔

29 مئی 1948ء کو خواجہ احمد عباس نے انگریزی میں "آنندی" پر تبصرہ لکھا۔ انہوں نے شہر بمبئی میں ہونے والے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

--- I am reminded of a short story in Urdu entitled "Anandi" by half a namesake, Ghulam Abbas, which is regarded as many critics as one of the ten best short stories in Urdu Literature---" [10]

اس جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت متعدد نقاد غلام عباس کو اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں سے ایک قرار دے چکے تھے۔ نومبر 1948ء میں رسالہ "نگار" میں تبصرہ کیا گیا۔ [11] 23 دسمبر 1948ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے احتشام حسین نے "آنندی" پر تبصرہ نشر کرایا۔ [12] 20 فروری 1949ء کو اخبار "The Pakistan Times" میں ڈاکٹر تاثیر کا تبصرہ چھپا۔ [13] 28 اپریل 1949ء کو ریڈیو پاکستان کی جانب سے ایس۔ ایم عمر فاروق کا تبصرہ نشر کیا گیا۔ [14] جنوری 1950ء میں انتظار حسین نے "تین افسانہ نگار" کے عنوان سے رسالہ "ماہ نو" میں ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ [15]

اس مجموعے پر نہ صرف تبصرے لکھے گئے بلکہ 1948ء میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس لاہور نے نقد ادبی انعام سے نوازا۔ [16] اس وقت نظم کے لئے غلام مصطفیٰ صوفی تبسم کے مجموعہ "جھولے" کو اور نثر میں غلام عباس کے "آنندی" کو انعام مل گیا۔ اس کے متعلق پطرس بخاری نے خط لکھا:

"تاثیر کے خط سے معلوم ہوا کہ "آنندی" کو غالباً انعام مل جائے گا۔ خدا کرے اب تک مل گیا ہو۔" [17]

یہ تمام تبصرے غلام عباس کی افسانہ نگاری کی تعریف سے بھرے ہوئے ہیں اور ایک نئے افسانہ نگار کے ظہور پذیر ہونے پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

30 اکتوبر 1948 کو محمد حسن عسکری نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں سلیم احمد کی نوکری کے متعلق ذکر آتا ہے:

"صاحب ایک چھوٹا سا کام ہے۔ وہ یہ کہ میرے ایک دوست اور شاگرد ہیں سلیم احمد۔ ویسے وہ شاعر بھی ہیں تو وہ کچھ روزگار قسم کی چیز چاہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کراچی ریڈیو سے انہیں ڈراموں میں پارٹ یا کوئی اور کام، بچوں کے فیچر وغیرہ کا کام مل جایا کرے؟ انہیں لکھ رہا ہوں کہ آپ سے جا کر ملیں۔ آپ ان سے زبانی بات کر ہی لیں۔"(18)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کو ریڈیو پاکستان میں خاصی اہم حیثیت مل چکی تھی۔ اس خط میں عسکری نے آگے یوں لکھا ہے:

"آپ نے "اردو ادب" کو جو افسانہ دیا ہے وہ منٹو کو بے حد پسند آیا ہے۔ وہ تو ایک دن یہاں تک کہنے لگے کہ بس عسکری صاحب میں تو افسانہ نگار ہوں ہی نہیں، اس افسانے کے سامنے میرا افسانہ "کالی شلوار" بکواس ہے۔ غرض وہ آپ کے افسانے کی اکثر تعریف کرتے رہتے ہیں۔"(19)

منٹو کو یہاں تک کہنے پر مجبور کرنے والا افسانہ کون سا تھا۔ منٹو نے 3 نومبر کو غلام عباس کو نام خط میں لکھا:

"تمہارا افسانہ "دوسری بیوی" (شاید عنوان کچھ اور ہے) خوب تھا۔ مجموعہ مرتب کر رہا ہے۔ اس میں تمہاری شرکت بے حد ضروری ہے۔ تمہارے قریب قریب سارے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں جو بھی نیا لکھا ہو بھیج دو، ممنون ہوں گا۔ لاہور کب آؤ گے؟"(20)

یہ افسانہ 'دوسری بیوی'، نہیں 'اس کی بیوی'، کی بات ہو گی اور یہ افسانہ مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" میں شامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اس کی بیوی" 1948ء میں لکھا جا چکا تھا۔

لیکن اس دور میں ان کا تخلیقی عمل بہت سست ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کی ذاتی مصروفیات جو خاص طور پر نئی ملازمت کے حوالے سے پیدا ہوئیں، ان کی وجہ سے انہیں تخلیق کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ "آنندی" کی شہرت کے ذریعے ان دنوں آرام سے گزارہ ہو سکتا تھا۔ کراچی میں جب سجاد باقر رضوی کی پہلی ملاقات غلام عباس سے ہوئی تو سجاد باقر رضوی نے پوچھا "آپ وہی افسانہ نگار غلام عباس صاحب ہیں؟--- تو غلام عباس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جی ہاں، میں آنندی والا غلام عباس ہوں۔"(21)

اس دور میں انہوں نے 1949ء کے رسالہ "ماہ نو" میں 'ترکی ٹوپی'، کے عنوان سے ایک فرانسیسی افسانے کا ترجمہ پیش کیا لیکن دراصل یہ ترجمہ 1927ء کے رسالہ "نیرنگ خیال" میں شائع ہو چکا تھا۔ یعنی یہ اس زمانے کی تخلیق نہیں۔

چونکہ غلام عباس کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا تجربہ تھا۔ اس لئے ان کو 1949ء میں

ریڈیو پاکستان کی جانب سے بی بی سی لندن جانے کا موقع ملا۔ وہ بی بی سی کے اردو پروگرام کے نگراں مقرر ہوئے۔ تین سال کے لئے گئے۔ اس وقت لندن کے بی بی سی اردو سروس میں کل چھ سات آدمی تھے اور ان میں سے صرف غلام عباس کی نوکری پکی تھی۔ [22] اس سلسلے میں شہزاد منظر نے لکھا ہے:

"اتفاق سے 1949 میں بی بی سی لندن میں ایک پروڈیوسر کے لئے آسامی نکلی۔ غلام عباس نے امتحان دیا، وہ منتخب کر لئے گئے اور لندن چلے گئے جہاں انہوں نے بحیثیت پروڈیوسر 1951ء سے 1952ء تک کا عرصہ گزارا۔ انہیں وہاں سالانہ بارہ سو پونڈ معاوضہ ملا تھا لیکن انکم ٹیکس وغیرہ کٹ کر 95 پونڈ مل جاتا تھا۔ بی بی سی والوں نے انہیں برطانوی شہریت دینے کی پیشکش کی تو وہ چلے گئے۔ تنخواہ کافی اچھی تھی، مکان آرام دہ تھا، رفقائے کار اچھے تھے اور کام بھی ان کی مرضی کے مطابق تھا۔" [23]

دراصل بی بی سی کی ملازمت کے سلسلے میں غلام عباس 1948ء سے خواہش مند رہے تھے چنانچہ 2 مارچ 1948ء کے پطرس بخاری کے خط میں لکھا گیا ہے:

"--- آپ کا خط کل ملا۔ آپ کی ترقی کا حال پڑھ کر از حد مسرت ہوئی۔ بی بی سی میں کچھ عرصہ ملازمت کا خیال دلکش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بی بی سی والے آپ کے کام اور شرافت طبع سے بے حد مطمئن ہوں گے اور آپ کو عزت سے رکھیں گے۔

--- نہ معلوم آپ کے چلے جانے کی کیا صورت ہے کیا دوران ملازمت بی بی سی میں پاکستان کی کسی آسامی پر آپ کا استحقاق قائم رہے گا یا نہیں؟ بی بی سی میں جو پاکستانی یا ہندوستانی نوکر ہوتے ہیں، انہیں بیشتر وطن واپس آ کر تکلیف ہوئی ہے اور کئی عرصے تک کہیں ان کے پاؤں جمنے نہیں پاتے اور وہ ڈانواں ڈول رہتے ہیں۔ واپس تو ایک دن آنا ہی ہوگا اس امر کا خیال ضرور رکھ لیجئے کہ واپس پر کیا صورت ہوگی---" [24]

پطرس کے کہنے کے مطابق غلام عباس نے قیام لندن کے دوران 1950ء میں واپسی کے بعد کی صورتحال کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر زیڈ۔ اے بخاری سے سوال کیا مگر 1952ء میں جب غلام عباس پاکستان واپس آئے تو ان کو کافی پریشان ہوئی۔

شہزاد منظر نے لکھا کہ غلام عباس 1951ء میں لندن گئے، یہ غلط ہے۔ زینب عباس کی آپ بیتی کے مطابق غلام عباس جولائی 1949ء کے بعد لندن آئے [25] چنانچہ 7 نومبر 1949ء کو عبدالرحمن چغتائی نے لندن میں غلام عباس کے نام خط لکھا ہے۔ چغتائی نے لکھا:

"لاہور کے حالات بدستور ویسے ہیں۔ آپ کی لندن میں کیسی گزر رہی ہے۔" [26]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ غلام عباس نومبر میں لندن آچکے تھے۔ لندن کے غلام عباس کے بارے میں زینب عباس نے لکھا:

"When Abbas had first arrival in London from Pakistan, he felt lonely and unhappy. He had tried to get his family over to join him. There were delays and frustrations, eventually they had remained and he stayed. After six months he began to feel comfortable. Then at the age of forty-five he set out to enjoy what the remaining two and a half years' had to offer. Abbas was a short story writer already renowned in India and Pakistan. Though active and jolly, he was reserved and liked to live privately." (27)

یعنی غلام عباس اپنے گھر والوں کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن یہ نہ ہو سکا۔ اس لئے انہوں نے شروع میں اداسی محسوس کی لیکن آہستہ آہستہ اس ماحول کے عادی ہو گئے۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ وائلن، گیٹار اور فلوٹ کی مشق کرتے تھے۔ زینب عباس نے لکھا ہے:

"He was enjoying himself. He acuired a violin, a guitar and a flute. He sat and practised for hours at a time.

He bought second-hand books nearby every day. Abbas's thumb was solid and flat and it seemed to grow from the leaves of the books he handled, as naturally as a mushroom grows among grasses. A bookshop was the pasture from which he drew his intellectual sustenance. His dynamism came through living. He also stopped to buy second-hand records." (28)

پھر غلام عباس روزانہ پرانی کتابیں خریدتے رہے اور مصوری بھی انہوں نے سیکھی، مگر اس میں

اتنا کامیاب نہیں ہو سکے۔ بقول زینب عباس:

"--- He asked his friends to bring him art books, pencils, and drawing paper, also scented oils. He spent his time drawing and studying the masters. Abbas, drawing never developed further than a series of voluptuous curves which delineated a female figure in a highly stylized way; but to the nurses and the patients on the ward he was--- The Artist." (29)

خود غلام عباس اپنے شخصی تعارف نامے میں لکھتے ہیں کہ "موسیقی کا ذوق" رکھتا ہوں (30) اور بعض انٹرویوز میں کہا۔ "اگر میں افسانہ نگار نہ ہوتا تو موسیقار ہوتا۔" انتظار حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"غلام عباس اگر افسانہ نگار نہ ہوتے تو موسیقار ہوتے۔ یعنی "آنندی" نہ لکھتے تو سارنگی بجاتے موسیقی محض شوق کی حد تک نہیں تھی، باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ گندھرو مہاودیالیہ میں گانے بجانے کے درس لئے--- پھر استاد عبدالوحید کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ موسیقار کی حیثیت سے ایک ادارے میں ملازم ہونے لگے تھے کہ اچانک افسانے نے درمیان میں آ کر راستہ روک لیا۔ پھر بیشک استاد عبدالوحید خاں کی شاگردی میں ایک عمر گزاری مگر افسانے کے جادو نے موسیقی کو پنپنے نہ دیا۔" (31)

پہلے دور میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ غلام عباس نے لاہور میں مشرقی اور مغربی موسیقی باقاعدگی سے سیکھی تھی۔ مرزا ظفر الحسن نے غلام عباس کی موسیقی کی مہارت کے بارے میں لکھا ہے:

"--- اور اس مشق کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک دوست نے کہا کہ "چلو تمہیں وائلن کی نوکری دلوا دیتے ہیں۔" لاہور میں ایک ریلوے کلب اور اس کا ایک آرکسٹرا تھا جس کے ڈائریکٹر اپنے وقت کے مشہور وائلن نواز بھائی چھیلہ پٹیالے والے تھے۔ غلام عباس کے دوست انہیں بھائی چھیلہ کے پاس لے گئے اور ان کا وائلن سنوایا۔ بھائی چھیلہ کو وائلن اتنا پسند آیا کہ انہوں نے فی الفور سو روپے تنخواہ کی پیشکش کر دی اور وعدہ کیا کہ جلد ترقی بھی دیں گے۔ اس وقت غلام عباس کو "پھول" اخبار سے 75 روپے ماہانہ ملتے تھے۔" (32)

سعید مرتضیٰ زیدی نے بھی یہی بات لکھی (33) مگر زینب عباس نے کہا کہ اس کو اتنا کمال حاصل

نہیں تھا۔[34] لگتا ہے کہ خود غلام عباس نے اپنی مہارت کا مبالغہ آمیز بیان کیا بہرحال ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کو موسیقی سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔

قیام لندن کے دوران غلام عباس کو موسیقی کے ریکارڈ جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔[35] وہ روزانہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مغربی موسیقی کو ہندوستان کے موسیقی کے قواعد میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔[36] غلام عباس کے ایک غیر مطبوعہ نوٹ میں ہندوستان کی موسیقی کے قواعد لکھے گئے ہیں۔[37]

اس زمانے میں دو خواتین کے ساتھ عشق بھی ہوا ایک بچہ بھی ہوا تھا مگر شادی نہ ہو سکی۔ پھر کرس سے ملاقات ہوئی۔ کرس کا اصل نام نذیر احمد (ڈاکٹر) کے 31 جنوری 1977ء کے خط میں نظر آتا ہے۔ نذیر احمد نے "Christable" لکھا ہے[38] اور خود Christian بھی لکھتی ہے۔ یہ انگریز نژاد خاتون بعد میں غلام عباس کی دوسری بیگم بن گئی۔ غلام عباس نے کرس کو بتایا کہ ان کے پاکستان میں بیوی اور بچے ہیں۔ غلام عباس کے پرس کے جیب میں بچوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں اور بیوی بچوں کے لئے لندن سے پیسے بھجوایا کرتے تھے۔ غلام عباس اور کرس ایک فلیٹ لے کر اکٹھے رہنے لگے۔ یہ 1951ء کے موسم بہار کی بات ہے۔ اس وقت کے ان دونوں کی رہائش کا پتہ یہ ہے:

4, Elsworthy Terrace, London.[39]

بی بی سی لندن میں غلام عباس کا کام انگریزی خبروں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ اردو پروگرام کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ جب دنیا کے مشہور دریاؤں کے بارے میں پروگرام بنا رہے تھے تو ان کے دوست "وقار" نے دریائے سندھ یا دریائے نیل کا پروگرام نشر کرایا تھا۔ پھر جب عباس دریائے ٹیمز (Thames) اور دریائے سین (Seine) کا پروگرام بنا رہے تھے تو انہوں نے کرس سے مسودہ لکھنے کو کہا۔ اس سلسلے میں غلام عباس نے کہا:

"Gather information from hooks and use your imagination." [40]

حالانکہ غلام عباس کا یہ قول کرس کے لئے تھا لیکن اسے خود غلام عباس کی تخلیق کا مرکزی خیال کہا جاسکتا ہے۔ مغرب کے ادب سے معلومات حاصل کر کے اس میں اپنا تخیل استعمال کرنے سے غلام عباس نے متعدد اچھے افسانے لکھے۔

25 اکتوبر 1950ء کے غلام عباس کے نوٹ میں "چند خطوط" نامی ایک افسانہ موجود ہے۔[41] یہ افسانہ بعد میں 1955ء کے رسالہ "ماہ نو" میں شائع ہوا۔[42] پھر 1951ء اور 1952ء میں رسالہ "پھول" میں چند کہانیاں شائع ہوئیں لیکن اس دور میں کوئی نمایاں تخلیقی عمل نظر نہیں آتا بلکہ یوں

کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور "آنندی" کی شہرت اور ذاتی مصروفیات میں گزرا۔ ویسے اس زمانے میں عباس نے رسالہ "نیا دور" کے لئے افسانہ "سایہ" لکھ کر بھیج دیا تھا۔ 7 جنوری 1951ء کے خط میں ممتاز شیریں نے لکھا:

"آپ کا افسانہ "سائے" مل گیا، بہت بہت شکریہ! رسید کی اطلاع دینے میں دیر یوں ہوئی کہ "خاص نمبر" دو ایک دنوں میں نکلنے والا تھا، خیال ہوا کہ یہ بھیج کر ہی آپ کو خط لکھوں۔ اب خاص نمبر آپ کو بھیج دیا ہے۔ اب تک مل بھی چکا ہو گا۔ پڑھ کر ضرور لکھئے گا کہ کیسا ہے؟

"سائے" پہلے میں نے پڑھا، پھر شاہین نے۔۔۔ افسانہ ہم دونوں کو بہت پسند آیا۔ آپ کے سبھی افسانوں کی طرح یہ بھی صاف ستھرا اور نفیس ہے۔ آپ نے جو موضوع لیا ہے اس میں اچھی جزئیات کے باوجود افسانے کے سپاٹ اور غیر دلچسپ ہو جانے کا اندیشہ تھا، لیکن آپ نے افسانے کو سپاٹ اور غیر دلچسپ نہیں ہونے دیا۔
کہانی لطافت سے دھیمے دھیمے کلائمکس کی طرف بڑھتی ہے اور کلائمکس اور اختتام بھی بہت خوب ہیں۔ اگر ہمیں قطعی طور پر یہ بات معلوم ہو جاتی کہ لڑکی پر کیا گزرتی ہے تو افسانہ ٹھیلے والے کی بجائے لڑکی کی طرف جھک جاتا۔ ایک کم کامیاب افسانہ نگار یہاں آن کر یہی غلطی کر بیٹھتا۔ اب آپ کے افسانے میں ہم سب کچھ ٹھیلے والے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اس کے قیاس سے اندازہ لگاتے ہیں۔ لڑکی کے انجام کی خبر دینے کے بجائے افسانے کو ٹھیلے والے کی concern اور بے چینی پر ختم کر دینا فن کارانہ ٹچ ہے اور یہ ان جانی تذبذب اور Un-certainity کی کیفیت عجیب لطف دے گئی ہے۔

"سائے" نیا دور میں شائع ہو رہا ہے۔ براہ کرم بھولے سے اسے کہیں اور نہ بھیجئے گا۔"(43)

اس خط سے ایک بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس افسانے کا عنوان پہلے "سائے" تھا جو بعد میں "جاڑے کی چاندنی" میں "سایہ" کے عنوان سے طبع ہوا۔ اسی طرح اس زمانے میں رسالہ "نیا دور" میں افسانہ "سرخ جلوس" شائع ہوا(44) اور ڈرامہ "کنارہ" بھی نیا دور میں طبع ہوا(45) لیکن مجموعی طور پر اس زمانے میں غلام عباس نے بہت کم تخلیق کی۔

لیکن اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ جس طرح غلام عباس کے بچپن کا ماحول بعد کے افسانوں کے پس منظر بن گیا تھا اس طرح قیام لندن کے واقعات بھی ان کے بعد کے افسانوں کا پس منظر یا موضوع بن گئے۔ مثلاً 'مکرجی بابو کی ڈائری'، اور 'ایک دردمند دل'، ہیں۔ افسانہ 'مکرجی بابو کی ڈائری' کے بارے میں اس نے لکھا:

"مکرجی بابو کو میں نے لندن میں دیکھا تھا اس کا نام کچھ اور تھا۔ اس نے اپنی ڈائری میں واقعی لڑکیوں کے نام اور پتے لکھ رکھے تھے۔ میں نے اس کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ میری اپنی تخلیق ہیں۔"(46)

اس طرح "ایک درد مند دل" کے بارے میں لکھا:

ایک درد مند دل خود میری اپنی زندگی ہے۔ جس طرح میں اسے لندن میں گزارا کرتا تھا۔ بال روم ڈانسنگ، ڈانسنگ سیکھنا، ڈپلوما حاصل کرنا، ایک محفل میں اجنبی لڑکی سے ملاقات، یہ سب میری آپ بیتی ہے البتہ اپنے ملک میں واپس آکر مجھ پر اور اس لڑکی پر کیا ہوئی۔ اسے محض میری خیال بندی تصور کر لیجیے۔"(47)

قیام لندن کے دوران غلام عباس اور کرس دونوں نے فرانس اور سپین کی سیر کی۔ سپین میں الحمراء، قرطبہ، میڈرڈ، ہرادو، غرناطہ، ملاگہ، ویلنسیا جیسے مقامات دیکھے۔(48)

اس زمانے میں لندن میں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ مل کر ادبی جلسے یا مشاعرہ کراتے تھے۔ غلام عباس شوق سے ان جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔(49) ایک دن غلام عباس کو اے ایس بخاری (پطرس بخاری) کا خط ملا۔ پطرس بخاری اس وقت نیویارک کے اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ پطرس نے لکھا کہ اقوام متحدہ میں ملازمت کی گنجائش ہے۔ اس کے جواب میں غلام عباس نے نیویارک جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے کرس سے نیویارک کی ملازمت کے سلسلے میں پوچھا تو کرس نے کہا کہ میرا شوہر تخلیقی آدمی ہونا چاہیے۔ پھر غلام عباس نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔(50) کرس کے اس قول کے مطابق افسانہ نگار غلام عباس آخری عمر تک پاکستان میں رہے۔ جب غلام عباس نے یہ فیصلہ کیا تو اس کے فوراً بعد یعنی 1951ء میں ن۔ م راشد کو اقوام متحدہ میں ملازمت ملی۔ ممکن ہے کہ راشد کی ملازمت کے سلسلے میں پطرس بخاری کے علاوہ غلام عباس کا مشورہ بھی شامل ہو۔

اس سلسلے میں پطرس بخاری کے خط میں مزید تفصیلات موجود ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کی ملازمت کے لئے غلام عباس اور ن۔ م راشد کا مقابلہ ہوا تھا یا تو اقوام متحدہ والے پہلے راشد کو بلا رہے تھے مگر درمیان میں راشد کی بجائے غلام عباس کو بلانے لگے۔ پھر بعد میں دوبارہ راشد کو بلانے کا فیصلہ کیا چنانچہ پطرس نے لکھا:

"---حالات یہ ہیں کہ اب یو۔ این والے پھر راشد کی طرف راغب معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے آپ کا نام یوں آگے چلایا تھا کہ راشد کے آنے (کی) امید بالکل مٹ چکی تھی۔ وزارت نشریات نے مجھے اطلاع دی تھی کہ راشد کو وہ مستعار دینے پر تیار ہیں۔ وزارت

ی نے آپ کا نام راشد کے بدلے تجویز کیا۔ اس پر میں نے آپ کو لکھا کہ آپ اپنے کوائف یو۔ این والوں کے پاس بھیجیے۔ ان کے کہنے پر آپ کی آواز کے ریکارڈ بھی انہیں بھجوائے۔

چند دن ہوئے معلوم ہوا کہ ادھر یو۔ این والے پھر سے راشد کو بلانے پر غور کر رہے ہیں اور ادھر راشد استعفیٰ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب میں بالکل بے خبر ہوں کہ راشد آخر الامر استعفیٰ دے کر کراچی کو خیرباد کہیں گے یا نہیں؟ ان کا استعفیٰ وہاں منظور ہو گا یا نہیں؟۔۔۔ اگر ان کا مستعفی ہونا وزارت نشریات کی رنجش کا باعث ہوا تو کیا اس صورت میں پھر بھی یو۔ این والے معتوب وزارت کو اپنے یہاں ملازم رکھیں گے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب ابھی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ راشد صاحب تو یو۔ این والوں کا اول انتخاب ہیں لیکن باقی مسئلے ابھی الجھے ہوئے ہیں۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ آپ اپنا پروگرام یو۔ این سے بے نیاز ہو کر مرتب کیجیے۔ آتا ہو تو ہاتھ نہ دیجیے۔ جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے۔ اس کے علاوہ اندریں حالات اور چارہ ہی کیا ہے۔ کوئی بات پتے کی اور محکم معلوم ہوئی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا پھر اس وقت جیسے حالات ہوں گے اس کے مطابق آپ اپنے دستور العمل میں ردوبدل کر سکتے ہیں۔"(51)

پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی زیڈ۔ اے بخاری اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈائریکٹر جنرل تھے جب زیڈ۔ اے بخاری لندن آئے اور غلام عباس نے پاکستان واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو زیڈ۔ اے بخاری نے اس سلسلے میں مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ واپسی کے بعد کے حالات کے بارے میں غلام عباس زیڈ۔ اے بخاری سے خط کے ذریعے بھی پوچھا کرتے تھے چنانچہ زیڈ۔ اے بخاری کے خط میں یوں لکھا گیا ہے:

"کل آپ کا خط ملا، پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے آپ بہ وجوہ ولایتی ہو گئے ہوں۔ تو یہ اتنی بھی "ہوا خوری" کیا معنی!

اتنا عرصہ سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کی جو مستقل تنخواہ ہے اس سے کم آپ کو ملنے کا امکان نہیں چنانچہ آپ کا یہ ارشاد کہ مجوزہ تنخواہ ایڈیٹر "آہنگ" کی تنخواہ سے کم ہے۔ آپ کی معاملہ فہمی پر دلالت نہیں کرتا۔ آپ کا یہ ارشاد کہ آپ وزارت امور کشمیر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں اور اس آسامی کی تنخواہ سات سو پچاس سے شروع ہوتی ہے، آپ کی ہمہ گیر علم کی غمازی نہیں کرتا کیونکہ آپ وزارت امور کشمیر کو الوداع کہہ چکے ہیں اور اس استحقاق سے دستبردار ہو چکے ہیں جو آپ

کا مشاہرہ ہزار پونڈ سالانہ کی شرح سے مقرر کیا ہے، ہرچند کہ باعث خوشنودی ہوا اور ہم بے بضاعت اور کم مایہ لوگوں کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہوا تاہم آپ کی مسلمہ دقت نظری کا شاہد نہیں کیونکہ اس مشاہرے میں بھتہ بھی شامل ہے اور غیر ملکی مصالح بھی کار فرما ہیں۔۔۔"(52)

اس زمانے میں بی بی سی والے برطانوی شہریت دے رہے تھے۔ غلام عباس کو خاصی اچھی تنخواہ مل رہی تھی، لیکن غلام عباس نے یہ نہیں مانا۔ (53) پھر غلام عباس کی ملاقات جی احمد نامی شخص سے ہوئی جو مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات میں ملازم تھا۔ اس ملاقات کے بارے میں غلام عباس نے کہا:

"اس زمانے میں ایک جی احمد صاحب ہوا کرتے تھے۔ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے۔ ایک بار جی احمد صاحب لندن تشریف لائے۔ ان دنوں نے بی بی سی کی اردو میں کل چھ سات آدمی تھے۔ سوائے میرے بی بی سی میں کسی کی نوکری پکی نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں نے بڑی مشکلوں سے بی بی سی میں نوکری حاصل کی تھی۔ جی احمد صاحب نے ہم لوگوں سے کہا اپنا ملک آزاد ہو چکا ہے۔ مجھے آپ لوگوں سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ آپ لوگوں کو انگریزوں کی نوکری کا اتنا شوق ہے کہ آپ یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں آیئے! ہمارے ہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ ہم بڑی خوشی کے ساتھ آپ لوگوں کو قبول کریں گے۔ میں جب چھٹی پر پاکستان آیا تو میں نے سوچا کہ اپنی ملازمت کی تجدید نہیں کرواؤں گا۔ میرا تین سال کا کنٹریکٹ تھا۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ تمہاری نوکری پکی ہے، تم واپس چلے جاؤ۔ ہم وہاں کیا کریں گے ہم بھی نہیں رہیں گے چنانچہ میں پاکستان واپس آ گیا اور وہ وہاں رہ گئے۔"(54)

مرزا ظفر الحسن کے مضمون میں بھی اس دن کا ذکر موجود ہے:

"ان دنوں جی احمد نشریات کے سکرٹری تھے۔ سرکاری کام سے لندن گئے اور بی بی سی کے مسلم اسٹاف کو چائے پر مدعو کیا۔ اسلم ملک، حفیظ جاوید، نور احمد چوہان، صدیقی احمد صدیق، امجد علی اور غلام عباس دعوت میں شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں جی احمد نے شرم دلائی کہ تم لوگ اب بھی انگریز کی نوکری کرنا چاہتے ہو۔ اپنے وطن کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟۔۔۔ پاکستان کیوں نہیں آجاتے۔ اس تقریر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ غلام عباس نے عہد کر لیا کہ وطن واپس ہو جائیں گے۔

عہدنامے کے تین سال ختم ہونے کو آئے تو بی بی سی والوں نے مزید تین سال کی پیشکش کی

مگر غلام عباس نے کہا نہیں، ہم نے رخت سفر باندھ لیا ہے، اب گھر جا رہے ہیں۔ "[55]

اس "جی احمد" کے کہنے کے مطابق غلام عباس نے پاکستان واپس آنے کا پکا فیصلہ کیا۔ لندن میں لی ہوئی کتابوں اور ریکارڈوں کو بیچ کر 2 جولائی 1952ء کو وہ لیور پول سے بحری جہاز کے ذریعے پاکستان کو روانہ ہو گئے۔[56]

کرس کا یہ خیال تھا کہ غلام عباس سے آئندہ ملاقات نہیں ہو سکے گی کیونکہ پاکستان میں ان کی بیگم اور بچے ہیں، لیکن غلام عباس نے کرس سے شادی کا وعدہ کیا۔ کرس نے کہا کہ "پاکستان واپس جانے کے بعد دل بدل سکتا ہے۔ اگر آپ وہاں جا کر اپنے گھر والوں سے بات کر کے پھر بھی مجھ سے شادی کا ارادہ رکھیں تو مجھے بلائیں"۔۔۔ غلام عباس نے کرس کا یہ کہنا مان لیا اور انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ کراچی میں نیا مکان لیا جائے گا۔[57]

کرس کے نام غلام عباس کے دو خطوط محفوظ ہیں۔[58] یہ خطوط 12 جولائی اور 18 جولائی 1952ء کو لکھے گئے اور 12 جولائی والا خط جبرالٹر سے پوسٹ کیا گیا چونکہ اس زمانے میں بحری جہاز سے کراچی پہنچنے میں 21 دن لگتے تھے۔[59] اس لئے شاید غلام عباس 22 یا 23 جولائی 1952ء کو کراچی پہنچے ہوں گے۔ کراچی میں واپس کے بعد غلام عباس کی ملاقات ن۔ م راشد سے ہوئی تھی چنانچہ 27 اکتوبر 1952 کے خط میں راشد نے لکھا:

"کراچی میں کچھ اس افراتفری میں روانہ ہوئے کہ تم سے باقاعدہ رخصت نہ ہو سکے۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ جب ہوائی اڈے کی طرف چلنے لگے تو ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ تمہیں ساتھ لے جانا ہے۔۔۔ ہوائی اڈے پر صرف امین اور دو اور دوست جا سکے۔ تم نے اورینٹ ایرویز کے دفتر کے باہر جو میرا انتظار کیا اور کراچی میں جو دن کا اکثر حصہ ساتھ گھوم پھر کر مدد کی اس کے لئے کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ کئی سالوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی اس قدر مختصر اور اب خدا جانے کتنے سالوں کے بعد پھر ملیں۔"[60]

غلام عباس کا خط حاصل کر کے 2 اکتوبر 1952ء کو کرس اکیلی انگلستان سے روانہ ہو کر 22 اکتوبر کو کراچی پہنچی۔ اس وقت بندرگاہ میں غلام عباس اکیلے کرس کا انتظار کر رہے تھے۔[61] پھر غلام عباس کے ساتھ ان کے نئے مکان پر پہنچی۔ اس وقت کا ذکر کرس نے یوں کیا:

"Dressed in a striped cotton suit. I got out and followed Abbas up a rickety stairway that led to a line of quarters over some garages. In the narrow passage wooden

between the wall of the quaters and balustade of cement grills that rose higher than our heads. I met the family one by one. They were shy but smiling. We could not comminucate but I sensed a guarded goodwill. Abbas' mother. Dadi. touched me on the arm and showed me into my room.

I was standing near the opening. The board door with the hasp lock stood open. She tilted a reed curtain. the children stood back to let me in. Abbas followed. I was pointed out the bed that had turned wooden legs painted in bands of blue. green red. It was covered with a thin cotton mattress. A sheet and pillowcase to match. It was spotlessly clean. The string mat on the floor was also pointed out to me. I smiled appreciation.

Abbas held up a brown cotton suit. shirt and wide pant. Pakistani style. and told me that Zakira had sewn it for me. I said it was beautiful and thanked her.

Abbas sent everyone out to give me some peace. He sat down on the bed beside me and told me that he would sleep in the next room with all the family. So this was how it was to be. I thought to myself. so be it." (62)

اس اقتباس کو پڑھ کریوں معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس کے گھر والے سب کرس کو خوش آمدید کہنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن جس طرح کرس کو احساس ہوا، اسی طرح ذاکرہ کو بھی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت کی ذاکرہ کے بارے میں کرس نے لکھا:

"I found her sincere and gentle. I tried to communicate. she tried to hide her hurt." (63)

پھر تھوڑے دنوں کے بعد غلام عباس اور کرس کا نکاح ہوا۔ نکاح غلام عباس کے ایک دوست

"نقی" کے گھر پر ہوا۔ "نقی" خود "آرٹسٹ" تھے۔[64] صہبا لکھنوی اور انوار احمد نے لکھا کہ غلام عباس کی دوسری شادی لندن میں ہوئی[65] لیکن دراصل یہ شادی کراچی میں ہوئی مگر تاریخ کا صحیح علم نہیں۔

27 اکتوبر 1952ء کے ن۔ م راشد کے خط میں "بچوں کو پیار، اماں جان اور بھائی کو آداب" لکھا ہوا ہے۔[66] اس کے بعد کے جتنے راشد کے خطوط ہیں ان میں لفظ "بھابیوں" مستعمل ہے جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ غلام عباس لندن سے واپس آئے تو وہاں راشد سے ملاقات ہوئی تھی۔ اگر اس وقت شادی ہو چکی ہوتی تو راشد کے اس خط میں بھی "بھابیوں" ہونا چاہئے۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں یعنی ایک تو یہ ہے کہ غلام عباس نے کرس کے بارے میں راشد کو بتایا نہ ہو۔ دوسری یہ ہے کہ اس وقت غلام عباس اور کرس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ بہرحال مولانا احتشام الحق تھانوی کے ہاتھوں کرس نے اسلام قبول کیا اور مولانا نے عقد نکاح کا فریضہ انجام دیا۔[67] چونکہ مولانا احتشام الحق تھانوی ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھے اور درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ ممکن ہے غلام عباس نے ان سے رابطہ قائم کرنے میں آسانی سمجھی ہو۔ پھر کرس کا نام "کرس سے زینب عباس" میں بدل گیا۔ زینب عباس نے بھی کئی تصانیف اور ترجمے لکھے اور اس نے اپنا نام یہی "کرس زینب عباس" رکھا۔ اسلامی نام قبول کرتے وقت غلام عباس نے کہا کہ پہلی بیوی کا نام بھی حرف "زیڈ" سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے "زینب" مناسب ہے۔ "زینب" کا نام بعد کے غلام عباس کے افسانے میں کردار کے نام کے طور پر نظر آتا ہے۔

افسانہ "آنندی" کی کامیابی اور شہرت کی فضا میں 1947ء سے 1952ء کے دوران غلام عباس نے تخلیق سے زیادہ عملی زندگی کی مصروفیات میں وقت صرف کیا لیکن ان مصروفیات میں جو واقعات ان کے سامنے پیش آئے وہ بعد کے افسانوں کا پس منظر نظر آنے لگے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ دور بھی تجربات کے حوالے سے قابل توجہ تھا۔ اس کے بعد غلام عباس کو اقتصادی مسئلہ پیش آتا ہے اور یہ مسئلہ ان کی تخلیق پر بھی اثر انداز ہونے لگا مگر اس کے ساتھ اس آنے والے دور میں غلام عباس نے متعدد اچھے افسانے لکھے۔ یہ 1953ء کے بعد کا واقعہ ہے۔

حواشی

(1) مرزا ظفر الحسن "غلام عباس، رسالہ "غالب (1)" کراچی 1995ء ص 145

(2) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن ص 321

(3) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 28۔ یہ رسالہ پہلے پندرہ روزہ تھا جو اب ماہنامہ بن چکا ہے۔

(4) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس' رسالہ "غالب (ا)" کراچی 1975ء

(5) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ) س ن

(6) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 3 فروری

(7) غلام عباس "آنندی" مکتبہ جدید لاہور، اپریل 1948ء اس مجموعے کی قیمت چار روپے کی تھی۔ یہ پہلا ایڈیشن مدت سے دستیاب نہیں تھا مگر سنگ میل پبلی کیشنز کے اعجاز احمد صاحب اور افضال احمد صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا۔ ان دونوں نے یہ قیمتی نسخہ مجھے برائے مطالعہ عنایت فرمایا۔ یہ پہلا ایڈیشن Hard Cover والا ہے۔

(8) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی، اکتوبر 1981ء ص 28

(9) غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ) س ن۔ یہ ملازمت 1949ء میں ملی۔ یہاں غلام عباس کے شخصی تعارف نامہ کے مطابق 1948ء دیا گیا۔

(10) خواجہ احمد عباس 'A Sdid Tale of Two Cities' اخبار "Blitz" (انگریزی) 29 مئی 1948ء

(11) 'آنندی پر تبصرہ' رسالہ "نگار" نومبر 1948ء ص 56

(12) احتشام حسین 'آنندی پر تبصرہ (برائے آل انڈیا ریڈیو)' یہ 23 دسمبر 1948ء کو نشر کیا گیا۔ اس مسودے کے 32 لائن پر مشتمل 2 صفحات دستیاب ہیں۔ (مشفق خواجہ صاحب کے پاس ہیں۔)

(13) ایم ڈی تاثیر (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) 'Anandi' (انگریزی) اخبار "The Pakistan Times" 20 فروری 1949ء

(14) ایس ایم عمر فاروق "آنندی اور خم کاکل پر ریویو" اپریل 1949ء کی کسی صبح 7:45 پر نشر کیا گیا۔

(15) انتظار حسین 'تین افسانہ نگار (غلام عباس، احمد علی، ممتاز مفتی)' رسالہ "ماہ نو" کراچی، جنوری 1950ء ص 22 تا 26

(16) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 28

(17) پطرس بخاری "غلام عباس کا نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 2 مارچ 1948ء

(18) محمد حسن عسکری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 30 اکتوبر 1948ء

(19) محمد حسن عسکری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 30 اکتوبر 1945ء

(20) سعادت حسن منٹو "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 3 نومبر 1948ء

(21) سجاد باقر رضوی 'غلام عباس' "باتیں" لاہور 1990ء ص 41

(22) غلام عباس 'غلام عباس سے چینل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 110

(23) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" لاہور 1991ء ص 110

(24) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 2 مارچ 1948ء

(25) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 246 تا 250

(26) عبدالرحمٰن چغتائی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 7 نومبر 1949ء

(27) زینب عباس ایضاً ص 259۔ یہاں زینب عباس نے لکھا کہ جب غلام عباس کی عمر 45 سال ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا چونکہ زینب عباس نے غلام عباس کا سنہ پیدائش 1907ء قرار دے کر لکھا ہے۔ اس لئے ان کی عمر 45 سال لکھی گئی۔

(28) زینب عباس ایضاً ص 259
(29) زینب عباس، ایضاً ص 260
(30) غلام عباس "مختصر تعارف نامہ" (غیر مطبوعہ) س ن
(31) "انٹرویو"، "ملاقات" (از انتظار حسین) اخبار روزنامہ "مشرق" لاہور 17 مارچ 1978ء ادبی صفحہ
(32) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (ا)" کراچی، اپریل 1975ء ص 138
(33) سعید مرتضیٰ زیدی 'غلام عباس'، "تنقید ادب" لاہور 1983ء ص 268
(34) زینب عباس انٹرویو (ملاقات سویامانے) کراچی 30 نومبر 1990ء
(35) زینب عباس ایضاً ص 259
(36) زینب عباس ایضاً ص 262
(37) غلام عباس 'نوٹ' (غیر مطبوعہ) یہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔
(38) زینب عباس ایضاً ص 257
(39) زینب عباس، ایضاً ص 261
(40) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 261
(41) غلام عباس 'چند خطوط'، (غیر مطبوعہ مسودہ) 25 اکتوبر 1950ء
(42) غلام عباس 'چند خطوط'، رسالہ "ماہ نو" کراچی اپریل 1955ء ص 33 تا 35
(43) ممتاز شیریں "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 7 جنوری 1951ء
(44) غلام عباس 'سرخ جلوس'، رسالہ "نیا دور" شمارہ نمبر 1'2 کراچی، ص 87 تا 94
(45) غلام عباس 'کنارہ'، رسالہ "نیا دور" شمارہ 3'4 کراچی، ص 175 تا 166
(46) غلام عباس "مکروی بابو کی ڈائری" (غیر مطبوعہ) س ن ص 16
(47) غلام عباس "ایک دردمند دل" (غیر مطبوعہ) س ن ص 15
(48) زینب عباس ایضاً ص 272 تا 278
(49) زینب عباس، ایضاً ص 279 تا 280
(50) زینب عباس، ایضاً ص 281 تا 282
(51) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 8 مئی 1952ء
(52) زیڈ اے بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 5 ستمبر 1950ء
(53) غلام عباس 'غلام عباس سے چینل انٹرویو'، "غلام عباس ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 110
(54) غلام عباس ایضاً ص 110
(55) مرزا ظفر الحسن ایضاً ص 144
(56) زینب عباس ایضاً ص 285
(57) زینب عباس، ایضاً 287
(58) غلام عباس کے یہ دونوں خطوط مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔
(59) زینب عباس، ایضاً ص 297
(60) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 27 اکتوبر 1952ء
(61) زنیب عباس، ایضاً ص 330
(62) زینب عباس ایضاً ص 301 تا 302

(63) زینب عباس ایضاً ص 306

(64) زینب عباس ایضاً ص 304۔ زینب عباس نے ان کا نام صرف "نقی" لکھا ہے۔ اس لئے معلوم نہیں کہ یہ کون تھے اور کس میدان کے آرٹسٹ تھے۔

(65) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی، اکتوبر 1981ء ص 28، انوار احمد 'غلام عباس' "اردو افسانہ، تحقیق و تنقید" ملتان 1988ء ص 255

(66) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 27 اکتوبر 1952ء

(67) صہبا لکھنوی ایضاً ص 28

2-3-1 افسانہ نگاری کا دوسرا دور (1953ء تا 1961ء)

"بی بی سی میں جو پاکستانی یا ہندوستانی نوکر ہوتے ہیں، ان میں بیشتر کو وطن واپس آ کر تکلیف ہوئی ہے اور کافی عرصے تک کہیں ان کے پاؤں جمنے نہیں پاتے اور وہ ڈانواں ڈول رہتے ہیں۔ واپس تو ایک دن آنا ہی ہوگا، اس امر کا خیال ضرور رکھ لیجئے کہ واپسی پر کیا صورت ہوگی۔۔۔"(1)

"میرا خیال تھا کہ یہاں (کراچی) آنے کے بعد مجھے رہنے کے لئے مکان ملے گا۔ میرے دوست اور احباب بہت خوش ہوں گے۔ میں لوگوں سے ملا، مجھ سے باری صاحب، چیف انجینئر اور دوسرے لوگوں نے کہا کیوں آ گئے تم، یہاں کیا کرو گے؟ مجھ سے پوچھا گیا کہ "تم رہو گے کہاں؟" میں نے کہا میری جگہ جو ایڈیٹر ہے، اسے مکان و کان ملا ہو گا؟ کہنے لگے وہ تو اپنے بھائی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہاں میں تیسری منزل پر رہتا تھا۔ نیچے ٹرامیں چلتی تھیں۔ ہوٹل والے ہمیں چائے تک پکانے کی اجازت نہیں دیتے تھے چنانچہ روز پچاس ساٹھ روپے کھانے پینے اور کرائے میں صرف ہو جاتے تھے۔ میں لندن سے جو تھوڑی بہت پونجی بچا کر لایا تھا، وہ سب خرچ ہو گئی۔ میں بڑا پریشان ہوا۔"(2)

غلام عباس لندن سے بخوشی پاکستان واپس آ گئے مگر کراچی پہنچتے ہی ان کو اقتصادی مسئلہ کا سامنا ۔ ان کو ریڈیو پاکستان میں ملازمت تو مل چکی تھی مگر ان کے پاس پیسہ نہیں تھا بلکہ رہنے کی جگہ بھی ں تھی۔ سب سے پہلے رہائش کا مسئلہ تھا۔ غلام عباس نے کہا:

"اس زمانے میں پی ای سی ایچ سوسائٹی نئی نئی بنی تھی۔ کسی نے مجھ پر بڑی مہربانی کی اور کہا کہ زمین کی الاٹمنٹ کے لئے اگرچہ تاریخ گزر چکی ہے، بہرحال تم درخواست داخل کر دو اور لکھو کہ میں ڈیپوٹیشن میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا، اس لئے مجھے زمین الاٹ کی جائے۔ غرض یہ کہ جناب بڑی مشکلوں سے مجھے چھ سو گز کا ایک قطعہ اراضی مل گیا۔ پیسے پاس نہیں تھے، جتنے پیسے لائے تھے وہ تحائف اور دیگر مدوں میں خرچ ہو گئے۔ پھر بھی میں نے

زمین کی 18 سو روپے کی قسط ادا کر دی اور دو تین سو روپے بچ گئے۔ زمین بھی لے لی اور سوسائٹی کا ممبر بھی بن گیا۔ پھر کسی نے کہا کہ حکومت اٹھارہ ماہ کی تنخواہ کے برابر قرضے دیتی ہے، چنانچہ میں نے قرض لے کر فوراً مکان کی تعمیر شروع کر دی۔ اس لئے کہ رہنے کے لئے میرے پاس کوئی جگہ نہیں تھی۔

اس زمانے میں یہاں 'مسز فلان' کا ایک میس ہوا کرتا تھا۔ وہاں صرف چار ماہ کے لئے قیام کی اجازت ملی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ صرف چار ماہ کے لئے ہے، اگر اس کے بعد کمرہ خالی نہیں کیا گیا تو تمہارا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا اور تمہیں زبردستی نکال دیا جائے گا چنانچہ میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ مجھے دو قسطوں میں قرض ملا اور میں نے مکان بنا ڈالا، لیکن ساتھ ہی ساتھ تمام پیسے ختم ہو گئے۔ میں نے سوائے بچوں کے اپنی ہر چیز بیچ ڈالی۔"[3]

نہ صرف رہائش بلکہ بچوں کے سکول کے لئے بھی پیسہ نہیں تھا[4] مگر یہ معلوم نہیں کہ ذاکرہ اور ان کے بچے غلام عباس کے قیام لندن کے دوران کہاں رہتے تھے۔ زینب عباس نے لکھا کہ ان کے بچے پہلے لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن جب غلام عباس لندن سے کراچی آئے تو وہ سب کراچی بلائے گئے۔[5] اس لئے ممکن ہے کہ ذاکرہ عباس اور ان کے بچے پہلے لاہور میں ہوں۔ اس لئے غلام عباس کو کراچی میں کوئی رہنے کی جگہ نہیں ملی۔ دوسرا یہ بات بھی ممکن ہے کہ ذاکرہ اور بچے کراچی میں تھے، لیکن غلام عباس نے کرس سے لندن میں وعدہ کیا تھا کہ نیا مکان لیا جائے گا۔ اس وعدے کے مطابق مناسب مکان ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اس سلسلے میں غلام عباس کے نام ڈاکٹر تاثیر کا ایک خط موجود ہے۔ اس میں تاثیر نے لکھا:

"تمہارے گھر والوں (ذاکرہ اور بچے) نے مجھے بے خبر رکھا لیکن میں نے نذیر احمد (ڈاکٹر) کو آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ان سب کو اپنے پاس لے آیا ہے۔ آج زمانے کی رفتار کچھ عجب ہے۔ لوگ سخت بد لحاظ ہو گئے ہیں، کہتے ہیں عبوری دور ہے! ہو گا ہم پر تو یہ دور نہیں آیا۔"[6]

اس زمانے میں ڈاکٹر نذیر احمد لاہور میں مقیم تھے۔ اس لئے یہ درست معلوم ہوتا کہ ذاکرہ اور بچے لاہور میں رہے ہوں اور غلام عباس کی واپسی کے بعد کراچی آئے۔ شاید اس واقعے کی وجہ ہے کہ 1977ء میں جب غلام عباس کا بیٹا کامران لاہور آئے تو کامران، ڈاکٹر نذیر احمد کے پاس ٹھہرے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا:

"۔۔۔ کامران لاہور آئے تو میرے پاس ہی ٹھہرے۔ میں اسے یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں اور دوسرے سیاسی نظریات رکھنے والوں سے ملاؤں گا۔"[7]

بہر حال لندن سے واپسی پر غلام عباس کو اقتصادی مسئلے کے باعث شدید پریشانی تھی۔
اس اقتصادی مسئلے سے بڑھ کر 25 مارچ 1953ء کو زینب عباس کی پہلی بیٹی مریم پیدا ہوئی۔ پھر 13 نومبر 1954 کو زینب عباس کا بیٹا کامران اور 17 نومبر 1956ء یعنی غلام عباس کی سالگرہ کو زینب عباس کی دوسری بیٹی نیلوفر پیدا ہوئی۔ اسی سال 9 دسمبر کو ذاکرہ عباس کی تیسری بیٹی تسنیم بھی پیدا ہوئی اور 6 اکتوبر 1959ء کو زینب عباس کی تیسری بیٹی کوثر پیدا ہوئی۔ ان بچوں کی پرورش غلام عباس کی والدہ کرتی تھیں۔

زینب عباس نے گھریلو مسائل کو حل کرنے کے لئے 25 جولائی 1954ء سے کراچی کے سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ اس کو ماہانہ 200 روپے ملتے تھے مگر 6 ماہ کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی۔ البتہ بعض دوسرے سکولوں میں پڑھاتی رہی۔ (8)

لندن سے واپسی کے بعد غلام عباس نے سب سے پہلے ایک ناولٹ لکھا۔ اس کا عنوان "گوندنی والا تکیہ" تھا۔ یہ رسالہ "ماہ نو" میں بارہ اقساط میں چھپتا رہا۔ یعنی فروری 1953ء سے لے کر جنوری 1954ء تک کے دوران یہ ناولٹ شائع ہوا۔ اس وقت "ماہ نو" کے نگران ایڈیٹر عزیز احمد تھے اور مدیر رفیق خاور تھے۔ یہ ناولٹ جب 1982ء میں کتابی صورت میں چھپا تو اس کا سبب تصنیف انہوں نے یوں بتایا:

"1952ء میں جب میں لندن سے کراچی پہنچا تو ان دنوں میرے مرحوم دوست عزیز احمد محکمہ اطلاعات و نشریات کے ڈائریکٹر تھے۔ علاوہ اپنے اور فرائض کے ماہنامہ "ماہ نو" شائع کرنا بھی ان کے ذمے تھا۔ وہ اکثر مجھ سے افسانے کی فرمائش کرتے۔ میں وعدہ کر لیتا مگر پورا نہ کر پاتا۔ آخر ایک دن میں نے سوچا کہ گوندنی والے تکیے پر طویل ناول جیسا کہ میں چاہتا ہوں کبھی لکھ نہیں پاؤں گا۔ البتہ اس موضوع پر ایک چھوٹا سا ناول یا ایک طویل مختصر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ اپنے محترم دوست مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے ہفتہ وار اخبار "شیرازہ" کے لئے میں "جزیرہ سخنوراں" کے نام سے ایک مختصر ناول آٹھ دس قسطوں میں کامیابی کے ساتھ پہنچا چکا تھا اس لئے ایک ماہنامے کے لئے ایسا سلسلہ دوبارہ شروع کرنا مشکل نہ ہو گا چنانچہ میں نے "گوندنی والا تکیہ" بارہ قسطوں میں "ماہ نو" کے لئے لکھنے کی حامی بھر لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرتبہ بھی مجھے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑی۔" (9)

لیکن غلام عباس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ یہ ناولٹ پیسوں کے لئے لکھا گیا۔ انہوں نے یوں کہا:
"--- "گوندنی والا تکیہ" میرا ناول ہے جو "ماہ نو" میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ یہ ناول بڑی مجبوری کے عالم میں لکھا گیا۔ میں نے پیسے کی خاطر کبھی نہیں لکھا لیکن میں جب لندن سے

پاکستان واپس آیا تو ایسی مجبوری آن پڑی کہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مجھے پیسے کی خاطر لکھنا پڑا۔ اس وقت عزیز احمد "ماہ نو" کے نگران ایڈیٹر تھے، میرے دوست تھے۔ میں نے ان سے یہ نہیں کہا کہ ضرورت مند ہوں۔ انہوں نے خود کہا کہ تم لندن سے واپس آگئے ہو، میں "ماہ نو" کا نگران ہوں، تم اس کے لئے کہانیاں لکھو، میں نے کہا کتنا لکھوں۔ انہوں نے کہا ہر مہینے ایک کہانی لکھو۔ اس زمانے میں مصنفوں کو پچیس تیس روپے معاوضہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں ہر کہانی کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ سو روپے دوں گا۔ میں نے سوچا کہ ہر ماہ کہانیاں لکھنا تو بہت مشکل ہے، کوئی ایسا سلسلہ شروع کیا جائے جو بارہ مہینے چلتا رہے تو صاحب "گوندنی والا تکیہ" یوں وجود میں آیا۔ جو پیسہ ملتا تھا میں مکان میں لگا دیتا تھا۔ اس زمانے میں مکان بنانا بہت آسان تھا۔ ساڑھے تین سو روپے فی ٹن لوہا ملتا تھا۔ پونے چار روپے میں سیمنٹ کی بوری ملتی تھی اور مزدور کی دہاڑی دو روپیہ اور مستری کی مزدوری تین روپے یومیہ تھی۔"(10)

جب غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" لکھنے لگے تو اس کے بارے میں اپنے دوست پطرس بخاری کو ایک خط لکھا۔ غلام عباس کے خط کے جواب میں پطرس بخاری نے لکھا:

"--- آپ کا 25 فروری کا خط آج ملا۔ یاد آوری اور مستعدی کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ "ماہ نو" یاد نہیں کہ کبھی نظر سے گزرا ہو بہرحال میں پوچھوں گا۔ اگر یہاں آتا ہے تو آپ کا ناول شوق سے پڑھوں گا۔ آپ نے اس کا جو خاکہ مجھے کراچی میں بتایا تھا وہ تو از حد اشتہا انگیز تھا۔ خدا آپ کو ہر طرح کامران کرے۔ قسط بازی طبیعت پر بوجھ تو ہو گی لیکن تاریخ ادب میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ بعض پائے کے ناول اسی طرح لکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے تخلیق ابل رہی ہو تو اقساط کے جبر سے نہیں دبتی بلکہ یہ جبر شاید آپ کے لئے مفید ہی ثابت ہو۔ بہرحال بحران آپ پر ضرور طاری رہتا ہو گا۔"(11)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس نے پطرس کے نام خط میں لکھا ہو گا کہ قسط بازی بوجھ سی ہے۔ بہرحال اس طرح غلام عباس نے یہ ناولٹ لکھنا شروع کیا۔ "گوندنی والا تکیہ" ایک عشقیہ کہانی ہے۔ اس کو غلام عباس نے طویل مختصر افسانہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا:

"Look, I have completed this, he (Ghulam Abbas) shows me a black file-cover inside are clipped a hundred or so pages filled with his handwriting. This is which "Gondni Wala Takya." I will not call it novel. I think it's

a long short story---" (12)

اس ناولٹ میں غلام عباس کے بچپن کا ماحول پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس میں چند پنجابی اشعار شامل ہیں۔ ان کے دوست حفیظ ہوشیار پوری نے لکھے۔ اس لئے اس ناولٹ کا پس منظر غلام عباس کے بچپن کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ناولٹ لکھنے کا خیال بھی بچپن میں آیا تھا۔ اس نے لکھا:

"ان ہی دنوں میں نے دو تین بڑے روسی ناول پڑھے تھے۔ خیال ہوا کہ ان کی پیروی میں، میں بھی اس موضوع پر کوئی طویل ناول لکھوں مگر افسوس کہ میری مسلسل ملازمت نے مجھے کبھی اس کا موقع ہی نہ دیا۔ لاہور میں بھی نہیں اور اپنے دس سالہ دلی کے قیام میں بھی نہیں۔ یہاں تک کہ تین برس لندن میں بھی رہ آیا مگر اس خیال کی تکمیل نہ ہو سکی۔" (13)

یعنی موضوع اور پس منظر دونوں کے اعتبار سے یہ ناولٹ غلام عباس کے بچپن کی یادگار ہے۔ "یادگار" ہونے کے باوجود انہیں یہ کہانی پسند نہیں تھی۔ ان کا کہنا ہے:

"میں نے ناول کا خاکہ سا ذہن میں بنا لیا تھا کہ اس طرح یہ چلے گا، بس یوں چلتا رہا۔ بعض دفعہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے جس عورت کا ذکر کیا ہے وہ خاکستری برقعہ پہنے ہوئے تھی یا سیاہ برقعہ--- ذہن میں صرف ایک خاکہ تھا۔ وہ ناول کافی پسند کیا گیا لیکن مجھے پسند نہیں آیا۔ اسی وجہ سے میں نے اسے نہیں چھپوایا۔" (14)

"گوندنی والا تکیہ" پسند نہ آنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ پیسوں کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس لئے چھپوانے میں عباس کو جھجک محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال یہ ناولٹ 1982ء میں تھوڑے سے ردوبدل کے بعد چھپوایا گیا۔ اس کتاب کا دیباچہ ان کے انتقال سے تقریباً تین ماہ پہلے یعنی 27 جولائی 1982ء کو لکھا گیا۔

لیکن دراصل "گوندنی والا تکیہ" غلام عباس کی اجازت کے بغیر 1954ء میں دلی سے شائع کر دیا گیا تھا۔ غلام عباس نے "گوندنی والا تکیہ" کے دیباچے میں لکھا:

"اب سنئے کہ جیسے ہی جنوری 1954ء کے "ماہ نو" میں ناول کی بارہویں قسط شائع ہوئی۔ دلی میں میرے ایک "قدردان" نے جھپاک سے اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اس پر ستم ظریفی یہ کی کہ خود ہی کتاب کا نام بدل کر "جب محبت روتی ہے" رکھ لیا اور اس کا انتساب گوندنی والے تکئے کے نام کر دیا۔ نہ کوئی خط لکھا، نہ اجازت مانگی، نہ کوئی جلد بھیجی۔ کہتے ہیں خودکشی کے محرک عموماً ایسے ہی واقعات ہوا کرتے ہیں۔" (15)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس اس اشاعت کے بارے میں کتنے ناراض تھے۔ انہوں

نے ایک دوسرے موقع پر یوں کہا:

"کسی نے اسے دلی میں چھاپ دیا اور اس کا نام بدل دیا--- بہت ہی فضول سا نام رکھا۔ آپ کو بڑی ہنسی آئے گی۔ پہلے تو ناشر نے یہ کیا کہ میرا مقابلہ پریم چند سے کیا بلکہ مجھے پریم چند سے برتر ظاہر کیا۔ ایک طرح سے ناشر نے مجھے بڑا کیا۔ یہ نام سنئے گا تو آپ خود اندازہ کریں گے۔ ناشر نے اس کا نام رکھا "محبت روتی ہے" --- جناب میں جب 1953ء میں بارہویں قسط مکمل کی تو 1953ء ہی میں یہ کتاب بھی شائع ہو گئی--- لطف یہ کہ ناشر نے اسے "گوندنی والا تکیہ" کے نام سے معنون کیا۔ اس میں میری لمبی چوڑی تعریفیں شائع کیں۔" (16)

دلی سے شائع ہونے والا "گوندنی والا تکیہ" ڈاکٹر نیر مسعود کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا عنوان "محبت روتی ہے" رکھا گیا۔ غلام عباس نے اسے 1982ء کی اشاعت قرار دیا ہے اور عنوان "جب محبت روتی ہے" بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ "محبت روتی ہے" جولائی 1954ء میں شائع ہوا۔ شہزاد منظر کے انٹرویو میں چھپا ہے کہ "ماہ نو" میں بارہویں قسط 1953ء میں شائع ہوئی اور اسی سال میں یہ ناولٹ دلی میں چھپا مگر یہ سنہ 1954ء ہونا چاہئے۔ "محبت روتی ہے" میں غلام عباس کی ایسی لمبی چوڑی تعریفیں نظر نہیں آتیں جس طرح غلام عباس نے انٹرویو میں بتایا مگر اس میں فراق گورکھپوری کے مندرجہ ذیل اشعار شامل ہیں:

شام بھی تھی دھواں دھواں\
حسن بھی تھا اداس اداس\
دل کو کئی کہانیاں\
یاد سی آ کے رہ گئیں

(فراق) (17)

لطف یہ ہے کہ اس کے دوسرے صفحے پر "جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں" لکھا گیا ہے۔ اس اشاعت خانے کا نام "پبلشرز ادبی مرکز" ہے اور اس کتاب کا انتساب یوں چھپا ہے:

"بارگاہ محبت\
گوندنی والے تکئے\
کے نام" (18)

پیسوں کی ضرورت کے لئے لکھا جانے والا یہ ناولٹ جس کو خود غلام عباس نے پسند نہیں کیا بہت مقبول ہوا۔ غلام عباس کے بقول:

"یہ ناول کسی طرح حمید کاشمیری کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے کہا صاحب یہ تو بڑا اچھا ناول ہے۔ ہم اسے ٹیلی ویژن کا ڈراما بنائیں گے چنانچہ انہوں نے اسے ٹیلی یوژن پلے کا روپ دے دیا اور وہ کراچی سے ہی "گوندنی والا تکیہ" کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوا اور بہت کامیاب ہوا۔ یہ ڈرامہ میری اجازت سے پیش کیا گیا اور مجھے اس کا معاوضہ بھی ملا۔"[19]

"گوندنی والا تکیہ" مقبولیت حاصل ہونے کے بعد بھی غلام عباس کی سوچ کا موضوع رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کو دوبارہ لکھا جائے۔ عباس نے ایک انٹرویو میں کہا:

"میرا ارادہ ہے کہ میں اسے کسی نہ کسی طرح سنوارنے کی کوشش کروں گا از سر نو لکھوں گا اور اس میں جو خامیاں رہ گئی ہیں، انہیں دور کروں گا۔ لکھنے کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا جو موضوع ہے وہ بہت خطرناک ہے اور "ماہ نو" سرکاری پرچہ ہے، مجھے بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ لکھنا پڑے گا۔ اس میں کسی قسم کی تیزی نہیں ہونی چاہئے جس کی وجہ سے میں کچھ کر ہی نہ سکا حالانکہ وہ عجیب و غریب کہانی تھی۔ وہ یہ کہ ایک بازاری عورت جس پر بڑھاپا طاری ہے لیکن پورے طور پر بوڑھی بھی نہیں ہوئی ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ کسی لڑکی کو بیٹی بنانا چاہتی ہے تاکہ اپنے کاروبار کو آگے بڑھائے اور پنجابی کا ایک بے وقوف شاعر اس کے عاشقوں میں سے ہے، وہ اس سے کہتی رہتی ہے تو مجھے کب اپنے گاؤں لے چلے گا اور لڑکی کب لے کر دے گا۔ یہ سارا قصہ چلتا رہتا ہے۔ کہانی کافی گرما گرم ہے، لیکن اس میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں اس لئے کہ میں جن پہلوؤں پر زور دینا چاہتا تھا جو کشمکش دکھانا چاہتا تھا وہ میں نہیں دکھا سکا۔ اصل میں ناول کی قسط ایک رات میں لکھا کرتا تھا۔ آخری رات کو جب مجھے قسط پیش کرنا ہوتی تھی۔ اس کے بعد مجھے بہت سے لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو قسط وار ناول لکھ دو، میں نے کہا نہیں بھائی وہ تو ایک مجبوری تھی۔"[20]

پھر غلام عباس کی اس خواہش کے مطابق "گوندنی والا تکیہ" تھوڑے سے ردوبدل کے بعد 1982ء میں شائع ہوا۔ یہ ناولٹ بعد میں "ماہ نو" کے خصوصی ایڈیشن میں بھی شامل کیا گیا۔

غلام عباس نے کہا کہ صرف "گوندنی والا تکیہ" پیسوں کے لئے لکھا گیا۔ پھر اس کے بعد یعنی 1954ء کے بعد غلام عباس بھرپور انداز سے متعدد افسانے لکھنے لگے۔ جنوری 1954ء کے "ماہ نو" میں "پتلی بائی"[21] اپریل کے ماہ نو میں "ایک دردمند دل"[22] ستمبر میں "صغریٰ و کبریٰ"[23] اکتوبر میں "چھپا"[24] اپریل 1955ء میں "چند خطوط"[25] مارچ 1956ء میں "آپ بیتی"[26] نومبر میں "زہریلی مکھی"[27] جنوری 1957ء میں "جیب کترا"[28] نامی افسانہ اور "حاضرات"[29] نامی ڈرامہ اور

مارچ کے "ماہ نو" میں "باسے والا" شائع کرایا۔ [30]

علاوہ ازیں 1957ء میں رسالہ "ہمایوں" کے ایڈیٹر بشیر احمد نے غلام عباس کو ایک خط لکھا اور ہمایوں کے لئے افسانہ بھجوانے کی درخواست کی۔ بشیر احمد نے لکھا:

"میں نے اپنے علمی و ادبی رسالہ "ہمایوں" کو 35 سال ہر ماہ باقاعدگی سے شائع کرنے کے بعد جنوری 1957ء میں بند کر دیا۔ اس کے بعد چند احباب کے اصرار پر اور اپنی خواہش کے مطابق ارادہ کیا کہ کم از کم اس کا سالنامہ شائع ہوا کرے چنانچہ جنوری 1958ء میں "ہمایوں" کا سالنامہ شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ کچھ مضامین آ چکے ہیں کچھ کی توقع ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہوگی اور "ہمایوں" کے لئے باعث فخر ہوگا اگر آپ براہ کرم اس خاص نمبر کے لئے ایک افسانہ لکھیں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ سید امتیاز علی تاج صاحب نے شاید اس کے بارے میں آپ کو لکھا بھی ہو۔ جواب سے جلد سرفراز فرمایئے۔" [31]

یہ معلوم نہیں کہ اس سالنامہ کے لئے غلام عباس نے افسانہ لکھ کر بھیجا تھا یا نہیں۔ اسی طرح پطرس بخاری نے غلام عباس کو خط میں لکھا کہ آپ کے دو افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اس لئے پطرس نے انہیں دو افسانے انتخاب کرنے کو کہا۔ [32] پھر 1958ء میں پطرس نے خط میں لکھا:

"کیا آپ اپنی کہانی "کتبہ" بھجوا سکتے ہیں۔ میرے پاس تھی لیکن کہیں کھو گئی۔ اب صرف ترجمہ (انگریزی) موجود ہے۔ وہ بھی نظر ثانی کا محتاج اسے صاف کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ اصل ندارد ہے۔" [33]

اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس کے ان دو افسانوں میں سے ایک "کتبہ" تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ کب طبع ہوا، کیونکہ یہی سال 5 دسمبر 1958ء کو پطرس بخاری کا انتقال ہوا تھا۔ بہر حال اس طرح تخلیق کا سلسلہ اس زمانے میں جاری رہا۔ "پتلی بائی" غلام عباس کے بچپن کی یادگار ہے۔ انہوں نے لکھا:

"پتلی بائی ایک ایکٹرس تھی، جس کی آواز میں لاہور کے ایک تھیٹر میں ہر روز سنا کرتا تھا۔ میں نے اس ایکٹرس کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کی آواز مجھے اکثر سرمست کر دیا کرتی تھی۔" [34]

"ایک دردمند دل" کے پس منظر کے بارے میں دوسرے دور میں ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہانی غلام عباس کے قیام لندن کو پس منظر کے طور پر پیش کرتی ہے۔ "صغریٰ و کبریٰ" بعد میں "تنکے کا

سہارا" کے عنوان سے مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" میں شامل کیا گیا۔ "چمپا" ایک ڈرامہ ہے اور "چند خطوط" 1950ء میں لندن میں لکھا گیا تھا۔

یوں ہمیں اس دور کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ لندن واپسی کے بعد غلام عباس نے کس توجہ سے تخلیق کی۔ پہلے ناولٹ لکھا اور اس کے بعد افسانے اور ڈرامے بھی تخلیق کئے۔ گویا 1939ء سے لے کر 1947ء تک کے دور کی طرح تخلیق میں مصروف رہے۔

لیکن اس دور کا ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ غلام عباس کی ادبی خدمت صرف افسانہ، ڈرامہ اور ناولٹ تک محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے چند تنقیدی مضامین بھی لکھ ڈالے۔ جون 1955ء کے "ماہ نو" میں "اردو کا ایک غیر معروف ناول، افناد جوانی" پر ایک تعارفی اور تنقیدی مضمون پیش کیا۔ [35] اسی طرح اکتوبر میں بھی "اردو کے غیر معروف ناول، جنون انتظار" یعنی فسانہ مرزا رسوا کے عنوان سے مضمون چھپوایا۔ [36] 1956ء کے قریب انہوں نے "انگریزی کے تین بڑے شاعر" (ملٹن، جان، ڈرائیڈن، الگزینڈر پوپ) نامی مسودہ لکھا تھا۔ [37] پھر جون 1961ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری نامی مضمون رسالہ "اردو نامہ" میں پیش کیا [38] اور اس سال کے رسالہ "ہم قلم" میں "افسانہ میری نظر میں" کے عنوان سے افسانہ نگاری پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ مضمون غلام عباس کی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لئے ہمیں کافی مدد دیتا ہے۔ اس لئے یہاں اس مضمون سے جان بوجھ کر لمبا اقتباس پیش کیا جاتا ہے کہ غلام عباس نے لکھا:

"میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں۔ جس کے لئے کم سے کم علمیت کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں جو شخص بھی خط لکھ سکتا ہو کہ ذرا سی کاوش سے ایک کامیاب افسانہ نگار بن سکتا ہے۔۔۔ جسے (مشاہدہ کو) میں افسانہ نگاری کے لئے سب سے ضروری سمجھتا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہی وہ امر ہے جسے افسانہ نویس عام طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ فلسفیانہ نکتے بیان کرتے ہیں۔ ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش دکھلاتے ہیں، لیکن یہ باتیں یا تو انہوں نے کتابوں میں پڑھی ہوتی ہیں یا وہ سنی سنائی ہوتی ہیں۔ ان کے اپنے مشاہدے کو اس میں دخل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ایسے افسانے اثر سے خالی رہتے ہیں۔ اکثر اوقات نیچے یا درمیانہ طبقہ کے لوگ اونچے طبقے کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ ڈرائنگ روم، برتھ ڈے پارٹیز، ناچ گھر، کلب ہوٹل، ہوائی جہاز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں امیر زادے اور امیر زادیاں غریب کے جھونپڑے، مٹی کے دیئے، راکھ بھرے چولہے، غربت، بیماری اور محنت مشقت کی زندگی پر اپنے افسانوں میں آنسو بہاتی

ہیں، نتیجہ ظاہر ہے۔
اسی طرح افسانہ نویس اگر عورت ہے تو مرد کے اور مرد ہے تو عورت کے ان رازوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جو دل کی عمیق گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں اور جن کا اکثر صاحب راز کو بھی علم نہیں ہوتا۔ حسد، رقابت، احساس گناہ، ارتکاب جرم، پشیمانی یہ ایسے انسانی جذبات ہیں کہ جب تک خود اپنے پر وارد نہ ہوں ان کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکتی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قاتل کی کردار نگاری کے لئے مصنف کو خود قتل کا مرتکب ہونا پڑے۔ تجربہ، مشاہدہ اور انسانوں کا مطالعہ رفتہ رفتہ افسانہ نویس میں یہ استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود کو ہر قسم کے حالات میں فرض کر کے اپنے پر ہر قسم کی واردات گزرتی ہوئی محسوس کرنے لگے۔

جہاں تک میری اپنی افسانہ نویسی کا تعلق ہے، میں خام مواد بڑی حد تک زندگی ہی سے لیتا ہوں۔ کہانی لکھنے کے لئے سب سے پہلے مجھے ایک کردار کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ کردار سچ مچ کا یعنی گوشت اور پوست کا بنا ہونا چاہئے۔ میں اسے اپنے ذہن میں تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ مجھے زندگی ہی میں مل جاتا ہے۔ میرا اس پر کچھ قابو نہیں ہوتا اور نہ میں اپنے نظریات اس کی زبان سے کہلواتا ہوں۔ میں تو خود چپکے چپکے اس کی باتیں سنتا اور اس کے اعمال و افعال کو دیکھتا رہتا ہوں اور یوں رفتہ رفتہ میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہوں۔ کردار سے افسانہ نگاری اسی جان پہچان کو میں دراصل کردار نگاری سمجھتا ہوں۔

کردار نگاری کے ساتھ ساتھ ایک بہت ضروری چیز ہے جزئیات نگاری، ان جزئیات کو براہ راست زندگی مشاہدے اور تجربے کا حاصل ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات فرض کر کے لکھ لی جاتی ہے۔ اگر وہ تجربے کے خلاف ہو تو وہ افسانے کے سارے تاثر کو اس طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح ایک غلط سر پورے راگ کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے---

--- میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنے افسانے میں وہی باتیں لکھوں جن کا تعلق براہ راست نفس مضمون سے ہو۔ غیر متعلقہ باتیں محض رونق یا جاذبیت پیدا کرنے کے لئے میں لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ یہی باعث ہے کہ میرے افسانے عموماً روکھے پھیکے معلوم ہوتے ہیں اور پھر افسانوں میں جو باتیں یا نکتے پڑھنے والے اپنے آپ سمجھ سکتے ہیں، انہیں بھی میں نہیں لکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے افسانے روکھے پھیکے ہونے کے علاوہ کچھ ادھورے ادھورے سے بھی نظر آتے ہیں مگر یہ ادھوراپن دانستہ ہوتا ہے۔ آخر کچھ تو قاری کو بھی

دماغ پر زور ڈالنا چاہئے۔ شاعر غزل کے دو مصرعوں میں دنیا جہان کی باتیں بند کر دیتا ہے اور شعر کے رسیا آپ ہی سارے خانے پر کر لیتے ہیں۔ کیا افسانے کے قاری کو اتنی بھی توفیق نہیں کہ وہ یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرے کہ آگے کیا ہوا یا کیا ہو سکتا ہے۔
ویسے میں افسانے کو یوں بھی ختم کر سکتا ہوں کہ پھر ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو گئی۔ پھر ان کے بچے پیدا ہوئے، وہ بچے بڑے بڑے ہو گئے۔ مدرسے جانے لگے، پھر ان کی شادیاں ہو گئیں۔ پھر ہیرو اور ہیروئن دادا دادی نانا نانی کہلانے لگے اور آخر ایک دن آیا کہ اجل نے باری باری دونوں کو اپنے آغوش میں لے لیا اور ان کی قبریں ان کی وصیت کے مطابق پہلو بہ پہلو فلاں قبرستان میں واقع ہیں اور مٹی کا ایک ایک پیالہ ان کی قبر کے سرہانے نصب ہے جن سے چڑیاں پانی پیتی ہیں۔
لیکن اس طرح بچوں کی طرح سمجھانا میں سمجھتا ہوں کہ قاری کی توہین ہے البتہ اگر قاری کو میرے کسی افسانے کے انجام سے تشنگی کا احساس ہوتا ہو تو وہم ممتاز رہے کہ اپنے ذہن میں جس طرح چاہے اسے مکمل کر لے۔۔۔"(39)

یہ سارے مضامین انشائیہ نہیں بلکہ ادبی تنقید ہیں اور اس حوالے سے غلام عباس کا ایک نیا پہلو دکھائی دیتا ہے۔

یہ معلوم نہیں کہ غلام عباس کے مضمون "اردو کے غیر معروف ناول" سے اس بات کا کتنا تعلق ہے، لیکن 6 فروری 1953ء کے پطرس بخاری کے خط میں یہ ذکر نظر آتا ہے:

"آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ سے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں اردو کے چند مختصر افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ چند ایسے افسانے انتخاب کر کے بھیج دیں گے۔ میں اس انتخاب کا منتظر ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد شروع کر دوں۔ آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن آپ ہاتھ بٹا سکیں تو مجھ پر کرم ہو گا۔"(40)

اسی طرح 1953ء میں نیویارک سے پطرس بخاری نے اپنے دوست عبدالمجید سالک کے نام ایک خط میں لکھا کہ "ترجمے کے لئے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب عباس کو یاد دہانی کراتا رہے گا۔" (41) اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں غلام عباس میں ادبی تخلیق سے نکل کر تنقید کی طرف رجوع کرنے کا شعور پیدا ہوا تھا اور اس زمانے میں پطرس نے دوسرے خط میں لکھا کہ "اب ایسی کہانی کا انتخاب وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی گود کی اخبار "پھول" میں مفعول فاعلاتن کرتے گزری ہو۔ پہلے خیال آیا امتیاز سے پوچھوں، لیکن اب جلد جواب کی توقع نہیں۔ اس لئے آپ (سالک) کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی تو کراچی ہی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب نہ کر

سکے تو اور کون کرے گا۔ کہانی اردو میں بھجوا دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا اور عباس سے کہئے کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے۔"[42]

سالک اور غلام عباس دونوں نے مل کر کہانیوں کا انتخاب کیا اور پطرس کو یہ انتخاب بھیجا تو پطرس نے 21 نومبر 1953ء کے خط میں شکریہ ادا کیا۔[43] اب معلوم نہیں کہ پطرس کا یہ انتخاب نیویارک سے یا پاکستان سے شائع ہوا ہے یا نہیں لیکن 1963ء میں غلام عباس کا مرتب کردہ "پھول" کا انتخاب کراچی سے چھپ گیا۔ اس انتخاب "پھول" کی اشاعت کے سلسلے میں ایک مسئلہ تھا کہ یہ کتاب کہاں سے شائع کی جائے۔ اس واقعے کے متعلق شان الحق کا ایک خط محفوظ ہے۔ شان الحق نے لکھا:

"میں نے زبانی آپ (سید حمید، دارالاشاعت، لاہور) کو کہلا بھیجا تھا کہ بورڈ (ترقی اردو بورڈ، کراچی) نے "پھول" اخبار کے انتخاب کی ایک اشاعت کا حق حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں مبلغ/1250 روپے نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
--- لیکن غلام عباس صاحب نے بتایا کہ شاید آپ خود طباعت نہیں کر سکیں گے۔ اس صورت میں آپ مشورہ دیں کہ کتاب کس پبلشر کو دے دی جائے۔"[44]

پھر یہ کتاب غلام عباس کے اپنے اشاعت خانہ یعنی 'سجاد کامران' کی طرف سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں غلام عسا نے زینب عباس کے ساتھ پاکستان کی لوک کہانیوں کا انگریزی ترجمہ چھپوادیا۔ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان یعنی اس زمانے کے دونوں صوبوں کی لوک کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ترجمہ پہلے غلام عباس نے اردو سے انگریزی میں کیا پھر زینب عباس نے اس انگریزی کی تصحیح کی۔[45] یہ کتاب حکومت پاکستان کے زیر اہتمام 1957ء میں شائع ہوئی۔[46] اس کتاب میں حنیف رامے کی تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس طرح کی تخلیق اور تنقید کے نتیجے میں جولائی 1960ء میں غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" وجود میں آیا۔ یہ مجموعہ "سجاد کامران" نامی اشاعت خانہ سے شائع ہوا۔ جسے خود غلام عباس نے قائم کیا۔ سرورق کی تصویر عبدالرحمٰن چغتائی کی ہے۔ یہ تصویر بعد میں غلام عباس کے مجموعے "آنندی" کے طبع جدید میں بھی استعمال کی گئی۔ "جاڑے کی چاندنی" کے سرورق کے ڈیزائن کے متعلق عبدالرحمٰن چغتائی نے غلام عباس کو لکھا:

"میں ڈیزائن کر چکا تو عبدالرحیم نے آنے کے ساتھ ہی اعتراض کیا کہ کتاب کا نام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ بعد میں دیکھا تو خط میں "جاڑے کی چاندنی" تھی۔ اب آپ دیکھ لیں یہ نام جو میں نے لکھا ہے کسی قیمت پر چل نہیں سکتا تو کسی دوست یا اپنی زوجہ محترمہ سے اس

نام کو خطوں میں دبادیں اور اس کے اوپر سفیدے میں کتاب کا نام لکھوالیں۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وقت اس قدر تھوڑا ہے کہ مشورہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نام لکھوا کر بلاک بنوالیں۔ ڈیزائن چھپ کر مطلب حل کر دے گا۔ رنگ لگاتے وقت خیال رکھیں چہرے کا رنگ نیلا اور ڈارک ہو۔ دو رنگ سے زیادہ اسکیم نہ بنائیں، تیسری آؤٹ لائن ہو۔ عورت کے بالوں میں جہاں میں نے نشان لگایا ہے، سیاہی میں اپنا نام لکھوالیں۔ بدقسمتی سے نام غلط لکھا گیا ورنہ میرے لئے کیا مشکل تھا۔ اب اسے مٹاؤں تو وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس لئے ارسال خدمت ہے۔

ڈیزائن دیکھ کر بھی خیال ہوتا ہے کہ آپ نام والی جگہ کو بالکل سیاہ کر دیں اور اسی پر سفیدے کے ساتھ نام لکھوالیں۔ ساری زمین پر نیلا رنگ چھپوالیں اور اس کے اوپر آنکھیں اور زیور وغیرہ کو چھوڑ کر ڈارک نیلا رنگ کرنشن کا سا رنگ چھپوائیں۔ بالوں پر الگ رنگ بالکل نہ دیں۔ یہ بڑا ہی خوبصورت نظر آئے گا۔۔۔'' (47)

اسی طرح دوسرے خط میں بھی عبدالرحمٰن چغتائی نے لکھا:

''جس روز ڈیزائن آپ کو بھجوایا تھا اسی روز میں لاہور سے باہر چلا گیا تھا اور آج آیا ہوں اور آپ کا خط پڑھا ہے۔ ڈسٹ کور کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خریدار اس کی طرف لپکے اور کتاب کو اٹھائے۔ مجھے دس ڈیزائن بھی بنانے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن وہ ڈیزائن جو میں نے آپ کے لئے بنایا ہے آپ اس کو جس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، اس کو چھوڑیئے وہ صرف دو رنگ اور ایک آؤٹ لائن کا قصہ ہے۔ آپ کو چھپوانے، بلاک بنوانے میں بھی اچھا رہے گا اور جب یہ رنگ چھپ جائیں تو آؤٹ لائن چھپوائیں۔ میرا ذاتی خیال ہے بہت پسند کیا جائے گا۔۔۔'' (48)

''جاڑے کی چاندنی'' کے سرورق کے لئے غلام عباس اور عبدالرحمٰن چغتائی کے درمیان کچھ ڈیزائن کے سلسلے میں بحث ہوتی معلوم ہوئی ہے۔ اس مجموعے کی تمہید ن۔ م راشد نے لکھی۔ یہ تمہید غلام عباس کی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لئے بہترین تحریروں میں سے ایک تسلیم کی جاتی ہے اور یہ تمہید 24 جولائی 1960ء کو قلمبند ہوئی۔ ن۔ م راشد نے لکھا:

''۔۔۔ یہ اس کی کئی کہانیوں کا پسندیدہ موضوع ہے کہ انسان اکثر ایسے عقائد اور خیالات سے وابستہ ہے جن کا جواز اسے خود بھی بیشتر نظر نہیں آتا۔ ان عقائد اور خیالات کے باوجود اور ان ظاہری اعمال کے باوجود جو ان عقائد کی بنا پر انسان سے سرزد ہوتے ہیں، انسان کے دل میں طرح طرح کی خفیہ آرزوئیں لرزاں رہتی ہیں جو معاشرت اور اردگرد کے

دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے بندھنوں کی وجہ سے کھل کر ظاہر نہیں ہوتیں، حفض چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی ہیں اور اس سے کبھی دانستہ اور کبھی بے ارادہ وہ کام کراتی ہیں جو اس کے ظاہری عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

غلام عباس ہمارے بہت سے جانے بوجھے افسانہ نگاروں سے بے حد مختلف ہے۔ اس کا فن نرم رو اور سبک سیر ہے۔ وہ منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا۔ وہ عزیز احمد کی طرح ناکام مصلح بن کر کسی فاسد انا کی تسکین بھی نہیں کرتا۔

غلام عباس محض چھوٹے آدمی کا داستان گو ہے، اسے کبھی وہ شہر کے کسی دور افتادہ محلے میں جا ڈھونڈتا ہے اور کبھی کسی گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے گرد و پیش کی تصویر کھینچتا ہے کیونکہ اس کے لئے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی انسان ماحول سے الگ تھلگ اپنے اندر ہی زندگی بسر کرتا ہو۔ اس کا کوئی کردار اپنے آپ میں سرمست نہیں بلکہ اپنے ماحول کا لازمی جزو ہے، پھر ہمیں اس کے ظاہری حلئے لباس اور حرکات و سکنات سے پوری تفصیل کے ساتھ آگاہ کرتا ہے تاکہ اس کی معاشرتی حیثیت ہمارے ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے بعد کہانی میں اس کے عمل اور گفتگو سے اس کے تمام خدوخال کی ایسی واضح تصویر ہمارے سامنے آنے لگتی ہے کہ اس کا ایک ایک پہلو ہم پر روشن اور اجاگر ہو جاتا ہے، غلام عباس نے اپنی کہانیوں میں شہروں کے گمنام محلوں اور ان کے مکانوں کی نہایت دلاویز تصویریں پیش کی ہیں جو اس کے کرداروں کے لئے عقبی پردے کا کام دیتی ہیں۔

پھر اس کے اکثر کرداروں کے وجود میں ایک عجیب و غریب ثنویت یا دہرا پن ہے، ان کا چہرہ اکثر دکھاوے کے لئے ہوتا ہے جس کی حیثیت گویا خطیب کی چرب زبانی کی ہے جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا چہرہ ان کے دل کا آئینہ ہوتا ہے دل کی ان چھپی ہوئی خواہشات کا آئینہ جو ہر بندھن سے آزاد رہنا چاہتی ہیں۔ عباس کے کرداروں کی یہی ثنویت کبھی اخلاق کی پابندی اور اخلاق کی آزادی کی کشمکش بن جاتی ہے اور کبھی جدید و قدیم کے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، تاہم اس کے کردار دھوکا نہیں کرتے۔ دیانت داری سے "گناہ" کے مرتکب ہوتے ہیں اور محض اپنی ازلی انسانی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی بظاہر بے حیائی میں بھی اکثر ان کی زندہ دلی بدستور قائم رہتی ہے، جیسے "سرخ جلوس" کے ریاض میں یا ڈائری والے مکرجی میں۔۔۔

---۔ غلام عباس اپنے کرداروں پر اپنی اس دوہری نگاہ سے ایک طرح دوہری طنز پیدا کرتا ہے، ان دونوں کو تھوڑی دور دوش بدوش چلاتا ہے۔ پھر الگ کر لیتا ہے پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں اور اس طرح ان کی شخصیت اصلی شخصیت کا کھوکھلا پن اس کی ظاہر کرداری اور اس کے نہفتہ جھوٹ کی آہستہ آہستہ پردہ دری کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اکثر کردار دل میں وہ باتیں چھپائے پھرتے ہیں، جنہیں وہ اپنے آپ پر بھی ظاہر کرنے کی جرات نہیں رکھتے اور اپنی اسی کشمکش کے باوجود اخلاقی اعمال یا ان کی خواہش ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں سنگ گراں بن کر پڑی رہتی ہے۔

---مجھے بعض دفعہ یوں محسوس ہوا کہ، کہ غلام عباس کے افسانوں کے ہیرو اس کے افسانوں کے لئے اتنے اہم نہیں جتنے وہ ضمنی کردار جن سے اس کے افسانوں کے اندر زندگی کا پورا میلہ صورت پکڑتا ہے؛ اس میلے میں طرح طرح کے لوگ آتے جاتے ہیں---
غلام عباس کی دنیا اس بے پناہ خلقت سے بھری پڑی ہے، انہیں میں سے وہ اپنے بڑے کرداروں کو نکالتا ہے اور انہیں کے اندر انہیں پھر سے ڈال دیتا ہے۔ انہیں کی مدد سے وہ انسانی دنیا کی چھوٹی بڑی کوتاہیوں پر ہنستا ہے، انہی کے اعمال سے غلام عباس اپنا یہ بنیادی تصور ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی دنیا میں کوئی چیز اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ انسان ہمیشہ سے دوسرے انسان کی حیلہ سازیوں کے سامنے بے بس چلا آرہا ہے اور ان حیلہ سازیوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان شر کو بھی خیر کے پہلو بہ پہلو جگہ دے تاکہ دونوں کے آہنگ سے دنیا زیادہ خوبصورت اور زیادہ رنگین ہوتی چلی جائے---"(49)

یوں اس تبصرے میں غلام عباس کی افسانہ نگاری پر آج تک جتنی مباحث ہوئی ہیں، ان سب کے عناصر موجود ہیں۔ ن۔ م راشد کے ساتھ غلام عباس کی دوستی نہ صرف بچپن کی تھی بلکہ اس زمانے میں دونوں قریب میں رہتے تھے اور مل کر شطرنج وغیرہ شوق سے کھیلتے تھے۔ (50) جس زمانے میں ن۔ م راشد کراچی میں مقیم تھے۔ 9 جولائی 1958ء کے راشد کے خط میں یہ لکھا گیا ہے:

"28 جولائی کی صبح کو N.Y. کی اڑان نمبر 979 سے روانہ ہو کر اسی شام کراچی پہنچ رہا ہوں۔ تم نے شاید سن لیا ہو کہ اب مجھے کراچی سنٹر میں ہر کام کرنا ہوگا۔ تم سے پھر وہی پہلی سی محبتیں رہیں گی۔ باقی عند الملاقات! 29 کی دوپہر تم اور کرس میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ تمہیں دو امریکن دوستوں سے ملاؤں گا۔"(51)

یہ معلوم ہے کہ غلام عباس کو شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس سلسلے میں مرزا ظفر الحسن نے

لکھا ہے:

"موسیقی کی طرح غلام عباس کو شطرنج سے بھی شغف ہے۔ یہ لت انہیں ن۔ م راشد کی وجہ سے پڑی۔ کوئی پندرہ برس پہلے یعنی 1960ء کے قریب راشد ان سے کہنے لگے تم میں اور مجھ میں کئی باتیں مشترک ہیں اور ہم ان موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ آج میں تمہیں ایک کھیل سکھاؤں گا جس میں دونوں کا خاصا وقت صرف ہو گا۔ اس طرح انہوں نے شطرنج کے کھیل سے متعارف کرایا، وہ خود تو بھول بھال گئے لیکن میں (غلام عباس) اس کھیل کو نہ صرف بھلا نہ سکا بلکہ جیسی کہ میری عادت ہے میں نے اس پر پڑھنا شروع کر دیا۔ اردو میں شطرنج پر کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری البتہ انگریزی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور میرے پاس موجود بھی ہے۔ ادیبوں میں وہ شوکت تھانوی، سید انور اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ کھیل چکے ہیں۔ اختر حسین اور سید انور کو اپنی ٹکر کا اور شوکت تھانوی کو اپنے سے قدرے بہتر کھلاڑی کہتے ہیں۔۔۔ اور ناصر کاظمی کہتے ہیں وہ اپنے وقت کا استاد تھا۔ اسے چال ایسی سوجھتی تھی کہ سبحان اللہ؟" (52)

یعنی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں راشد کے ساتھ غلام عباس کس دلچسپی سے شطرنج کھیلتے تھے۔ مرزا ظفر الحسن کے مضمون میں ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں لکھا گیا ہے کہ غلام عباس اور راشد دونوں مل کر ادبی رسالہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غلام عباس نے لکھا:

"ان دنوں (1960ء کے قریب) ن۔ م راشد اقوام متحدہ سے منسلک اور کراچی میں مقیم تھے۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ ایک رسالہ نکالیں، خرچ کا اندازہ فی شمارہ دو ڈھائی سو روپے لگایا۔ پہلے شمارے کے لئے ہم دونوں سو سو روپے دینے والے تھے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہر شمارے میں راشد کا تازہ کلام شائع ہو، اس کے ساتھ ایک افسانہ (ظاہر ہے غلام عباس ہی کا) اور ایک تنقیدی مضمون۔۔۔ بھرتی کے مضمون کے لئے چاہے وہ کسی کی تخلیق ہو، اس رسالے میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہمارے پیش نظر رسالے کا معیار قریب قریب وہی تھا جو تیس چالیس سال پہلے برلن سے شائع ہونے والے رسالے "ایران شہر" کا تھا۔ اس کی انوکھی بات یہ تھی کہ رسالہ کسی کتب فروش یا بک اسٹال کو فروخت کے لئے نہیں دیں گے بلکہ ہم دونوں اور ہمارے احباب خانگی طور پر اس کی نکاسی کی ذمہ داری لیں گے۔ اسکیم بنانا اور اسے عملی جامہ پہنانا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ اسکیم بنی مگر ہم رسالہ نہ نکال سکے۔"
(53)

اشاعت خانے کا نام "سجاد" اور "کامران" غلام عباس کے دونوں بیٹوں کے نام پر ہے۔ غلام عباس کو جو معاوضہ ملتا تھا وہ یہیں جمع ہوتا تھا۔ غلام عباس کے انتقال کے بعد بھی یہ معاوضہ "سجاد کامران" پر جمع ہونے کے بعد دونوں بیویوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ (54)

مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" پہلی بار جولائی 1960ء میں شائع ہوا مگر اس مجموعے کے بیشتر افسانے 1958ء تک لکھے جا چکے تھے اور وہ ان افسانوں کو کسی اچھے اشاعت خانے سے چھپوانے کے لئے کوشش کر رہے تھے چنانچہ 25 نومبر 1955ء کے راشد کے خط میں لکھا گیا ہے:

"افسانوں کا دوسرا مجموعہ جب چھپ جائے تو ایک نسخے کی توقع ہے۔" (55)

اسی طرح اگست 1958ء سے نومبر 1958ء تک زینب عباس لندن واپس چلی گئیں تو غلام عباس نے ان کے نام ایک خط میں لکھا:

"I have not been able to sell my second book of short stories as yet. The publishers want to buy its rights for good but do not want to pay too much. ---but I don't worry. There is again a good chance of selling more rare books. And then there is the price for my book of short stories. Good prospects for the future of course it is only the time that matters." (56)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی غلام عباس کو اقتصادی مسئلہ درپیش تھا۔ اس لئے وہ اپنی پرانی اور نایاب کتابوں کو بیچنے پر بھی تیار تھے۔ زینب عباس نے بھی اس گھریلو صورتحال کا ذکر کیا ہے:

"The demands upon Abbas' salary were ever increasing. To help meet there Abbas managed to sell the most valuable book I had acquired from my Auntie Opie ten years before." (57)

پھر زینب عباس بھی ریڈیو پاکستان میں انگلستان یا ترکی کے لئے پروگرام مرتب کرنے لگیں۔ اسی طرح غلام عباس مشکل سے گزارہ کر رہے تھے۔ اس لئے "سجاد کامران" کا قائم کیا جانا ضروری بھی تھا اور مجبوری بھی اور اپنا ادارہ قائم کرنے کا ارادہ غلام عباس 1957ء سے رکھتے تھے چنانچہ 1957ء میں غلام عباس کے نام سید امتیاز علی تاج نے خط میں لکھا ہے:

"--- یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ خود بھی پبلشنگ کا کام شروع کرنے پر غور کر رہے ہیں، لیکن گھر میں اسٹاک رکھنے کی گنجائش ہونے سے کیا بنے گا۔ اصل بات تو کتاب بیچنے کا اہتمام ہے۔ پبلشنگ اس زمانے میں بہت گراں ہو گئی ہے۔"(58)

پھر سجاد کامران قائم ہوا۔

"جاڑے کی چاندنی" کے دو ایڈیشن یعنی خاص اور عام چھپ گئے۔ خاص ایڈیشن چھ روپے میں اور عام ایڈیشن چار روپے میں بک گیا۔ خاص ایڈیشن کی تعداد 500 تھی اور عام ایڈیشن کی تعداد 1000 تھی۔ "سجاد کامران" کا پتہ یوں لکھا گیا ہے:

"سجاد اینڈ کامران
7-ایچ (بلاک نمبر6)
پی ای سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی-29"

یہ غلام عباس کی اس وقت کی رہائش کا پتہ ہے۔ اکتوبر 1957ء میں ن۔ م راشد لاہور سے کراچی آئے اور غلام عباس سے ملے۔ راشد کراچی سے نیویارک جا رہے تھے انہوں نے یکم اکتوبر 1957ء کو غلام عباس کے نام خط میں اپنے کراچی آنے کی اطلاع دی۔ پھر نیویارک پہنچنے کے بعد خط لکھا:

"کراچی میں چند دن یا چند گھنٹے تمہاری بدولت بڑی لذت کے حامل تھے۔ اس مختصر وقت میں بھی تمہاری رفاقت کی نعمت کا حاصل ہو جانا بڑی بات ہے۔ افسوس کہ گھر نہ جا چکا۔ ورنہ اماں کی قدم بوسی اور بھائیوں سے علیک سلیک ہو جاتی اور بچوں کو پیار کر لیتا۔"(59)

غلام عباس کا تخلیقی عمل 1957ء تک نمایاں ہے۔ مگر 1958ء سے 1960ء تک کے دوران میں بہت کم تخلیق کی گئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ پانچ دسمبر 1958ء کو غلام عباس کے عزیز دوست پطرس بخاری کا انتقال ہوا تو 1959ء میں رسالہ "نقوش" کے مدیر محمد طفیل نے غلام عباس کو کہا کہ پطرس بخاری کے بارے میں ایک مضمون لکھیں چنانچہ محمد طفیل نے خط میں لکھا:

"پطرس پر مضمون جلد چاہئے۔ بہت سا کام کر لیا ہے۔ اب تو میں چاہتا ہوں یہ نمبر آجائے۔"(60)

اسی طرح محمد طفیل نے افسانہ لکھنے کا بھی کہا تھا:

"کیا ان دنوں کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ لکھا ہو گا تو "نقوش" کا نمبر کاہے کو آئے گا۔ آپ بے شک اپنے افسانے ادھر ادھر چھپوائیں "نقوش" میں چھپے گا تو اسے زیادہ لوگ پڑھیں

گے۔ آپ شاید یہ نہیں چاہتے۔ یہاں ایک سرکاری پرچے کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا وہ چھپتا زیادہ ہے پڑھا کم جاتا ہے۔۔۔ "(61)

مگر غلام عباس نے اس کے لئے افسانہ نہیں لکھا۔ غلام عباس کے قلمی مسودے میں پطرس کی یاد میں نامکمل مضمون موجود ہے مگر غلام عباس اسے مکمل نہیں کر سکے۔ (62) اس سلسلے میں غلام عباس نے محمد طفیل کو خط لکھا:

"عزیز طفیل صاحب،

پطرس پر ابھی میں نے مضمون مکمل نہیں کیا اور آپ ہیں کہ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں اور اپنے تاکیدی خطوں سے حواس مختل کئے دیتے ہیں۔ بھیا مضمون آپ کو 25-30 جون سے پہلے نہیں مل سکتا۔ پچھلے ایک مہینے سے میری صحت اچھی نہیں۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے مگر مرحوم سے جو عقیدت مجھے عمر بھر رہی ہے، وہ مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ ان دنوں میں کہاں اور لکھنا کہاں، لہٰذا صبر کیجئے یا پھر جی کڑا کر کے اپنی سکیم سے نکال دیجئے۔

آپ کا،

غلام عباس (63)

اسی طرح قیوم نظر نے بھی غلام عباس کو پطرس بخاری پر مضمون لکھنے کے لئے خط لکھا۔ قیوم نظر نے لکھا:

"آپ کے نام بخاری صاحب نے جو دو خط بھیجے تھے ان کی نقل ڈاکٹر نذیر (احمد) صاحب نے آج مجھے عنایت کی۔ اس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ کراچی میں آپ سے گفتگو کے دوران میں مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ آپ نے بخاری مرحوم پر کوئی مضمون لکھا ہے۔ جس کو آپ نے نذیر صاحب کی معرفت "راوی" میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔ نہ جانے کیوں میرا جی یہ چاہتا ہے کہ آپ بخاری صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر ضرور مضمون لکھیں۔ میرے خیال میں یہ مضمون جتنا عمدہ آپ تحریر فرما سکیں گے بہت کم احباب ویسا لکھ سکیں گے، اس لئے اگر آپ اس معاملے کی طرف مکرر توجہ دیں تو آپ مرحوم کے ان گنت پرستاروں کی دلی آرزوؤں کو پورا کریں گے۔ امید ہے آپ ہمیں مایوس نہ فرمائیں گے۔ "(64)

پھر اس خط کے نو مہینہ بعد قیوم نظر نے دوبارہ خط لکھا:

"پچھلے دنوں آپ کے خدمت میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ "راوی" کا بخاری نمبر مرحوم

کی برسی کے موقع پر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کے مضمون کے لئے ہم ابھی تک چشم براہ ہیں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ آپ اس طرف توجہ فرما کر ہمیں ممنون فرمائیں۔"[65]

پھر غلام عباس نے قیوم نظر کے نام یہ جواب دیا:

"--- میری صحت اچھی نہیں ہفتہ میں تین دن اچھا رہتا ہوں تو چار دن بیمار اور یہ سلسلہ پچھلے تین چار ماہ سے جاری ہے اور ایسی مردگی کے عالم میں مضمون لکھنے کا کس کو یارا ہے۔ بخاری صاحب پر جو مضمون میں نے لکھنا شروع کیا تھا تین چار صفحوں سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اب ایسے تنگ وقت اور علالت کی حالت میں اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میں آپ سے اور برادر ڈاکٹر نذیر احمد سے اس باب میں حد درجہ شرمندہ ہوں۔ از راہ کرم مجھے معاف کر دیجئے اور اگر ہو سکے تو میری تندرستی کی دعا کرتے رہئے۔

والسلام

خاکسار، غلام عباس[66]

غلام عباس کے اس خط کے جواب میں قیوم نظر نے لمبا خط لکھا:

"آپ کا خط ملا، میرے لئے اس میں تعجب کی دو باتیں تھیں۔ میرا یہ خط جس کا آپ نے جواب عنایت فرمایا ہے، دراصل میرے اس طویل خط کی یاددہانی کے طور پر تھا جو میں نے اس رینگنے والے خط سے تقریباً دو ہفتے پہلے تحریر کیا تھا۔ میں نے اپنے اس خط میں یہ تحریر کیا تھا کہ:

① ہم لوگ بخاری نمبر مرحوم کی برسی کے موقع پر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

② آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے راشد صاحب اور حفیظ صاحب کو الگ الگ خطوں میں بخاری نمبر کے لئے کوئی شے عطا فرمانے کی درخواست کی تھی---

--- آپ کی علالت کے بارے میں پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ خدارا اول و آخر اپنی صحت کو نظر میں رکھئے۔ ورنہ صحت کے بغیر تو یہ کہانیاں، یہ قصے بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ خدا کرے اب تک آپ کی صحت میں نمایاں تبدیلی آچکی ہو اور آپ پہلے سے بہتر طور صحت مند نظر آتے ہوں۔ امید ہے آپ اپنے آئندہ خط میں اپنی صحت یابی کی خوش خبری سنائیں گے---"[67]

اسی طرح 1959ء میں شان الحق نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں لکھا گیا:

"ہم نے اردو مختصر افسانوں کے مجموعہ کا بنگالی ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس مجموعے

میں آپ کے افسانہ "آنندی" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ امر آپ کے لئے دلچسپی کا موجب ہو گا۔ میں ممنون ہوں کہ آپ تحریری طور پر مطلع کر دیں لیکن اگر آپ کی طرف سے اس ماہ کی آخر تک جواب نہ ملا تو آپ کی رضامندی تصور کیا جائے گا اور کتاب کی ترتیب واشاعت میں تاخیر نہ کی جائے گی۔"(68)

ان شواہد کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1958ء اور 1959ء کے دو سال میں غلام عباس اپنی بیماری کی وجہ سے تخلیقی کام نہیں کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ "جاڑے کی چاندنی" کو چھپوانے کے سلسلے میں ان کی مصروفیت بھی تخلیقی عمل میں رکاوٹ کا سبب بنی ہو گی۔

1960ء میں غلام عباس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو 22 اپریل 1960ء کو آل انڈیا اردو رائٹرز کنونشن میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان گئے۔ اس سفر کے بارے میں غلام عباس نے انگریزی میں مضمون بھی لکھا تھا۔(69) پھر جولائی میں "جاڑے کی چاندنی" شائع ہوا۔

"جاڑے کی چاندنی" چھپنے کے بعد اس مجموعے پر کئی تبصرے لکھے گئے۔ اکتوبر 1960ء میں رسالہ "سات رنگ" میں "جاڑے کی چاندنی" پر تبصرہ شائع ہوا۔(70) 25 فروری 1961ء کو ریڈیو پاکستان سے ڈاکٹر صفدر حسین کا تبصرہ نشر کیا گیا۔(71) جون 1961ء میں جب کراچی سے "The Cultural Scene in Pakistan 1960-1961" نامی انگریزی رسالہ چھپا تو اس میں افسانہ "اس کی بیوی" کا انگریزی ترجمہ شامل کیا گیا۔(72) اس طرح قرۃ العین حیدر نے بھی "جاڑے کی چاندنی" پر ایک مضمون لکھا(73) مگر سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ 1960ء میں پہلا آدم جی انعام اس مجموعے کو ملا۔ 1959ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ قائم کیا گیا اور اس کے بعد یہ انعام سالانہ دیا جانے لگا۔ بطور انعام 20.000 روپے دیئے گئے۔(74)

"جاڑے کی چاندنی" پر غلام عباس کو آدم جی انعام دیا جانے کے بعد اسلوب احمد انصاری نے غلام عباس کے نام خط لکھا:

"رسائل کے ذریعے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ حکومت پاکستان نے آپ کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" پر آپ کو انعام دیا ہے۔ مجھ سے آل انڈیا ریڈیو دہلی والوں نے 14 فروری کے پروگرام میں اردو کی نئی مطبوعات پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کی کتاب بھی اس میں شامل کر دوں۔ اگر آپ ایک نسخہ بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔ خط کا جواب جلد دیں تاکہ ریڈیو والوں کو اپنی پسند کی کتابوں کی فہرست بلا تاخیر بھیج سکوں۔۔۔"(75)

"جاڑے کی چاندنی" کی کامیابی کے بعد غلام عباس نے "جزیرہ سخن وراں" کو دوبارہ چھپوایا۔ یہ

بھی سجاد کامران سے شائع ہوا۔ اس نسخے میں فیض احمد فیض اور مولانا عبد الماجد دریابادی کے تبصرے بھی آخری صفحے پر پیش کیے گئے۔ اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ٹائپ کا "فیس" غلام عباس نے ایجاد کیا۔ اس نے خود دیباچے میں لکھا:

"یہ ایڈیشن اردو ٹائپ میں شائع کیا جارہا ہے۔ ٹائپ کے چھاپے پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے حروف باریک اور ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں اور بین السطور بہت کم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے پڑھنے میں نظر کو تھکن محسوس ہوتی ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اس کتاب میں جو ٹائپ استعمال کیا گیا ہے وہ جلی اور کشادہ ہونے کے علاوہ خوشنما بھی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ٹائپ کے چھاپے میں ایک نیا معیار قائم کرے گی اور ٹائپ کو عوام میں مقبول بنانے میں مدد کرے گی۔"(76)

اس مرتبہ "جزیرہ سخن وراں" کی 1000 کاپیاں شائع ہوئیں۔ اس کتاب پر 25 دسمبر 1961ء کو فیض احمد فیض نے ریڈیو پاکستان سے ایک انگریزی تبصرہ نشر کرایا۔ (77) اس طرح 18 فروری 1962ء کو انگریزی اخبار "Dawn" میں بھی اس کتاب پر تبصرہ شائع ہوا۔ (78)

علاوہ ازیں غلام عباس نے "سجاد کامران" سے دو کتابیں 1960ء میں چھپوائیں۔ یہ دونوں غلام عباس کے دوست حفیظ ہوشیار پوری اور محشر بدایونی کے شعری مجموعے ہیں اور یہ شاعری بچوں کے لئے لکھی گئی۔ اس کی تصاویر زینب عباس نے بنائیں۔ (79)

1961ء میں غلام عباس نے "ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری" نامی ایک مضمون لکھا تھا۔ ویسے خود غلام عباس کو رسالہ "پھول" کے زمانے سے سلیس اور سادہ زبان اور اسلوب سے دلچسپی تھی اور ترجمہ کرنے کے سلسلے میں قواعد کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔ علاوہ ازیں "جزیرہ سخن وراں" چھپوانے کے سلسلے میں حروف کی طرف بھی وہ متوجہ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ غلام عباس کی توجہ حروف، زبان، ذخیرہ الفاظ کی طرف بھی ہو گئی ہو۔ اسی وجہ سے انہوں نے ایسا مضمون بھی لکھا ہو گا مگر یہ مضمون تنقیدی سے زیادہ طنزیہ ہے۔ یعنی اس مضمون میں گل کرسٹ کی ڈکشنری میں جتنی اغلاط اور حاکمانہ انداز ہیں ان پر طنز کی گئی ہے۔ پھر آخر میں غلام عباس نے لکھا ہے:

"حقیقت میں ڈاکٹر گل کرسٹ کو نہ مسلمانوں سے دلچسپی تھی نہ ہندوؤں سے وہ تو فقط انگریزوں کے گن گانا اور کمپنی بہادر کی چاپلوسی کرنا جانتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اس ڈکشنری میں جا بجا کیا ہے۔"(80)

یعنی غلام عباس یہ کہنا چاہتے تھے کہ گل کرسٹ بھی محض ایک افسر اور حاکم تھا۔ ہندوستان کے معاشرے کو سمجھنا بھی گل کرسٹ کے لئے صرف انگریز حکومت کو جاری رکھنے کے لئے تھا۔ دراصل

یہ لغت پطرس بخاری کے پاس تھا اور 1958ء میں غلام عباس نے ان سے حاصل کیا تھا۔ پطرس نے اپنے ایک خط میں لکھا:

"گل کرسٹ کی ڈکشنری میرے پاس محفوظ ہے۔ حسب ارشاد آپ اسے رجسٹری سمندری ڈاک سے آپ کو بھیج رہا ہوں، تقریباً تین ہفتے تک پہنچ جائے گی۔"(81)

چنانچہ غلام عباس کو یہ لغت ملا تو اس نے اس کا مطالعہ کیا۔ 1953ء سے 1961ء کے دور میں مجموعہ "آنندی" بھی دوبارہ چھپ گیا۔ یہ 1955ء میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں پطرس بخاری اور محمد حسن عسکری کا تبصرہ شامل کیا گیا۔(82) 1955ء کے رسالہ "نقوش" افسانہ نمبر میں بھی افسانہ "آنندی" شامل کیا گیا۔(83)

8 جنوری 1955ء کو سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تو رسالہ "نقوش" کے محمد طفیل نے غلام عباس کو کوئی مضمون لکھنے کا کہا۔ محمد طفیل نے غلام عباس کے نام خط میں لکھا:

"منٹو نمبر کے سلسلے میں اپنے تاثرات اور واقعات پر مبنی ایک مضمون ضرور بھیجیں۔ اس لئے کہ پاکستان میں فن کے اعتبار سے آپ ہی ایک دوسرے کے حریف تھے۔"(84)

محمد طفیل کے اس کہنے کے مطابق غلام عباس نے کوئی مضمون لکھنے کا اظہار کیا تو محمد طفیل نے شکریہ ادا کرنے کے لئے خط لکھا:

"منٹو نمبر کے لئے آپ لکھیں گے، اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی۔ اگر آپ واقعی لکھنا چاہتے ہیں تو براہ کرم انہیں دس بارہ روز میں بھجوا دیجئے گا۔ اس لئے کہ مارچ کے آخری ہفتے میں "منٹو نمبر" چھپ جائے گا۔"(85)

غلام عباس کا یہ مضمون "منٹو کی موت" کے عنوان سے رسالہ "نقوش" کے "منٹو نمبر" میں طبع ہوا۔(86) 1956ء میں رسالہ "نقوش" کا شخصیات نمبر طبع ہوا تو اس میں پریم ناتھ در نے غلام عباس کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا۔ پریم ناتھ در نے لکھا:

"غلام عباس فوراً ہی بے تکلف نہیں ہو جاتے۔ گفتگو بڑھتی جاتی ہے، تکلف گھٹتا جاتا ہے۔ بات جو کہیں تھی، کہیں پہنچ جاتی ہے اور غلام عباس جو صرف مسکرا رہے تھے ہنسنے لگتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ کھلکھلا کر کبھی نہیں ہنستے---

--- ان کے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جنہیں انہوں نے بڑی کاوش سے جمع کیا ہے، سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے پرانے خریدار ہیں۔ مشہور مصنفوں کی بڑی بڑی کتابیں نہ جانے کہاں کہاں سے نکال لاتے ہیں۔"(87)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس کا مزاج ان کے افسانوں کی طرح دھیما تھا اور

انہیں کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ پریم ناتھ در نے یہ بھی لکھا:

"---- میں غلام عباس کے لکھنے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ غلام عباس ایک ایک سطر کو لکھ لکھ کر پانچ پانچ چھ چھ بار بغیر آواز نکالے اپنے موٹے موٹے نرم نرم ہونٹوں سے ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے منتر پڑھ رہا ہو۔"(88)

اسے پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس بڑی سنجیدگی سے افسانہ لکھتے تھے، لیکن خود غلام عباس نے کئی مرتبہ اپنے انٹرویوز میں کہا کہ میں افسانہ صرف ایک مرتبہ لکھ ڈالتا ہوں اور اس کی دوبارہ تصحیح نہیں کرتا۔ چنانچہ غلام عباس نے ایک جگہ پر کہا:

"کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں افسانے پر بڑی محنت کرتا ہوں۔ یہ کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایک ہی افسانہ بار بار لکھتا اور یکے بعد دیگرے اس کے مسودے ضائع کرتا ہوں۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ لکھنا شروع کرنے سے پہلے کہانی کی ابتدا سے اختتام تک کے تمام مراحل اپنے ذہن میں طے کر لیتا ہوں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ سوچنے اور دماغ میں اسے مرتب کرنے میں کافی وقت لیتا ہوں اور یہ واقعہ بعض دفعہ کئی کئی مہینے بلکہ کئی کئی سال تک پہنچ چکا ہے۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو چند گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ دو تین راتوں میں لکھ لیتا ہوں۔ "آنندی" میں نے صرف دو راتوں میں لکھا اور اس میں کبھی کوئی ترمیم مناسب نہیں سمجھی۔ یہی حال "کتبہ" کا ہے۔ بعض افسانوں کے خاکے کئی کئی برس تک میرے ذہن میں پکتے رہتے ہیں۔ اس بات کی توثیق حسن عسکری کے ایک مضمون (اگست 1954ء) سے ہوتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

"عباس صاحب آج کل جو افسانے لکھ رہے ہیں میں تقریباً دس سال پہلے (ان سے) سن چکا ہوں۔" ترمیم یا تنسیخ صرف اتنی کرتا ہوں کہ جن الفاظ یا فقروں کی واقعی ضرورت نہ ہو انہیں حذف کر دیتا ہوں۔ میں کفایت کا قائل ہوں۔ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں بیان کرتا ہوں۔ بے مقصد تفصیلات سے گریز کرتا ہوں کہ اس سے موضوع مجروح ہوتا ہے اور پلاٹ متاثر۔ میری پوری ادبی زندگی میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے جسے میں نے دوبارہ لکھا ہو۔"(89)

اس میں غلام عباس نے واضح طور پر کہا کہ کوئی ایسا افسانہ نہیں جسے بار بار لکھا گیا ہو۔ اس سلسلے میں غلام عباس کے نام ن۔ م راشد کا ایک خط بھی موجود ہے جو غلام عباس کی افسانہ نویسی کے ایک دلچسپ پہلو کو واضح کرتا ہے۔ راشد نے لکھا ہے:

"۔۔۔ گو مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی کہانیوں کو کبھی "مکمل" نہیں ہونے دیتے یعنی چھپ جانے کے بعد بھی ان پر قلم لگاتے رہتے ہو۔"(90)

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کے متعدد افسانوں کے قلمی مسودے محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس نے اپنے افسانوں کی بار بار تصحیح کی اور یہ بات صرف مسودوں تک محدود نہیں بلکہ بعض ایسے افسانے بھی ہیں جن کو رسالوں میں چھپ جانے کے بعد بھی غلام عباس نے تصحیح کی۔ مثلاً افسانہ "کن رس" کا قلمی مسودہ پہلے نیلے رنگ کے قلم سے لکھا گیا ہے اور کالے رنگ کے قلم سے اس کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس طرح "نواب صاحب کا بنگلہ"، "رینگنے والے" اور "بندے والے" کے مسودے میں بھی تصحیح کے نشانات موجود ہیں۔(91)

رسالہ "نیا دور" میں جب افسانہ "سرخ جلوس" طبع ہوا تو غلام عباس نے اس رسالے پر تصحیح کی۔(92) اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلام عباس افسانہ بڑی سنجیدگی سے لکھتے تھے۔ وہ خود تو کہتے تھے کہ افسانہ ایک بار مکمل کر دیتا ہوں مگر مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس اپنی قوت تخلیق کو مبالغہ انداز میں بتانے کی کوشش کرتے تھے۔

افسانہ نویسی کے سلسلے میں غلام عباس نے ایک جگہ یہ بھی کہا:

"میں نے آج تک کوئی چیز پنسل سے نہیں لکھی۔ میرے پاس سازوں اور کتابوں کی طرح قلموں کا بھی اپنا خاصا ذخیرہ ہے جس میں ایک فونٹین پین ایسا ہے جس کا خط کلکی قلم کی طرح موٹا ہے۔ یہ میں نے لندن میں بڑی تلاش کے بعد خریدا تھا اور اپنے اکثر افسانے اسی سے لکھتا ہوں۔ سیاہی اور کاغذ کے معاملے میں بھی نفاست پسند ہوں۔ عام طور پر رات کی خاموشی میں لکھتا ہوں۔"(93)

غلام عباس کے جتنے قلمی مسودے محفوظ ہیں، ان کو دیکھ کر یقین آتا ہے کہ غلام عباس قلم ہی سے مسودہ لکھتے تھے۔ چند ایسے مسودے ہیں جن کو پنسل سے لکھا گیا۔ یہ ریڈیو پاکستان کے کسی پروگرام کے لئے ہیں۔

باقی سارے مسودے قلم سے لکھے گئے ہیں۔

بہرحال پریم ناتھ درکا یہ مضمون غلام عباس کی افسانہ نویسی کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس دور میں غلام عباس کی ادبی خدمات بھرپور انداز سے جاری رہیں۔ جیسے قیام دلی کے دوران ہوا کرتی تھی، لیکن قیام دلی کے زمانے اور اس دور میں واضح فرق یہ ہے کہ قیام دلی کے دوران غلام عباس کی توجہ ترجموں، ماخوذ تحریروں، بچوں کی کہانیوں کی طرف سے ہٹ کر افسانے کی طرف آ رہی تھی، لیکن اس دور میں افسانوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے شوق سے جن

اردو یا انگریزی کتابوں کو پڑھا تھا ان کے بارے میں تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ یہ مضامین غلام عباس کے ادبی سرمائے میں ایک نیا اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔

انہیں 1953ء سے لے کر مسلسل اس دور کے آخر تک اقتصادی مسائل کا سامنا رہا مگر "جاڑے کی چاندنی" کی اشاعت و فروخت میں کامیابی اور خاص طور پر آدم جی انعام کا حصول اور "آنندی" اور "جزیرہ سخن وراں" کی دوسری اشاعت، کے بعد ان کا یہ مسئلہ بھی کسی حد تک کم ہو گیا اور اس کے بعد وہ "اردو کے مشہور افسانہ نگار" نہیں بلکہ "بزرگ" کی حیثیت سے مختلف میدانوں میں ادبی خدمات پیش کرنے لگے۔

حواشی

(1) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 2 مارچ 1948ء

(2) غلام عباس 'غلام عباس سے پینل انٹرویو' "غلام --- ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 110

(3) غلام عباس ایضاً ص 111

(4) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 111

(5) زینب عباس ایضاً ص 307

(6) ڈاکٹر تاثیر "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 10 فروری 1950ء

(7) ڈاکٹر نذیر احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 31 جنوری 1977ء

(8) زینب عباس ایضاً ص 339

(9) غلام عباس 'عرض حال'، "گوندنی والا تکیہ" لاہور 27 جولائی 1982 ص 9 تا 10

(10) غلام عباس 'غلام عباس سے پینل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 110 تا 111

(11) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 2 مارچ 1953ء

(12) غلام عباس 'Three Hours With Ghulam Abbas' (انٹرویو، ملاقات آصف اسلم) رسالہ "Herald" کراچی 10 فروری 1982ء

(13) غلام عباس 'عرض حال'، "گوندنی والا تکیہ" لاہور 1982ء ص 8

(14) غلام عباس 'غلام عباس سے پینل انٹرویو' "غلام عباس --- ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1961ء ص 111

(15) غلام عباس 'عرض حال'، "گوندنی والا تکیہ" لاہور 1982ء ص 10

(16) غلام عباس 'غلام عباس سے پینل انٹرویو' "غلام عباس --- ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 111 تا 112

(17) غلام عباس "محبت روتی ہے" دلی، جولائی 1954ء۔ یہ نسخہ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

(18) غلام عباس ایضاً ص 3

(19) غلام عباس 'غلام عباس سے پینل انٹرویو' "غلام عباس ایک مطالعہ" (از شہزاد منظر) لاہور 1991ء ص 112

(20) غلام عباس، ایضاً ص 112

(21) غلام عباس 'بنگی بائی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی فروری 1954ء

(22) غلام عباس 'ایک دردمند دل'، رسالہ "ماہ نو" کراچی اپریل 1954ء

(23) غلام عباس 'صغریٰ و کبریٰ'، رسالہ "ماہ نو" کراچی ستمبر 1954ء

(24) غلام عباس 'تمپا'، رسالہ "ماہ نو" کراچی اکتوبر 1954ء

(25) غلام عباس 'چند خطوط'، رسالہ "ماہ نو" کراچی اپریل 1955ء

(26) غلام عباس 'آپ بیتی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی مارچ 1956ء

(27) غلام عباس 'زہریلی مکھی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی نومبر 1956ء

(28) غلام عباس 'جیب کترا'، رسالہ "ماہ نو" کراچی جنوری 1957ء

(29) غلام عباس 'حاضرات'، رسالہ "ماہ نو" کراچی جنوری 1957ء

(30) غلام عباس 'بامبے والے'، رسالہ "ماہ نو" کراچی مارچ 1957ء

(31) میاں بشیر احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 4 دسمبر 1957ء

(32) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 9 جون 1958ء

(33) پطرس بخاری، ایضاً

(34) غلام عباس "بنگی بائی پر نوٹ" (غیر مطبوعہ) س ن

(35) غلام عباس 'اردو کے غیر معروف ناول "افتادِ جوانی"'، رسالہ "ماہ نو" کراچی جون ۱۹۵۵ء ص 7 تا 11

(36) غلام عباس 'اردو کے غیر معروف ناول (2)، "جنون انتظار" یعنی افسانہ مرزا رسوا رسالہ "ماہ نو" کراچی اکتوبر 1955ء

(37) غلام عباس 'انگریزی کے تین بڑے شاعر (ملٹن، جان ڈرائیڈن، الگزینڈر پوپ)' (غیر مطبوعہ) اس مسودے ۔ ۔ پر "Govt of Pakistan 1956" لکھا گیا ہے۔ اس لئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسودہ اس کے بعد لکھ . یہ مسودہ 30 لائن پر مشتمل 40 صفحات کا مضمون ہے۔

(38) غلام عباس 'ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری'، رسالہ "اردو نامہ" کراچی جون 1961ء ص ،

(39) غلام عباس 'افسانہ میری نظر میں'، رسالہ "ہم قلم" کراچی 1961ء ص 9 تا 11

(40) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 6 فروری 1953ء

(41) پطرس بخاری "پطرس کے خطوط" دہلی 1978ء ص 23

(42) پطرس بخاری، ایضاً ص 38 تا 39

(43) پطرس بخاری، ایضاً ص 40

(44) شان الحق "سید حمید کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 اپریل 1961ء۔ اس خط کا عکس غلام عباس کو بھجوا دیا گیا۔

(45) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 361 تا 362

(46) زینب عباس "Folk Tales in Pakistan" کراچی 1957ء

(47) عبدالرحمن چغتائی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) ت ن

(48) عبدالرحمن چغتائی، ایضاً۔ یہ خط (47) والے کے بعد لکھا گیا ہے مگر تاریخ درج نہیں کی گئی۔

(49) ن م راشد 'تمہید'، "جاڑے کی چاندنی" (از غلام عباس) کراچی 1960ء ص 9 تا 15

(50) زینب عباس ایضاً ص 381

(51) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 9 جولائی 1958ء

(52) مرزا ظفرالحسن 'غلام عباس' رسالہ "تالیف (ا)" کراچی 1975ء ص 139 تا 140
(53) مرزا ظفرالحسن ایضاً ص 134
(54) اس اشاعت خانہ کا نام 1960ء کی "جاڑے کی چاندنی" میں "سجاد اینڈ کامران" لکھا ہوا ہے مگر اس کے بعد کی جتنی کتابیں یہاں سے چھپی ہیں۔ ان پر "سجاد کامران" لکھا ہوا ہے۔ اس لئے یہاں "سجاد کامران" ہی لکھا جا رہا ہے۔
(55) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 25 نومبر 1955ء
(56) غلام عباس "زینب عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 25 اکتوبر 1958ء
(57) زینب عباس ایضاً ص 368
(58) سید امتیاز علی تاج "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) ت ن
(59) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) کیم اکتوبر 1957ء
(60) محمد طفیل "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 27 مئی 1959ء
(61) محمد طفیل ایضاً 17 فروری 1959ء
(62) غلام عباس "پطرس بخاری" (غیر مطبوعہ) س ن
(63) غلام عباس "محمد طفیل کے نام ایک خط" 8 جون 1959ء۔ یہ خط رسالہ "نقوش" کے پطرس نمبر میں بھی شائع ہوا۔
(64) قیوم نظر "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 5 فروری 1959ء
(65) قیوم نظر، ایضاً نومبر 9 نومبر 1959ء
(66) غلام عباس "قیوم نظر کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 21 نومبر 1959ء
(67) قیوم نظر "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 نومبر 1959ء
(68) شاہ الحق "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 مئی 1959ء
(69) غلام عباس "All India Urdu Writers Convention" (غیر مطبوعہ) 22 اپریل 1960ء
(70) 'جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ' رسالہ "سات رنگ" کراچی اکتوبر 1960ء ص 59 تا 60
(71) ڈاکٹر صفدر حسین "جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ" (برائے ریڈیو پاکستان، حیدر آباد) 25 فروری 1951ء صفدر حسین دادو کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ مسودہ کیم جون 1961ء کو غلام عباس کو پہنچایا گیا۔
(72) غلام عباس "For the Love of Her" (ترجمہ ابن سعید) رسالہ "The Cultural Scene in Pakistan" 1960ء ص 5 تا 21۔ (یہ رسالہ آدم جی انعام یافتہ کاؤناموں کا مجموعہ ہے)
(73) قرۃ العین حیدر "جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ" (غیر مطبوعہ) یہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ 20 تا 22 لائن پر مشتمل 11 صفحات کا مضمون ہے۔
(74) غلام عباس، ایضاً ص 3
(75) اسلوب احمد انصاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 26 دسمبر 1960ء
(76) غلام عباس 'اعتراف' "جزیرہ سخن وراں" (طبع دوم) کراچی 1961ء ص 5 تا 6
(77) فیض احمد فیض "Jazeera-e-Sukhanwaran" 25 دسمبر 1961ء۔ یہ مسودہ 29 لائن پر مشتمل دو صفحات کا ہے۔
(78) "Jazeera-i-Sukhanwaran" (تبصرہ) اخبار "Dawn" کراچی 18 فروری 1962ء
(79) زینب عباس ایضاً ص 384

(80) غلام عباس "ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری، رسالہ "اردو نامہ" کراچی 1961ء ص 43

(81) پطرس بخاری "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 17 جولائی 1958ء

(82) غلام عباس "آنندی) طبع دوم) لاہور 1955ء۔ پطرس کے تبصرے کا مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

(83) غلام عباس 'آنندی'، رسالہ "نقوش" افسانہ نمبر لاہور 1955ء ص 532 تا 540

(84) محمد طفیل "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) فروری 9 فروری 1955ء

(85) محمد طفیل ایضاً 21 فروری 1955ء

(86) غلام عباس "منٹو کی موت"، رسالہ "نقوش" منٹو نمبر، لاہور 1955ء ص 353 تا 354

(87) پریم ناتھ در 'غلام عباس'، رسالہ "نقوش" شخصیات نمبر، لاہور جنوری 1956ء ص 655 تا 656

(88) پریم ناتھ در ایضاً ص 658

(89) مرزا ظفر الحسن 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (1)" کراچی 1975ء ص 656

(90) ن م راشد 'غلام عباس کے نام ایک خط' (غیر مطبوعہ) 16 فروری 1942ء

(91) یہ سارے مسودے مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔

(92) غلام عباس 'سرخ جلوس'، رسالہ "نیا دور" کراچی، س ن، ص 87 تا 94 مشفق خواجہ صاحب کے پاس غلام عباس کا تصحیح کردہ شمارہ موجود ہے۔

(93) مرزا ظفر الحسن ایضاً ص 148 تا 149

3 – 3 – 1 افسانہ نگاری کا تیسرا دور اور غلام عباس کا انتقال

(1962ء تا 1982ء)

"جاڑے کی چاندنی" پر آدم جی انعام ملنے کے بعد غلام عباس کی زندگی چند مصروفیات کے باوجود آرام سے گزری۔ یعنی اس دور میں غلام عباس کو کوئی اقتصادی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نگار نہیں بلکہ اردو ادب کے اہم بزرگ کی حیثیت سے اس تخلیقی میدانوں میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس لئے اس دور میں ان کی تخلیقات سے زیادہ مضامین اور انٹرویو اخبارات یا رسائل میں چھپتے رہے۔

1962ء کی بات ہے کہ غلام عباس کے افسانہ "آنندی" کو چیکوسلواکیہ میں ادبی انعام دیا گیا، یہ فرسٹ پرائز تھا۔ اس بات سے خوشی ہونی چاہئے تھی مگر ایک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ افسانہ "آنندی" کو نذیر احمد زبیری نامی ایک شخص نے اردو سے چیک زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ نذیر احمد زبیری ہندوستانی تھا اور اس وقت چیکوسلواکیہ میں مقیم تھا، لیکن اس نے غلام عباس سے اجازت لئے بغیر یہ ترجمہ کیا۔ اس لئے غلام عباس نے دو مرتبہ انگریزی میں اس مسئلے پر احتجاجی مراسلہ لکھی۔ [1] 1963ء میں نذیر احمد زبیری کا خط غلام عباس کو ملا جس میں اجازت کے بغیر ترجمہ کرنے پر معذرت کا اظہار کیا گیا تھا اور اس کے بعد اس مسئلے کے متعلق کوئی کاغذ نظر نہیں آتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ حل کر لیا گیا تھا۔

مارچ 1963ء میں غلام عباس نے رسالہ "پھول" کا انتخاب چھپوایا۔ یہ کتاب ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے سجاد کامران پبلشرز سے شائع ہوئی۔ [2] سرورق پر ایک پرانا ترکی نقش دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی دو ہزار کاپیاں طبع ہوئیں۔ اس کتاب میں دس علمی ادبی مضامین، 23 کہانیاں، چار ڈرامے، 27 نظمیں اور چھ لطیفے موجود ہیں۔ مضامین میں پطرس بخاری، خواجہ حسن نظامی، رفیق احمد خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مرزا عظیم بیگ چغتائی اور غلام عباس وغیرہ کے مضامین

شامل ہیں اور کہانیوں میں سید امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز علی، راجندر سنگھ بیدی، شوکت تھانوی، قرۃ العین حیدر اور غلام عباس وغیرہ کی کہانیاں ہیں۔ ڈراموں میں پنڈت ہری چند اختر، سید امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، نور الٰہی، محمد عمر کے نام نظر آتے ہیں۔ نظموں میں اختر شیرانی، پطرس بخاری، تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حامد حسن قادری، چراغ حسن حسرت، ابو الاثر حفیظ، عبد المجید سالک، شوکت تھانوی، احمد ندیم قاسمی، قیوم نظر وغیرہ کی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ لطیفوں میں اختر شیرانی اور عبد القادر وغیرہ کے لطیفے ہیں۔

اس کتاب میں غلام عباس کا ایک مضمون موجود ہے۔ اس کا عنوان "عرب بچے"[3] ہے اور ان کی تین کہانیاں یعنی "ایک ٹانگ کا بادشاہ"[4] "بے چارہ سپاہی"[5] "کنول کی شہزادی"[6] شامل ہیں۔

لیکن غلام عباس شناسی کے لئے اس کتاب کی ایک اور اہمیت ہے۔ اس کتاب میں غلام عباس نے پانچ صفحات پر مشتمل دیباچہ لکھا۔ اس میں نہ صرف رسالہ "پھول" کی تاریخ کا ذکر ہے، بلکہ غلام عباس کی افسانہ نگاری کے بنیادی عناصر کو سمجھنے کے لئے اہم نکات بھی موجود ہیں، جن کا ذکر "پھول" کے دور کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ یعنی زبان کی سادگی کی اہمیت کا احساس غلام عباس کو "پھول" سے وابستہ ہونے کی وجہ سے پختہ تر ہوا تھا۔ اس پس منظر میں "پھول" کے انتخاب کی اشاعت غلام عباس کی زندگی میں ایک اہم واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔

- 1962ء یا 1963ء کے قریب زینب عباس مصوری اور موسیقی کا سکول چلا رہی تھی۔ تو چند لوگوں نے مل کر اس سکول کی مخالفت کی۔ اس واقعہ کے متعلق ستار طاہر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"غلام عباس مرحوم کی بیگم ایک سکول چلاتی تھیں جہاں بچوں کو مصوری اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ واقعہ مجھے مرحوم غلام عباس نے خود سنایا تھا کہ جب اس اسکول میں موسیقی اور مصوری کی کلاسیں شروع ہوئیں تو مختلف "مذہبی" فرقوں سے تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اس کے خلاف تحریک چلائی، دھمکیاں دیں اور فتوے صادر فرمائے۔

یہ واقعہ تھا جو غلام عباس کی ایک لازوال طویل مختصر کہانی "دھنک" کی تخلیق کا سبب بنا۔"
(7)

لیکن زینب عباس نے اس واقعہ کا ذکر اپنی آپ بیتی میں نہیں کیا۔ اس نے صرف اتنا لکھا کہ غلام عباس اس زمانے میں لمبی طنزیہ کہانی لکھ رہے تھے۔ اس نے "دھنک" کے آغاز اور اختتام کا ذکر کیا ہے۔

"Abbas was writing a satirial story that represented the nation destroyed from within by superstition and narrow mindedness. It opens with a team of Pakistani scientists landing on the moon, and closes with a group of foreigners treading the earth of a new Moenjodaro (mound of the dead). Five years later, the Americans, in fact, landed on the moon." (8)

"دھنک" 1967ء میں شائع ہوا تو اس کے دیباچے میں غلام عباس نے لکھا کہ:

"یہ افسانہ میں نے آج سے دو سال قبل لکھا تھا۔ اس وقت میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اجرام فلکی کی تسخیر کے لئے انسانی مہمات اس قدر شدت اختیار کر لیں گی کہ اگلے دو ہی برس میں انسان کا چاند پر پہنچنا ممکن ہو جائے گا۔" (9)

1967ء سے دو سال قبل کا مطلب یہ ہے کہ یہ کہانی 1965ء میں لکھی گئی مگر زینب عباس نے لکھا ہے کہ "دھنک" کی تحریر کے پانچ سال بعد واقعی انسان چاند پر اترا۔ ستمبر 1968ء میں انسان چاند پر اترا تھا۔ اس لئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ "دھنک" 1963ء سے لے کر 1965ء کے درمیان لکھی گئی۔

"پھول" کی اشاعت کے زمانے میں زینب عباس نے غلام عباس سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ بچوں کے لئے تصویری کتاب شائع کی جائے۔ یعنی بچوں کے لئے چند نظمیں غلام عباس لکھیں اور ان نظموں کے ساتھ زینب عباس کی تصاویر شامل ہوں۔ غلام عباس نے اس بات کو مان لیا مگر بہت دیر لگائی۔ آخر کار انہوں نے پچیس نظمیں لکھ ڈالیں۔ (10) اس کو ستمبر 1965ء میں "چاند تارے" کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپوایا گیا۔ (11)

1963ء کے قریب غلام عباس اور فیض احمد فیض دونوں میں بہت قریبی دوستی رہی اور دونوں کے افراد خانہ ایک دوسرے کے گھر جایا کرتے تھے۔ زینب عباس لکھتی ہیں کہ فیض کی بیگم ایلس ہی پہلی دوست تھی، جسے زینب عباس نے سب سے پہلے کھانا کھلایا۔ (12)

غلام عباس اس وقت شوق سے پرانی کتابیں خریدتے تھے اور وہ شہر کی سڑکوں پر کتابیں بیچنے والوں میں مشہور تھے۔ جب بھی وہ ان کباڑیوں کے پاس جاتے تو لوگ کہنے لگتے کہ "آ گیا چچا جی۔" (13) غلام عباس کو کتابیں جمع کرنے کا شوق اس قدر تھا کہ جب بھی زینب عباس انگلستان واپس جاتی تھیں تو زینب عباس کے ذریعے کتابوں کی فہرست انگلستان سے منگواتے تھے۔ پھر غلام عباس اس

فہرست میں نشان لگا کر زینب عباس کے پاس واپس بھجواتے تو زینب مطلوبہ کتب اپنے ساتھ لے آتی تھی۔[14] کتابیں جمع کرنے کا یہ شوق غلام عباس کے لئے صرف ذوق شوق تک محدود نہیں تھی بلکہ شاید ان کے کاروبار کا حصہ بھی تھی۔ انہوں نے اخباروں میں کتابیں بیچنے کے لئے اشتہار بھی شائع کروائے۔

"Books for sale. Books on varied subjects, including art, literature, fiction, drama, poetry, sex, etc; sets of Maupassant and Bernard Shaw available. For details contact 23-F, Block 6-PECHS, Karachi, tele. 432741 " [15]

اس میں تو شبہ نہیں کہ غلام عباس کو نایاب کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا، مگر اس اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن موضوعات کی کتابیں جمع کرتے تھے۔

1963ء کے فروری میں ن۔ م راشد نے غلام عباس کے نام ایک خط بھیجا۔ خط میں راشد نے لکھا:

"آج کل جو عشق کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کرے۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کوئی جامع الصفات عورت مل جائے تو زندگی کے باقی دن اطمینان قلب کے ساتھ بسر ہوں۔ یہ نیم اطالوی، نیم انگریزی، خدا نے صورت اور سیرت بے حد اچھی بخشی ہے ایک مدرسے میں معلم ہیں۔ دعا کرو کہ خدا اس عشق کو زندگی دے اور عمر دراز بخشے۔"[16]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ راشد غلام عباس کو کتنا قریبی دوست سمجھتے تھے اور جب بھی راشد کراچی آتے تو غلام عباس سے ضرور ملتے۔ 1963ء کے موسم گرما میں راشد کراچی واپس آئے تو غلام عباس کے گھر میں قیام کیا۔ اس وقت کو یاد کرتے ہوئے راشد نے ایک دوسرے خط میں لکھا:

"گزشتہ گرمیوں میں جو چند دن تمہارے ساتھ گزرے اکثر یاد آتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر جب سے نچلی منزل پر جاتا ہوں، جہاں کچھ روسی اور ہسپانوی دوپہر کو بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہیں تو تمہاری محبتیں بہت یاد آتی ہیں۔"[17]

اس طرح کا ذکر راشد کے ہاں بعد کے خط میں بھی نظر آتا ہے۔ 26 اکتوبر 1968ء کے خط میں راشد نے لکھا:

"--- میں خود جنوری کے پہلے ہفتے میں غالباً پیر 9 جنوری کی دوپہر کو پی آئی اے کے جہاز سے کراچی پہنچوں گا اور بچے مارچ کے وسط میں آئیں گے۔ خیال ہے کہ جنوری کا مہینہ کراچی میں گزاروں اور فروری میں لاہور چلا جاؤں۔ اگر تمہارے پاس کوئی کونا میرے قیام

کے لئے ہو تو کراچی میں تمہارے پاس ٹھہر جاؤں۔ کچھ شطرنج ہو، کچھ ادب، کچھ گفتگو اور کچھ بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کر ڈالوں۔۔۔"[18]

مگر راشد اس جنوری میں کراچی نہیں آسکے تھے۔[19] تاہم ان خطوط سے غلام عباس اور راشد کی دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

1962ء سے 1964ء تک غلام عباس کا کوئی تخلیقی نمونہ نظر نہیں آتا۔ صرف 1963ء میں "پھول" کا منتخاب شائع کرایا اور 1965ء میں "چاند تارے" کے عنوان سے بچوں کے لئے نظمیں کتابی صورت میں چھپوائیں۔ اس زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا:

"عرصہ پہلے برادرم حبیب اشعر صاحب آپ سے ایک افسانہ طلب کر چکے ہیں، مگر آپ نے لکھا تھا کہ اس وقت کوئی افسانہ آپ کے پاس موجود نہیں ہے۔ اب میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوا ہوں، اس توقع کے ساتھ کہ ممکن ہے اس دوران میں آپ نے کوئی کہانی لکھ لی ہو۔

"فنون" کی پہلی اشاعت پرسوں پوسٹ کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اگر آپ اس کی دوسری اشاعت میں شرکت فرما سکیں تو میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ اگر کہانی تیار ہو تو بے شک بذریعہ وی۔ پی۔ بھجوا دیجئے۔ مجھے آپ کی کرم فرمائی کا انتظار رہے گا۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم قاسمی"[20]

اور اس خط کے بعد بھی غلام عباس کا کوئی افسانہ کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔ یعنی 1969ء میں تیسرا افسانوی مجموعہ "کن رس" شائع ہونے تک کوئی افسانہ نظر نہیں آتا بلکہ وہ دوسری مصروفیات میں وقت صرف کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں زینب عباس "چاند تارے" کے لئے مصوری میں مصروف تھیں۔ زینب عباس نے لکھا ہے کہ یہ مصوری دو سال تک مسلسل ہوتی رہی اور 1965ء کے موسم گرما میں تکمیل کو پہنچ سکی مگر اس وقت غلام عباس کو ایک المناک صدمہ پیش آیا۔ 6 مئی 1965ء کو غلام عباس کی چھ سالہ بیٹی کوثر اپنے گھر کے نزدیک سڑک پر گاڑی کے نیچے کچلی گئی اور انتقال کر گئی۔ گھر پر زینب عباس اور فیض بیگم ایلس موجود تھیں۔ زینب عباس نے اس افسوس ناک واقعہ کے متعلق اپنی آپ بیتی میں مفصل ذکر کیا ہے۔[21] اس میں یہ واقعہ معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے زینب عباس یا غلام عباس کے جزیات کا اظہار نظر نہیں آتا۔ یعنی صدمہ اس قدر تھا کہ بیان نہیں کیا

جاسکتا۔ خود زینب عباس نے لکھا کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا۔ [22] شاید غلام عباس کو بھی ایسا احساس ہوا ہوگا۔ غلام عباس کے نام دوستوں نے خطوط بھیجے۔ راشد نے لکھا:

"ابھی ابھی یاسمین کے نام کسی سہیلی کا خط پہنچا جس میں یہ روح فرسا خبر درج تھی کہ عزیزہ کوثر گھر کے سامنے ہی کسی ٹرک کے نیچے آ کر جاں بحق ہو گئی۔ گھر میں سب لوگ یہ خبر سن کر نہایت غم زدہ ہو گئے۔ تمہیں یاد ہے کہ تمہارے سب بچوں میں سے وہی بچی زیادہ ملنسار اور محبت کرنے والی بچی تھی اور جب تم اور ہم شطرنج کھیلا کرتے تھے تو یہ متواتر آس پاس اچھلتی کودتی رہتی تھی اور اس کے چہرے پر ہر وقت نہایت دلکش ہنسی کھیلتی رہتی تھی۔ تم نے اور کرس نے یہ صدمہ کیونکر برداشت کیا ہوگا، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ موت اور خاص طور پر وہ موت جو آنکھوں کے سامنے واقع ہو، عمر بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ خدا کرے کہ تم سب کو صبر کی توفیق ارزانی ہو اور تم اس صدمے کی تاب لاسکو۔۔۔" [23]

احمد ندیم قاسمی نے بھی لمبا خط لکھا:

"۔۔۔افسوس کہ عزیزہ کوثر عباس کے ناگہانی انتقال کی خبر نہ تو مجھے یہاں کے اخباروں میں نظر آئی اور نہ کسی اور ذریعے سے معلوم ہو سکی۔۔۔ میں پچھلے دنوں پنڈی گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آپ کا اور ہاجرہ مسرور بہن کے خط اکٹھے ملے۔ بہن تو مجھے اس خط میں بین کرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے بھی عزیزہ کوثر کو دیکھا ہے، یقین نہیں آتا کہ یہ پھول سی پیاری بچی اتنی سفاکی سے کچلی جائے گی۔ میں یہ سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں کہ آپ اور کرس بھابی کا کیا عالم ہوا ہوگا اور آپ نے یہ سب کچھ کیسے برداشت کیا ہوگا اور برداشت بھی کیا ہوگا یا نہیں۔ اب میں کیسے عرض کروں کہ میں آپ کے شدید دکھ میں برابر سے شریک ہوں۔ یہ دکھ تنہا آپ کا اپنا ہے، اور ہم آپ کے دوست آپ کے چند آنسو پونچھ بھی لیں تو کیا ہم کوثر کے تصور کو آپ کے ذہن سے نکال سکیں گے؟ میں نے ایک بار ایک شعر کہا تھا۔۔۔

میں نے۔ ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستہ غم ہو جاتے

عزیزہ کوثر کو مخاطب کر کے اگر آپ یہ شعر پڑھ سکیں تو یوں میں عملاً آپ کے دکھ میں شریک ہو جاؤں گا۔ بھابی صاحبہ مضمون واحد، درد کی پوری (؟) کے ساتھ۔۔۔

آپ کا مخلص، ندیم" [24]

بچوں کی نظموں کا مجموعہ "چاند تارے" 1965ء کے موسم گرما میں شائع ہوا۔ یہ کتاب بھی "سجاد کامران" سے چھپ گئی۔ 2,000 کاپیاں طبع ہوئیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے لکھا اور انتساب ممتاز حسین کے نام ہے۔ غلام عباس نے لکھا:

"نذر بخدمت محترم ممتاز حسین صاحب

جنہیں بچوں کے ادب سے والہانہ شیفتگی ہے۔"(25)

اس کے بعد غلام عباس کا عرض حال موجود ہے۔ پھر مختلف نظمیں درج کی گئی ہیں۔ مثلاً "چاند تارے، صبح، شام، رات، ہماری گڑیا، تتلی کا خواب، بارش، چوہیا کی فریاد، قطرہ قطرہ، مسخرا گھوڑا" وغیرہ موجود ہیں اور ان کے ساتھ زینب عباس کی بنائی ہوئی تصاویر ہیں۔ زینب عباس اس سے پہلے بھی دو کتابوں کی مصوری کر چکی تھیں۔ حفیظ ہوشیارپوری اور محشر بدایونی، یہ ریڈیو پاکستان کراچی میں غلام عباس کے دوست تھے۔ ان دونوں کے شعری مجموعے سجاد کامران سے شائع ہوئے تھے تو ان کے لئے بھی زینب عباس نے تصاویر بنائیں۔ ان دونوں مجموعوں اور "چاند تارے" کی تصویروں کی وجہ سے نیشنل بک کونسل آف پاکستان نے دسمبر 1965ء میں زینب عباس کو انعام دیا۔ انعام کا نام "Illustrator's Award For 1965" تھا۔ یہ انعام دیا گیا مگر اس انعام کے ساتھ جو رقم زینب عباس کو دی جانی تھی وہ پاک و ہند کی جنگ شروع ہونے کی وجہ سے منسوخ کر دی گئی۔(26)

فروری 1966ء میں غلام عباس اور زینب عباس نے لاہور کی سیر کی۔(27) زینب عباس پہلی مرتبہ لاہور آئی تھیں۔ لاہور میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالرحمٰن چغتائی سے ملاقات ہوئی۔ اس سال غلام عباس کا بیٹا علی سجاد اپنے عزیز شہزاد کی مدد سے کینیڈا چلے گئے اور بیٹی ناہید نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے اقتصادیات کا امتحان پاس کیا جس کے بعد ان کی شادی سلطان سے ہوئی۔ اس شادی کا سارا بندوبست غلام عباس نے خود کیا۔(28) ناہید بعد میں پڑھائی کے لئے انگلستان چلی گئیں۔

غلام عباس اپنے بچوں کی ترقی سے مطمئن تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے سے یعنی 1966ء سے دوبارہ تخلیقی کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ راشد کے خط میں یوں ذکر آتا ہے:

"۔۔۔ تمہاری تازہ مصروفیتوں کا حال پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تمہارے نئے افسانے کی نقل کا انتظار رہے گا۔ بچوں کی ترقی کی رفتار سے اور بھی زیادہ خوش ہوں۔ تمہارے امور کی تدوین میں جو غیبی ہاتھ شامل ہے اس کا واقعی سب سے بڑا شکرانہ یہی ہے کہ تم باقی وقت تصنیف و تالیف میں گزارو۔"(29)

اس زمانے میں غلام عباس اور ڈاکٹر جمیل جالبی راشد کی نظموں کو چھپوانے کا اہتمام کرتے تھے۔

اس سلسلے میں راشد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھا:

"تمہارا (غلام عباس) اور جالبی صاحب کا ممنون ہوں کہ پانچوں نظموں کی صحت طباعت کی ذمہ داری تم دونوں حضرات نے اپنے سر لی ہے۔"(30)

17 اکتوبر 1966ء کے خط میں راشد نے غلام عباس کو تین تازہ نظموں "ہم کہ عشاق نہیں" "تمنا کے تار" اور "زندگی سے ڈرتے ہو؟" بھجوائیں اور راشد نے یہ بھی کہا کہ "اگر 'نیا دور' میں چھپ سکیں تو مناسب ہے۔ ورنہ (غلام عباس) اپنی مرضی سے کسی اور اچھے رسالے کو بھجوا دو۔"(31) اس زمانے کے رسالے "نیا دور" میں غلام عباس کے تین افسانے شائع ہوئے۔ اس رسالے کے "طویل کہانی نمبر" میں "کن رس"(32) پھر "کہانی نمبر" میں "سرخ جلوس"(33) اور "حواشی" طبع ہوا۔(34)

مارچ 1966ء میں رام پور (ہندوستان) سے "جزیرہ سخن وراں" شائع ہوا۔ یہ نسخہ ڈاکٹر نیر مسعود کے پاس محفوظ ہے مگر اس کا ذکر غلام عباس کے کسی انٹرویو میں نہیں۔ اس لئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کو اس طباعت کا علم نہیں تھا۔ اس نسخے میں عنوان کے ساتھ "ایک تخیلاتی طنزیہ شاہکار ناولٹ" لکھا گیا ہے۔ ناشر کتاب کار پبلی کیشنز، رام پور یو پی ہے اور مطبع کا نام دہلی پرنٹنگ پریس (رام پور) ہے۔(35)

1966ء میں غلام عباس کو حادثہ پیش آیا۔ پیدل جاتے ہوئے ایک گاڑی ان سے ٹکرا گئی۔ اگرچہ زخم بہت کاری نہیں تھا لیکن پیٹھ زخمی ہونے کی وجہ سے انہیں چند مہینے بستر پر لیٹنا پڑا۔ انہی دنوں غلام عباس کو پاکستان کے صدر ایوب خاں کی تصنیف "Friends Not Masters" کا اردو میں ترجمہ کرنے کی پیشکش ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام الطاف گوہر کی طرف سے غلام عباس کو تفویض ہوا۔ الطاف گوہر اس وقت حکومت پاکستان کے وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری تھے۔ الطاف گوہر کے ایک خط کی عبارت یہ ہے:

"جناب صدر نے اردو ترجمے کے ابتدائی 75 صفحات دیکھ لئے ہیں اور انہیں پسند کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ نے عمدگی سے ان کے خیالات کو اردو میں منتقل کیا ہے اس کے لئے ان کے جذبات تشکر و امتنان آپ تک پہنچا دوں۔ میں آج کل ترجمے کو دیکھ رہا ہوں اور چند روز بعد آپ کو مطلع کروں گا۔ اس اثنا میں آپ بقیہ ترجمہ جلد از جلد مجھے دے دیں۔"(36)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ 1966ء سے لے کر 1967ء کے درمیان میں کیا گیا۔ اس اردو ترجمے کا عنوان "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" رکھا گیا اور یہ کتاب 1967ء میں

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی سے شائع ہوئی اور ایوب خاں نے بھی اس ترجمے کو پڑھ کر پسند کیا تھا۔ غلام عباس نے خود اس ترجمے کے متعلق کہا:

"میں نے اس میں افسانوی زبان استعمال کی ہے۔"(37)

اس ترجمے کی وجہ سے غلام عباس کا تخلیقی عمل تھوڑی دیر کے لئے معطل رہا۔ دراصل غلام عباس کے لئے یہ ترجمہ مفید تھا چونکہ وہ عرصے سے سرکاری ملازمت کو چھوڑ دینا چاہتے تھے لیکن چھوڑ نہیں سکے تھے، اب صدر پاکستان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا غلام عباس کے لئے سرکاری ملازمت چھوڑنے کا ایک بڑا بہانہ بن سکتا تھا اور پنشن حاصل کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ زینب عباس نے لکھا ہے:

"When in 1967 the translation of Ayub's book was offered to Abbas it was good reason to put into effect his retirement from Government service which he had long looked forward to. He had earlier drawn from his pension fund to pay off debts and would now get a meagre Rs.600 per month. Rs200 more than I received as salary at my college." (38)

اس ترجمے کے بعد غلام عباس کی مسلسل ادبی خدمات پر حکومت پاکستان کی جانب سے "ستارہ امتیاز" دیا گیا۔ یہ 14 اگست 1968ء کی بات ہے۔ غلام عباس کو حکومت پاکستان کی طرف سے ایک خط بھیجا گیا:

"CABINET

Government of Pakistan
Secretariat
(Establishment Division)
Rawalpindi
August 14, 1968

Sir;

1- I am directed to inform you that the President of Pakistan has been graciously pleased to confer the award

of SITARA-I-IMTIAZ on you on the occasion of Independent Day 1968. This Honour has been published in the Gazette of Pakistan, extraordinary, dated August 14, 1968.

2- The conferment of this Honour entitles you to use the abbreviation "S.I." after your name.

3- The medallion of this award will be presented to you in due course.

Your obedient Servant

(M.H.Sufi)

Secretary of the Government of Pakistan

Mr. Ghulam Abbas, S.I.,
Journalist and Story Writer,
5/7-H, PECH Society Ltd.,
Karachi, 29" (39)

غلام عباس نے اس کے جواب میں لکھا اور تقسیم انعامات کے موقع پر بیگم زینب عباس کو بھی لے جانے کی اجازت مانگی:

"Dear Sir,

I was happy to receive the invitation to the investitue to be held at the President's House, Karachi, on the 27th October, 1968, which I shall be happy to attend.

I would request you to kindly send invitation to my wife Mrs. Zainab Abbas whom I wish to accompany me on this occasion." (40)

"ستارہ امتیاز" کے حصول پر غلام عباس کے نام دوستوں کے خطوط پہنچے۔ الطاف گوہر، خواجہ شہاب الدین، یوسف ظفر، ن۔ م راشد کے خطوط کا عکس اب بھی مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے۔

(41)

اس انعام کے حصول کے چند سال بعد غلام عباس نے زینب عباس سے کہا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو اس انعام کا میڈل میرے انتقال کے بعد ذاکرہ کو دیا جائے۔" زینب عباس نے غلام عباس کا یہ کہا مان لیا۔ (42)

1967ء میں غلام عباس کو سرکاری ملازمت سے فارغ ہو کر پنشن ملنے لگی۔ ایوب خاں کی تصنیف کا ترجمہ کرنے کے بعد غلام عباس اپنا افسانوی مجموعہ "کن رس" چھپوانے کو تیاری کرنے لگے۔

1968ء میں "جاڑے کی چاندنی" اور "آنندی" نامی مجموعے دوبارہ شائع ہوئے۔ "جاڑے کی چاندنی" سجاد کامران سے شائع ہوا۔ یہ اس مجموعے کی دوسری اشاعت تھی اور ایک ہزار کاپیاں چھپیں۔ "آنندی" اس سے پہلے دو مرتبہ یعنی 1948ء اور 1955ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ کے نسخے میں "طبع جدید" لکھا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کی تعداد معلوم نہیں۔ اس نسخے کی مختلف کاپیاں ہیں۔ ایک ہارڈ کور اور ایک پیپر بیک۔ پیپر بیک کی تین اقسام ہیں۔ ایک کے کاغذ کا بنیادی رنگ سفید ہے، دوسری کا نیلا، تیسری کا زرد رنگ ہے اور یہ قدیم طباعت کا عکس نہیں ہے بلکہ از سر نو کتابت کروائی گئی ہے۔ طبع دوم کے ایک صفحے میں 15 سطریں ہیں مگر طبع جدید کے صفحے میں 20 سطریں ہیں۔ بہرحال اس طرح غلام عباس کے پرانے مجموعے دوبارہ شائع ہوئے۔

غلام عباس کا تیسرا مجموعہ "کن رس" سجاد کامران سے نہیں بلکہ لاہور کے ایک نئے اشاعتی ادارے "المثال" سے شائع ہوا، جو مشہور شاعر منیر نیازی نے قائم کیا تھا۔ "کن رس" کو المثال سے شائع کرانے کی دو وجوہ نظر آتی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت غلام عباس ن۔ م راشد کا شعری مجموعہ "لا=انسان" چھپوانے کی کوشش کر رہے تھے، اس اثنا میں انہوں نے اپنا مجموعہ بھی المثال سے شائع کرانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ راشد نے 23 جولائی 1968ء کو تہران سے "لا=انسان" کا مسودہ غلام عباس کے نام بھجوا دیا۔ راشد نے خط میں لکھا:

"۔۔ "لا=انسان" کا مسودہ آج رجسٹرڈ ڈاک سے تمہارے نام بھجوا دیا ہے۔ اگر اس مجموعے کے ساتھ میری تصویر بھی شامل کرنا چاہو (میں کیا اور میری تصویر کیا؟) تو جمیل جالبی کے پاس نسبتاً اچھی تصویر ہے، وہ اگر بغیر حاشئے پورے صفحے پر شائع ہو جائے تو مناسب ہو گا۔

اگر تم ایک ہی سائز پر "ماورا" اور "ایران میں اجنبی" بھی شائع کر سکو تو ایک سیریز میں تین

کتابیں دستیاب ہونے لگیں گی۔ اس وقت مؤخرالذکر دونوں کتابیں نایاب ہیں اور اکثر ان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ہمت کرو عباس! تینوں مجموعے ایک ہی سائز ایک ہی طرح کی جلد اور کاغذ کتابت وغیرہ کے ساتھ شائع کر ڈالو۔۔۔" (43)

راشد کے کہنے کے مطابق غلام عباس نے مختلف لوگوں سے معلوم کیا ہو گا۔ پھر راشد نے اس کے بعد بھی کتاب کی اشاعت کے بارے میں 3 اگست اور 20 اگست کو غلام عباس کے نام خط بھیجا۔ (44) بالآخر غلام عباس نے منیر نیازی سے رابطہ قائم کیا اور منیر نیازی کے ادارے "المثال" سے راشد کے تینوں مجموعوں کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ راشد نے بھی اس فیصلے کو مان لیا۔ راشد نے غلام عباس کے نام 23 ستمبر 1968ء کے خط میں لکھا:

"منیر نیازی (المثال لاہور) نے تینوں کتابوں کی رائلٹی 16% کے حساب سے ادا کر دی ہے۔ "ماورا" اور "ایران میں اجنبی" کی قیمت ساڑھے سات سات روپے رکھی ہے اور "لا=انسان" کی بارہ روپے۔

تمہاری مہربانی ہو گی اگر تم جلد از جلد "لا=انسان" کا مسودہ اس پتے پر ارسال کر دو۔ رجسٹرڈ ایئر میل ہو تو اچھا ہے۔

مسودہ میں سے "سال گرہ کی رات" نکال لو اور صفحوں اور فہرست کی ترتیب نئے سرے سے کر دو۔ اب اس میں انتالیس نظمیں رہ جانی چاہئیں۔

گھر میں سلام دعا

صفحات کی تعداد = 102

نظموں کی تعداد = 39

"حرف ناگفتہ" اور "سال گرہ کی رات" نکال دی گئیں۔

"وہی کشف ذات کی آرزو" اور "رات خیالوں میں گم" شامل کر دی گئیں۔" (45)

اس کے نتیجے میں ن۔ م راشد کے تین مجموعے شائع ہوئے، تو آگے 1969ء میں غلام عباس نے اسی "المثال" سے اپنے تیسرے مجموعے "کن رس" کو چھپوا دیا چونکہ راشد کے تینوں مجموعوں کی چھپائی نہایت عمدہ تھی۔ اس لئے غلام عباس نے سوچا ہو گا کہ اس انداز میں "کن رس" بھی چھپ جائے تو بہتر ہو گا۔ غلام عباس نے منیر نیازی سے اپنے مجموعے کے متعلق دوبارہ رابطہ قائم کیا تو 7 جون 1969 کو منیر نیازی نے خط لکھا:

"آپ اپنے افسانوں کا مجموعہ تیار کیجئے اور براہ مہربانی مجھے شرائط سے آگاہ کیجئے۔" (46)

پھر غلام عباس نے منیر نیازی کو افسانوں کا مسودہ بھیجا تو منیر نیازی نے 18 دسمبر 1969ء کو جواب دیا۔

"(آپ کا نام، کتاب کا نام) آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ابھی تک نہیں ملا۔ جلد کیجئے، آپ کی کتاب تقریباً کمپوز ہو چکی ہے۔۔۔"(47)

پھر منیر نیازی نے 27 فروری 1970ء کے خط میں لکھا:

"۔۔۔ آپ کی کتاب تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔۔۔"(48)

مجموعہ "کن رس" میں سنہ اشاعت کی جگہ "دسمبر 1969ء" لکھا ہوا ہے مگر دراصل اس مجموعہ 1970ء میں تیار ہو گیا۔ اس کتاب کی تعداد ایک ہزار تھی۔ بہرحال ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ "کن رس" کی اشاعت ن۔ م راشد کے مجموعوں کی اشاعت سے متعلق ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب سے "کن رس" کو سجاد کامران کی بجائے الشال سے چھپوانے کی دوسری وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ 1969ء میں غلام عباس کا ناولٹ "دھنک" شائع ہوا اور یہ سجاد کامران سے چھپ گیا تو کیوں یہ ناولٹ بھی الشال سے شائع نہیں کرایا گیا؟

ناولٹ "دھنک" 1963ء سے لے کر 1965ء کے درمیان لکھا گیا اور یہ ناولٹ 1967ء سے 1968ء کے درمیان لاہور کے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا تو اس وقت کچھ ہنگامہ سا برپا ہوا چونکہ اس ناولٹ میں مذہبی فرقہ بندی پر طنز کی گئی تھی، اس لئے بعض لوگ کہنے لگے کہ غلام عباس مذہب کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر رسالہ "آئین" میں تفصیل سے نظر آتا ہے:

"۔۔۔ "ترقی پسند مصنفین" کے دور کے معروف افسانہ نگار غلام عباس بھی کہ پہلے "آنندی" کی وجہ سے مشہور تھے اور اب فرینڈز ناٹ ماسٹرز کے اردو مترجم کی حیثیت سے شہرت پائی ہے، لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ایسا تازہ افسانہ حلقہ میں پڑھنا چاہتے تھے، حلقے کا پروگرام اگرچہ پہلے سے طے ہوتا ہے تاہم اس اتوار کے پروگرام میں ان کا افسانہ بھی شامل کرایا گیا۔۔۔ آخر غلام عباس نے اپنا تازہ افسانہ "دھنک" پڑھا۔ افسانے پر جو تنقید ہوئی اسے سن کر اور بحث کے منظر کو دیکھ کر کم از کم احساس ہی ہوا کہ افسانہ معرکہ الآراء سے کسی طرح بھی کم نہیں۔۔۔ طویل افسانے کے خاتمے پر افسانہ نگار نے نہایت فاتحانہ انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا۔۔۔ اور پھر عابد حسن منٹو نے حاضرین کو تنقید کی دعوت دی۔ اکبر لاہوری نے کہا:

"یہ افسانہ بھارت میں بہت مقبول ہوگا۔" عبدالقادر حسن نے کہا "اسے محکمہ اطلاعات بھی

بصد مسرت چھپوا کر تقسیم کرے گا۔" عزیز الدین احمد نے کہا "یہ افسانہ ملک کے ایک مخصوص گروہ یعنی جماعت اسلامی کے نظریات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی بر سر اقتدار آگئی تو نتیجہ ملک کی مکمل تباہی ہو گا۔ اس لحاظ سے افسانہ بہت اچھا اور کامیاب ہے"۔۔۔ اکبر لاہوری نے سوال اٹھایا:
"اگر یہ افسانہ کسی غیر مسلم کا لکھا ہوتا تب ہمارا رد عمل کیا ہوتا۔ پھر انہوں نے کہا "افسانہ نگار نے صریحاً زیادتی کی ہے اور اعلانیہ اسلام کے اصولوں پر حملے کئے ہیں"۔۔۔ عابد حسن منٹو نے پھر اپنی بات شروع کی اور کہا "ہمارے ہاں بعض لوگ اسلام کو ایک اونٹ کی طرح خیال کرتے ہیں جس کی نکیل وہ جدھر چاہیں پکڑ کر لے جانا چاہتے ہیں۔" اس موقع پر ان کی تقریر میں کئی طرف سے مداخلت شروع ہو گئی۔ بہت سے لوگ بولنے لگے۔ اجلاس کا یہ رنگ دیکھ کر حلقے کے ذمہ دار اصحاب نے محسوس کیا کہ اب اجلاس برخاست کر دینے میں ہی مصلحت ہے، چنانچہ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ مختلف اطراف سے باتیں جاری تھیں۔ خود صدر صاحب نے بھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ وہ بڑے جوش و خروش میں بول رہے تھے۔۔۔ غلام عباس (افسانہ نگار موصوف) نے باہر آتے ہوئے کہا "نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے۔۔۔ میں دراصل یہ افسانہ پڑھ کر اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔" اور رد عمل کا انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کا اعتراض یوں سامنے آیا کہ انہوں نے دوستوں کو یقین دلایا کہ میں افسانہ چھپواؤں گا نہیں۔۔۔ اور یہ کہ "اس کا ذکر کالموں میں نہ ہی آئے تو بہتر ہے۔"(49)

دراصل اس ناولٹ کا موضوع فرقہ بندی پر طنز تھا، مذہب پر طنز نہیں۔ اس کے بارے میں غلام عباس نے خود "دھنک" کے "عرض حال" میں اپنا اظہار خیال کیا:
"حکیم الامت علامہ اقبال کی تعلیمات کے زیر اثر میں نے خود کو کبھی کسی فرقے سے وابستہ نہیں کیا بلکہ امت اسلامیہ کا ایک فرد سمجھا ہے۔ اپنی اس حیثیت سے میں نے ملت کے مستقبل کے بارے میں جو خدشات محسوس کئے، ان کا اظہار ایک افسانے کے پیرائے میں کیا ہے کہ یہی میرا فن ہے۔
حضرت علامہ اقبال نے غیر منقسم ہندوستان میں اہل وطن کی بے حسی، نااتفاقی اور فرقہ بندی کو دیکھتے ہوئے انہیں خبردار کیا تھا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

میں نے بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اتنا اور عرض کرنا ہے کہ اس افسانے میں مسلمانوں کے کسی خاص فرقے یا جماعت یا کسی خاص شخصیت کو ہدف نہیں بنایا گیا اور اگر کہیں مماثلت نظر آئے تو اسے محض اتفاقیہ سمجھا جائے۔"(50)

اس عرض حال کے آخر میں یکم جون 1969ء کی تاریخ دی گئی ہے اور جیسے ذکر ہو چکا ہے کہ منیر نیازی نے "کن رس" کے مسودہ بھجوانے کے سلسلے میں 7 جون 1969ء کو غلام عباس کے نام خط لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلام عباس نے "دھنک" کا عرض حال لکھتے ہوئے یہ بھی سوچا کہ افسانوں کا مجموعہ دوسرے اشاعت خانے سے چھپوایا جائے۔ چونکہ اس ناولٹ کے موضوع کے متعلق بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا اور اس لئے شائع کرانے میں مشکل پیش آئی تھی۔ ستارہ طاہر نے بھی لکھا:

"---"دھنک" غلام عباس مرحوم کی وہ کہانی ہے جسے اردو زبان کا کوئی رسالہ شائع کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا تھا۔"(51)

شاید اس لئے غلام عباس کو یہ فکر ہوئی ہو گی کہ اس ناولٹ کو چھپوانے سے مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر "دھنک" اور "کن رس" دونوں کو سجاد کامران سے شائع کیا جائے اور "دھنک" کی اشاعت کی وجہ سے سجاد کامران کا سارا کاروبار بند ہو جائے تو مجموعہ "کن رس" کو بھی شائع کرنا مشکل ہو سکتا ہے اور اگر "کن رس" کو سجاد کامران سے "دھنک" کو دوسرے اشاعت خانے سے چھپوایا جائے تو دوسرے اشاعت خانے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اگر نقصان ہو تو اپنے یہاں ہو۔ مجموعے "کن رس" کو دوسری جگہ سے چھپوایا جائے اور "دھنک" کو اپنے یہاں سے شائع کرنا مناسب ہو گا۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

بہرحال ناولٹ "دھنک" اور مجموعہ "کن رس" ایک ہی وقت میں چھپ گئے۔ "کن رس" کی اشاعت کے بارے میں غلام عباس مطمئن تھے چنانچہ راشد کے خط میں یہ ذکر موجود ہے:

"میں خوش ہوں کہ تمہیں کتابوں کی چھپائی پسند آئی۔ صرف وہم ہے کہ منیر نیازی کے پاس کتابوں کو بازار تک پہنچانے کے ذرائع محدود ہیں۔"(52)

"دھنک" کی اشاعت کے بارے میں راشد نے خط میں لکھا:

"---"دھنک" کے انتساب کی تجویز پر یقیناً میں بہت خوش ہوا۔ اس طرح تمہارے ایک اور گناہ میں شریک ہونے کا موقع مل جائے گا۔"(53)

یعنی راشد بھی غلام عباس کے نقطۂ نظر سے متفق تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے دوسرے انداز میں

خط لکھا:

"--- تم نے ایک کہانی چاند پر پہنچنے کے متعلق مجھے سنائی تھی، کیا وہ چھپ گئی؟--- یعنی کیا وہ اپالو ۱۱ کی چاند پر لنگر انداز سے پہلے چھپی یا بعد میں؟---"(54)

"دھنک" میں علامتی طور پر مستقبل کی دنیا کو پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ کہانی سائنس فکشن کے قریب نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس لئے یہ خط لکھا کہ یہ کہانی وقت کے عین مطابق تھی۔ اس لئے انسان کے چاند پر اترنے سے پہلے شائع ہونے سے بحیثیت سائنس فکشن مزید دلچسپ ہو سکتی تھی۔

اگست 1969ء میں غلام عباس نے ایک اور مکان خرید لیا۔ یہ پہلے مکان کے قریب واقعہ تھا۔ یعنی پیدل پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ پہلے مکان میں ذاکرہ اور اس کے بچے اور نئے مکان میں زینب عباس اور اس کے بچے رہنے لگے۔(55) اس کا پتہ یہ ہے:

"72-M. Block, PECHS "Karachi-29"

17 اکتوبر 1969ء کو غلام عباس کی والدہ انتقال کر گئیں۔(56) والدہ کی عمر معلوم نہیں۔ اس واقعہ پر ن۔م راشد نے غم کا اظہار اپنے خط میں کیا:

"تمہارا 19 اکتوبر کا خط ملا۔ اماں جان کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ دلی کے زمانے سے لے کر اب تک وہ جس محبت اور شفقت کے ساتھ مجھ سے پیش آتی رہیں وہ ہمیشہ یاد رہے گی--- یہ ایک بے مایہ تسلی ہے، لیکن ان کا نہایت سکون کے ساتھ اور جمعہ کے دن انتقال کرنا ان کے اطمینان قلب اور نیک دلی کی دلیل سمجھنا چاہئے۔"(57)

"دھنک" اور "کن رس" کی اشاعت کے بعد غلام عباس کی تخلیقات کی تعداد کم نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اب عباس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔

اب عباس نے کبھی کبھار مختلف رسائل میں افسانے لکھے مگر ان کی تعداد صرف پانچ ہے بلکہ 1970ء کے بعد غلام عباس کے انٹرویوز مختلف رسائل میں شائع ہونے لگے۔ یعنی اب وہ اردو ادب کے ایک بزرگ کی حیثیت سے جدید اردو ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

مجموعہ "کن رس" بھی پسند کیا گیا۔ 19 جولائی 1970ء کے اخبار "The Pakistan Times" میں "A Great Fiction Writer" کے عنوان سے "کن رس" اور غلام عباس کی افسانہ نگاری پر تبصرہ شائع ہوا(58) اور افسانہ "کن رس" کی 1974ء یا 1975ء میں ٹی وی پر ڈرامائی تشکیل کی گئی۔ یہ ڈرامائی تشکیل امجد اسلام امجد نے کی تھی۔ ن۔م

راشد نے غلام عباس کے نام ایک خط میں "کن رس" کے بارے میں لکھا:

"۔۔۔ منیر نیازی کے توسط سے "کن رس" پہنچ گئی۔ افسانے دو تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ خدا تمہیں زندہ رکھے اور مزید لکھنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ اس مجموعے کے افسانے "جاڑے کی چاندنی" کے افسانوں سے بہتر ہیں۔ ان میں تمہارا اسلوب بیان اور نکھرا نظر آتا ہے اور زندگی کی ترجمانی ہشت پہلو ہو گئی ہے۔" (59)

"دھنک" پر بھی تبصرہ شائع ہوا۔ نومبر 1971ء کے رسالہ "کتاب" میں ستار طاہر نے غلام عباس کا افسانہ "دھنک" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ (60)

اس طرح اس زمانے میں ہندوستان میں افسانہ "آنندی" سے ماخوذ "منڈی" نامی ایک فلم بنائی گئی اور پاکستان میں "گوندنی والا تکیہ" ٹی وی پر دکھایا گیا۔ غلام عباس شناسی کے لئے ایک اور دلچسپ چیز اس زمانے میں بنائی گئی۔ یہ ایک کیسٹ ٹیپ ہے، جس میں غلام عباس نے خود افسانے "غازی مرد، اوورکوٹ اور آنندی" پڑھ کر ریکارڈ کرائے۔ یہ کیسٹ ٹیپ ای ایم آئی نامی کمپنی سے "کرنیں، اردو کے منفرد افسانہ نگار غلام عباس کے تین شاہکار افسانے خود ان کی زبانی" کے عنوان سے جاری کیا گیا تھا۔ (61)

"1971ء کے منتخب افسانے" نامی کتاب میں غلام عباس کا ایک افسانہ "نواب صاحب کا بنگلہ" شامل ہے (62) مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ افسانہ اس انتخاب میں شامل کیا جانے سے پہلے کہاں چھپا تھا۔

1971ء میں اشفاق احمد نے غلام عباس کو خط لکھا:

"حال ہی میں ہم نے آر۔ سی۔ ڈی ثقافتی ادارہ مغربی پاکستان شاخ کی جانب سے ممبر ممالک کے جدید ادب کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا پروگرام وضع کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ہم جدید اردو افسانوں کا ایک انتخاب مرتب کر رہے ہیں جسے بعد میں فارسی اور ترکی زبانوں میں منتقل کیا جائے گا۔

اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے ثقافتی ادارے کی مغربی پاکستان شاخ میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی اور شرکائے مجلس نے جن افسانہ نویسوں کی تخلیقات کو اس مجموعے میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس میں آپ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔۔۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس مجموعے کی ضخامت کے پیش نظر اپنے مطبوعہ یا مطبوعہ افسانوں میں سے کوئی سے تین ایسے افسانے منتخب کر کے ہمیں بھیج دیجئے جو عام کتاب کے ساتھ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوں، ان میں سے ایک افسانہ شامل اشاعت کر لیا جائے گا۔۔۔" (63)

اس طرح 1972ء میں افسانہ "اوورکوٹ" جاپانی میں ترجمہ ہوا اور رسالہ "ہندوستانی ادب" میں

شائع ہوا۔ یہ ترجمہ آسادہ پوتاکا نے کیا۔[64]

1972ء اور 1973ء میں غلام عباس کا کوئی تخلیقی کام دستیاب نہیں۔ اس زمانے کے بارے میں زینب عباس نے لکھا ہے کہ غلام عباس اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس زمانے میں کمانڈر انور اور کیپٹن عنایت حسین غلام عباس کے عزیز دوست تھے اور تینوں مل کر شطرنج کھیلتے تھے۔[65] "کمانڈر انور" اردو کے مشہور افسانہ نگار سید انور کا نام ہے۔ یہ دونوں غلام عباس کی آخری عمر تک ان کے قریبی دوست رہے۔

غلام عباس کون۔ م راشد نے شطرنج کھیلنا سکھایا تھا اور 1960ء کے قریب یہ دونوں قریب رہتے تھے اور شوق سے شطرنج کھیلتے تھے۔ ن۔ م راشد 9 اکتوبر 1975ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔ غلام عباس کے نام راشد کا آخری خط 27 جنوری 1975ء کا ہے۔ (یہ ممکن ہے کہ اس کے بعد راشد نے خط لکھا ہو مگر اس وقت یہی آخری خط دستیاب ہے) اس میں راشد نے غلام عباس کو لندن آنے کی دعوت دی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔[66]

رسالہ "نیا دور" کے "ن۔ م راشد نمبر" میں غلام عباس نے "راشد چند یادیں" نامی مضمون پیش کیا۔[67] اس مضمون کے آخر میں غلام عباس نے راشد کے ساتھ جو خط و کتابت رہی اس کے بارے میں لکھا:

"راشد خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں بڑے مستعد تھے۔ ہماری دوستی کی اس طویل مدت کے دوران انہوں نے بے شمار خط لکھے جو محبت، یگانگت اور خلوص سے بھرے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے ان کی بے باک طرز نگارش اور اعلیٰ انشاء پردازی کا رنگ بھی بخوبی جھلکتا تھا۔"[68]

غلام عباس کا یہ قول کوئی مبالغہ نہیں اور یقیناً راشد کے ساتھ یہ دوستی غلام عباس کے لئے زندگی کی اچھی یادگار رہی ہوگی۔

1974ء یا 1975ء میں جب امجد اسلام امجد کا نیا شعری مجموعہ شائع ہوا تو غلام عباس نے اس کتاب کے اجراء کے موقع پر منعقد ہونے والی تقریب کی صدارت کی اور امجد اسلام امجد پر ایک مضمون پڑھا۔

1974ء میں صلاح الدین محمود نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا۔ اس وقت صلاح الدین محمود رسالہ "سویرا" کے مدیر تھے۔ انہوں نے غلام عباس کی کسی تحریر کو چھاپنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔[69]

مارچ 1976ء میں فیض احمد فیض نے غلام عباس کے نام خط میں لکھا کہ قائداعظم کے بارے میں

کوئی مضمون لکھیں۔ فیض نے لکھا:

"قائداعظم کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں وزارت تعلیم والے بچوں کے لئے قائداعظم پر ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں، میں نے تجویز کیا تھا کہ اس کتاب کا ایک باب آپ کے سپرد کیا جائے جس کے لئے آپ کوئی موضوع منتخب کرلیں۔۔۔ اس سے متعلق وزارت کی جانب سے ایک خط ملفوف ہے۔ اگر آپ کو تجویز پسند ہو تو مسٹر نذیر احمد کو براہ راست مطلع کردیں اور ان سے معاوضہ وغیرہ بھی طے کرلیں۔"(70)

مگر یہ معلوم نہیں کہ غلام عباس نے یہ کام کیا یا نہیں۔

اسی طرح 1976ء میں غلام عباس کے بچپن کے ایک اور دوست عبدالرحمٰن چغتائی کا انتقال ہوا۔ عبدالرحمٰن چغتائی کی یاد میں مجلس ترقی ادب لاہور نے ایک کتاب چھپوانے کا فیصلہ کیا تو غلام عباس نے آغا عبدالحمید کے ساتھ گفتگو کرکے اسے اشاعت کے لئے دیا۔(71) اس مکالمے میں 1924ء کے لاہور کے نوجوان ادباء کا ذکر اور چغتائی کی افسانہ نگاری، مصوری اور تصویر فن پر بحث ہوئی ہے۔ مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر احمد ندیم قاسمی نے اپنے خط میں غلام عباس کا شکریہ ادا کیا۔

"چغتائی مرحوم کے بارے میں اپنا اور آغا عبدالحمید صاحب کا مکالمہ بھجوا کر آپ نے بڑا کرم کیا۔ اس مکالمے سے چغتائی صاحب سے متعلق کتاب میں ایک گہما گہمی سی پیدا ہو جائے گی۔۔۔"(72)

اس زمانے میں غلام عباس کے تین افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ رسالہ "نیا دور" میں افسانہ 'رینگنے والے'،(73) اور 'اوتار'،(74) طبع ہوئے اور افسانہ 'رینگنے والے' رسالہ "جریدہ پشاور" میں بھی چھپ گیا۔(75) اس افسانے کے عنوان کے حوالے سے صہبا لکھنوی نے لکھا کہ اس نام سے غلام عباس کا نیا افسانوی مجموعہ زیر ترتیب ہے۔(76) شہزاد منظر نے یہاں تک لکھا کہ اس عرصے (1969ء سے 1981ء تک) میں انہوں نے تقریباً ایک درجن افسانے لکھے جو ان کے آخری مجموعے "رینگنے والے" (مطبوعہ 1981ء) میں شامل ہیں۔(77) شہزاد منظر نے یہ جملہ اس لئے لکھا کہ جب 1980ء میں انہوں نے غلام عباس سے ملاقات کی تو غلام عباس نے کہا کہ "میری زیر ترتیب کتاب کا نام "رینگنے والے" ہے۔ مذکورہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔"(78)

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریر کتابی صورت میں نہیں آئی۔ اس لئے یہ بات غلط ہے کہ "رینگنے والے" نامی مجموعہ شائع ہوا۔

اس طرح افسانہ "روحی" رسالہ "تخلیقی ادب" میں شائع ہوا(79) اور "خاندانی معاملے" نامی افسانہ بھی شائع ہوا۔(80)

31 جنوری 1977ء کو ڈاکٹر نذیر احمد نے غلام عباس کے نام خط لکھا۔ اس میں لکھا گیا ہے:

"میں نے "سرخ جلوس" والا افسانہ پیکیجز (کراچی) اخبار کے لئے انتخاب کیا ہے۔ "ہیر کٹنگ سیلون" زیادہ حسب حال تھا لیکن اس میں جو منشی جی کا کردار ہے وہ ہمارے Account Deptt. کے سربراہ سے اتنا ملتا جلتا ہے کہ اسے چھاپنے سے ہمہ جہت ناراضگی کا خطرہ تھا۔"(81)

جب افسانہ "رینگنے والے" پشاور کے رسالے "جریدہ پشاور" میں چھپا تو اسی زمانے میں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے رسالے میں اس افسانے کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا اور ترجمے کے ساتھ مترجم کا تبصرہ بھی پیش کیا گیا۔(82)

اگست 1977ء میں فیض احمد فیض نے غلام عباس کے نام ایک خط لکھا کہ:

"لندن کے پاکستانی سفارت خانے میں ایک دوست اور عزیز خالد حسن صاحب پریس کونسلر ہیں، ممکن ہے ان کی آپ سے بھی شناسائی ہو۔ کچھ عرصے پہلے لندن میں ایک ملاقات کے دوران انہوں نے ذکر کیا تھا کہ وہ پاکستانی اردو افسانوں کا ایک انتخاب انگریزی زبان میں مرتب کرنا چاہتے ہیں جو لندن میں طبع کرایا جاسکے تاکہ یورپ اور امریکہ کے پڑھنے والے ہمارے افسانوی ادب سے روشناس ہوسکیں۔ اس سلسلے میں ان کا لندن سے خط آیا ہے جس میں وہ آپ کے کچھ افسانوں کو انتخاب میں شامل کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ خط کی نقل ملفوظ ہے۔

یہ کتاب وہ کسی ادارے کی جانب سے نہیں بلکہ اپنے خرچ سے چھپوا رہے ہیں۔ اس لئے غالباً وہ کوئی معاوضہ پیش نہیں کر سکیں گے۔ کم از کم ان کے خط میں اس کا ذکر نہیں بہرصورت میں اپنی جانب سے درخواست کروں گا کہ اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو اپنی رضامندی کے دو حروف مجھے بھجوا دیں، کرم ہو گا۔"(83)

خالد حسن کی یہ کتاب 1983ء میں دلی سے شائع ہوئی (84) اور اس میں غلام عباس کے دو افسانوں کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ ایک "White Man's Burden" ہے۔ جس کو خالد حسن نے ترجمہ کیا۔(85) دوسرا "The Overooat" ہے جس کی مترجم زینب عباس ہیں، (86) لیکن اس کتاب میں صرف انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ اس کے اردو متن کا نام نہیں دیا گیا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ "White Man's Burden" کون سا افسانہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ "White Man's Burden" اس وقت غلام عباس کا تازہ ترین افسانہ تھا یا کوئی ایسا افسانہ تھا جسے پہلے لکھا جا چکا تھا مگر دیر تک غیر مطبوعہ رہا۔ اس طرح 1978ء میں آسادہ یوتاکا نے

"آنندی" کا ترجمہ جاپانی میں کیا۔ (87) یہ رسالہ "ہندوستانی ادب" میں شائع ہوا۔
1980ء میں اطہر پرویز کی مرتب کردہ کتاب "اردو کے 13 افسانے" میں غلام عباس کا افسانہ "آنندی" شامل کیا گیا۔ (88) اطہر پرویز نے اس سلسلے میں غلام عباس کو خط لکھا:

"---میں نے پچھلے دنوں اردو کا ایک افسانوی انتخاب مرتب کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد "اردو کے 13 افسانے" شائع ہو چکی ہے۔ اس میں آپ کا مشہور افسانہ "آنندی" شامل ہے۔ ہم نے اس کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی، امید ہے کہ ملی ہو گی۔" (89)

1977ء میں غلام عباس کے بیٹے علی سجاد نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی اور علی سجاد ڈاکٹر بن گئے۔ بیٹیوں مریم اور تسنیم کی بھی اسی سال شادی ہوئی۔
یکم جولائی 1978ء کو غلام عباس کے دوست صوفی غلام مصطفیٰ تبسم انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال پر غلام عباس نے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کا قلمی مسودہ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے۔ عباس نے اس میں لکھا کہ:

"یہ مضمون نہ تو صوفی کے فکر و فن پر کوئی محاکمہ ہے نہ ان کی زندگی کے کوائف، ان کی دانشوری یا ان کی اعلیٰ علمی استعداد کا تذکرہ---اس میں تو فقط ایک زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت، ایک دردمند اور غمگسار دوست کی چند یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔
صوفی صاحب کی ذات میں اللہ نے بہت سی خوبیاں بھر دی تھیں مگر میرے رائے میں ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی محبوبیت ہے---چنانچہ ان کی وفات پر میں نے ٹیلی ویژن پر پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں دل میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مجھے ابھی موت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی تو صوفی صاحب زندہ ہیں۔
افسوس کہ ان کی اچانک وفات سے میری زندگی کا یہ سہارا ٹوٹ گیا۔" (90)

یعنی غلام عباس کے بچپن کے جتنے دوست تھے سب انتقال کر چکے تھے۔ بس ڈاکٹر نذیر احمد ابھی زندہ تھے۔ 1978ء کے بعد غلام عباس نے صرف ایک افسانہ "بندر والا" لکھا۔ یہ افسانہ 1981ء میں رسالہ "افکار" میں شائع ہوا۔ (91)

1979ء میں رسالہ "اردو بک ڈائجسٹ" میں "دھنک" شائع ہوا (92) اور عبدالرحمٰن چغتائی پر آغا عبدالحمید کے ساتھ جو گفتگو کی تھی، وہ 1980ء میں کتاب "عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن" میں شائع ہوئی (93) بلکہ اس زمانے میں غلام عباس کے متعدد انٹرویو شائع ہوئے اور غلام عباس پر بہت سے مضامین لکھے گئے۔ 17 مارچ 1978ء کے روزنامہ اخبار "مشرق" میں انتظار حسین

نے مضمون لکھا۔ اس کا عنوان تھا "غلام عباس افسانہ نگار نہ ہوتے تو موسیقار ہوتے۔"[94] 10 جولائی کے اخبار "جنگ" میں الف نون نے "افسانہ کیا ہے (مشہور افسانہ نگار غلام عباس سے ایک گفتگو)" نامی انٹرویو چھپوایا۔[95] 1980ء میں غلام عباس کے ساتھ شہزاد منظر، سید انور، محمد علی صدیقی، علی حیدر ملک اور منظر عام تپش کا پینل انٹرویو کیا گیا اور یہ بعد میں شہزاد منظر کی کتاب میں شائع ہوا۔[96]

19 جون 1981ء کو انجم رشید کا کیا ہوا ایک انٹرویو "اردو کے معروف افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات" اخبار "حریت" میں شائع ہوا۔[97] 21 جون کو ہفت روزہ رسالہ "MAG" میں غلام عباس کا انٹرویو شائع ہوا۔[98] پھر 13 جولائی کو انور سدید نے "غلام عباس کا فن" کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا۔[99] 28 اگست 1981ء کے اخبار "DAWN" میں Ariel کا مضمون "Honouring the living master" شائع ہوا۔ اس میں غلام عباس کی افسانہ نگاری پر بحث کی گئی۔[100] اسی طرح 4 ستمبر کے "DAWN" میں بھی "Ariel" کا غلام عباس پر مضمون پیش کیا گیا۔ اس کا عنوان "Is short story a minor genre?" تھا۔[101]

اکتوبر کے رسالہ "افکار" میں غلام عباس کے آخری افسانہ "بندروالا" کے ساتھ صہبا لکھنوی کا مضمون "غلام عباس--- سوانحی خاکہ"[102] اور ممتاز احمد خاں کا مضمون "غلام عباس--- بحیثیت افسانہ نگار" شائع ہوا۔[103] 27 نومبر 1982ء کے اخبار "حریت" میں عقیل عباس جعفری کا کیا ہوا انٹرویو "اردو کے اہم افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات" شائع ہوا۔[104]

جنوری 1982ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک کتاب چھپی۔ اس میں فرمان فتح پوری نے "غلام عباس" کے عنوان سے ایک مضمون کے ساتھ غلام عباس کا افسانہ "مجسمہ" شامل کر دیا۔ مضمون میں سوانحی خاکہ کے ساتھ غلام عباس کی افسانہ نگاری پر تنقید کی گئی ہے۔[105] 16 جنوری کو عبادت بریلوی نے "غلام عباس کی افسانہ نگاری" نامی مضمون لکھا۔ یہ مضمون بعد میں گورنمنٹ کالج سمن آباد (لاہور) کے رسالے میں شائع ہوا۔ پھر 1986ء میں عبادت بریلوی کے اپنے مضامین کے مجموعہ "افسانہ اور افسانے کی تنقید" میں شامل کیا گیا۔[106] اس مضمون کا مسودہ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے۔ اس سال کے فروری کے رسالہ "Herald" میں آصف اسلم نے "3 Hours with Ghulam Abbas" نامی انٹرویو انگریزی میں شائع کرایا۔[107] آصف اسلم "آصف فرخی" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے اپنی مرتب کردہ تصنیف میں لکھا کہ "یہ گفتگو 10 جنوری 1982ء کی صبح عباس صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی اور اس کا محض ترجمہ انگریزی ماہنامے "Herald" کے فروری 1982ء کے شمارے میں چھپا۔"[108] اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ غلام عباس

"گوندنی والا تکیہ" کی اصلاح کر کے دوبارہ چھپوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

25 جون کے اخبار "جسارت" میں طاہر مسعود نے غلام عباس کا انٹرویو چھپوایا۔ اس کا عنوان "میرا اوور کوٹ گوگول کے اوور کوٹ سے مختلف ہے" تھا۔[109]

اس طرح کے متعدد انٹرویوز کے علاوہ غلام عباس کی مصروفیات ادبی مجلسوں میں شرکت کرنے کی تھیں۔ 1981ء میں اسلام آباد میں اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام اہل قلم کانفرنس ہوئی تو انہوں نے اس میں شرکت کی۔ اس وقت کی تصویر (جنرل ضیاء الحق کے ساتھ) 1982ء کے اکادمی کی جانب سے شائع ہونے والے مجموعے "مقالات کل پاکستان اہل قلم کانفرنس" میں شائع ہوئی۔[110] 8 مارچ کی شام کو 4 بجے سے آرٹس کونسل کراچی کے ادبی جلسے کی صدارت غلام عباس نے کی۔

زینب عباس کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ 1979ء میں غلام عباس نے امریکہ کی سیر کی اور انہوں نے نیویارک میں ذاکرہ عباس کے رشتہ داروں سے ملاقات کی۔[111]

1980ء میں غلام عباس نے "جاڑے کی چاندنی" کو پھر چھپوایا۔ اس نسخے کو "خصوصی اشاعت" قرار دیا گیا ہے اور مصنف کے نام "غلام عباس" کے ساتھ "ستارہ امتیاز" بھی لکھا گیا ہے۔

شہزاد منظر کے انٹرویو میں لکھا گیا ہے کہ 1980ء میں غلام عباس اپنا افسانوی مجموعہ چھپوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ غلام عباس کے نام ڈاکٹر نذیر احمد کے خط سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا:

"۔۔۔ اپنے مختصر افسانوں کا کلیات چھاپنا واقعی بہت بڑے خرچ کا طالب ہوگا لیکن اگر کوئی پبلشر انہیں چھاپنے پر آمادہ ہو جائے تو آپ اسے اجازت دے دیجئے، اس سے رائلٹی وغیرہ طلب نہ کیجئے۔ اول تو اس لئے کہ پبلشر اگر چھپی ہوئی کہانیوں کو دوبارہ چھاپتا ہے تو وہ ایک Risk لیتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ آپ کو اب مزید آمدنی کی ضرورت نہیں۔"[112]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس اپنے "مختصر افسانوں" کا کلیات شائع کرانا چاہتے تھے۔ "1984ء میں یعنی غلام عباس کے انتقال کے ڈیڑھ سال بعد کراچی سے ان کا افسانوی کلیات "زندگی نقاب چہرے" شائع ہوا۔[113] اس میں مجموعہ "کن رس" کے دو افسانے "لچک" اور "اوتار" شامل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ معلوم نہیں مگر "مختصر افسانوں کا کلیات" ہونے کی وجہ سے اس میں "جزیرہ سخن وراں، گوندنی والا تکیہ، دھنک" جیسے ناولٹ یا ناول شامل نہیں کئے گئے۔

غلام عباس کے ذاتی نوٹ میں ایک فہرست موجود ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس "خوان یغما" نامی نیا مجموعہ شائع کرانا چاہتے تھے۔ عباس نے اس کے لئے یوں فہرست بنائی:

"خوان یغما"

1- جیب کترا
2- زہریلی مکھی
3- آپ بیتی
4- چند خطوط
5- ناول نویس
6- عید کا تحفہ
7- جوہر کامل
8- موت کا درخت
9- کثافت صحافت
10- مقبرہ
11- ترکی
12- "(114)

نمبر11 میں صرف "ترکی" لکھا ہوا ہے مگر یہ "ترکی ٹوپی" ہو سکتا ہے، کیونکہ اس عنوان کا افسانہ مارچ 1928ء میں رسالہ "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا تھا۔ نمبر12 کے بعد کچھ نہیں لکھا گیا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ بارہ سے زائد افسانوں پر مشتمل مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہوں اور اس کے لئے فہرست بنائی ہو اور درمیان میں کسی رکاوٹ کے باعث گیارہویں اندارج کو نامکمل چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

1982ء میں افسانہ نگار آصف فرخی کے پہلے مجموعے کے لئے غلام عباس نے مختصر تعارفی مضمون لکھا اور یہ فلیپ کی صورت میں شائع ہوا۔ (115)

غلام عباس کا آخری ادبی کام، ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" کو شائع کرانا تھا اور اس تھوڑے سے ردوبدل کے بعد 27 جولائی 1982ء کو انہوں نے اس کا دیباچہ "عرض حال" کے عنوان سے قلمبند کیا۔ یہ کتاب 1983ء میں لاہور کے آئینہ ادب سے شائع ہوئی۔ (116)

اکتوبر 1982ء میں غلام عباس نے لاہور کا چکر لگایا۔ یہ ان کے انتقال سے چند ہفتے پہلے کی بات ہے۔ زینب عباس نے لکھا ہے:

"Many of Abbas' beloved old time friends had passed away in these years. Suffi (Sufi) Sahib the poet, and Abdul Rahman Chugtai, the artist, had died in Lahore.

With their departure his native city had, for him, lost much of
his charm. However, Faiz Ahmad Faiz, the poet, and Doctor Nazir Ahmad were still around in early October 1982 Abbas went to Lahore. He had some bookbusiness to attend to but he wanted above all to see his childhood friend Dr Nazir Ahmad with whom he would stay. Towards the end of his week's visit he told Nazir Sahib that he would be out most of the day as he had some thinking to do and some farewells to stay. I heard much later that after wandering around the canal, in which he used to swim as boy, and other haunts of his childhood, he visted the graveyard where his firstborn, baby Razia, was buried.

He returned to Karachi." (117)

"book business" کا مطلب "گوندنی والا تکیہ" چھپوانے کا ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ غلام عباس نے اپنا کلیات شائع کرانے کے لئے چند اشاعت خانوں سے رابطہ قائم کیا ہو۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بقول اکتوبر 1982ء میں غلام عباس حلقہ ارباب ذوق لاہور میں آئے اور وہاں ایک افسانہ پڑھا (118) اور غلام عباس اپنے بچپن کے یادگار مقامات دیکھتے رہے۔ ان کے لئے یہ لاہور کا آخری سفر ثابت ہوا اور تین ہفتے بعد وہ کراچی میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ یکم نومبر 1982ء کی آدھی رات کی بات ہے۔ اس وقت کے بارے میں زینب عباس نے لکھا:

"--- "Darling," I (Zainab Abbas) said, "I hate to tell you but I have to do the rough reports. Tomorrow is our deadline. He looked a little disappointed. "How long?"

"I don't know. I have to finish them." He went into the bedroom with a book. It was 9 o'clock.

At 11.45 p.m. I put down the last report with relief.

"I'm sorry," I said as I went into the bedroom. Usually he'd be asleep or make some remark, a little jealous of the time I gave to my school work. work. This time he didn't.

"Come on," he said, opening his arms wide. I entered them and gave him all the affection I could.

Suddenly his grip of me relaxed and strange, noisy breathing on too long to be the sound of satisfaction. I said "What is the matter with you?" No reply, just the breathing.

I got out of bed and put on the light. His face was blank. I climbed onto him and tried artificial respiration and mouth to mouth resscitation. I wanted to call Neelo but didn't dare stop. I didn't know how long one went on for. All breathings stopped. I was sure he had left us. I called Neelo. Abbas was Neelo's ally, as I was Mariam's. He always indulged her whims when I resisted them. She was left terribly alone. I called the doctor, father of the twins I had taught. He came and closed my beloved's eyes, and covered his face with the sheet. The time was 12:30, the 2nd of November 1982. It was the thirtieth anniversary of our Karachi marriage. --- I rang Mariam. She called Tasneem. Zakira was with Tahira. They all came---" (119)

غلام عباس کا آخری دور دوسرے ادوار کے مقابلے میں نسبتاً آرام سے گزرا۔ اس دور میں انہوں نے ایک مجموعہ "کن رس" اور ناولٹ "دھنک" تخلیق کیا اور وہ دوسرا مجموعہ اور کلیات

شائع کرانے کی خواہش بھی رکھتے تھے مگر یہ نہیں ہو سکا مگر ان مذکورہ باتوں کو دیکھتے ہوئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ غلام عباس آخری عمر تک مسلسل ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے لئے ادب زندگی کا حصہ بلکہ مرکز رہا۔ ان کے اکثر عزیز ادباء تھے۔۔۔ روزی بھی ادب سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی زندگی میں جو مسائل اور جو خوشیاں ہوتی تھیں وہ اکثر ادب سے متعلق تھیں اور یوں غلام عباس کی ادبی اور عملی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

حواشی

(1) ان دونوں درخواست ناموں کی فوٹو کاپیاں مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ پہلا درخواست نامہ 8 نومبر 1968ء کو لکھا گیا اور ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کے نام پیش کیا گیا۔ دوسرا درخواست نامہ 11 مئی 1963ء کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری جمیل الدین عالی کے نام لکھا گیا۔

(2) یہ خط بھی مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

(3) غلام عباس (مرتبہ) "پھول" (اخبار پھول کی 48 سال کی جلدوں کا انتخاب) کراچی، مارچ 1963ء
غلام عباس ایضاً ص 49 تا 54

(4) غلام عباس ایضاً ص 138 تا 143

(5) غلام عباس ایضاً ص 144 تا 146

(6) غلام عباس ایضاً ص 147 تا 149

(7) ستار طاہر 'تضادات'، "دھنک" رسالہ (پندرہ روزہ) "تقاضے" لاہور یکم جون 1985ء

(8) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 386 تا 387

(9) غلام عباس 'عرض حال'، "دھنک" کراچی جون 1969ء ص 5

(10) زینب عباس ایضاً ص 393

(11) غلام عباس "چاند تارے (بچوں کے لئے نظمیں)" کراچی 1965ء

(12) زینب عباس ایضاً ص 401

(13) زینب عباس ایضاً ص 402

(14) زینب عباس ایضاً 412

(15) اشتہار، یہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اس اشتہار میں جو بتا دیا گیا ہے۔ یہ غلام عباس کے دوسرے گھر کا پتا ہے جسے انہوں نے اگست 1969ء میں خرید لیا تھا۔ اس لئے یہ بات واضح ہے کہ یہ اشتہار 1969ء کے بعد کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ 1982ء میں غلام عباس کے انتقال کے بعد ان کے گھر والوں نے یہ اشتہار شائع کروایا ہو، مگر غلام عباس کے نام ان کے دوستوں کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس کتابوں کا کاروبار بھی کرتے تھے۔

(16) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 5 فروری 1963ء

(17) ن م راشد، ایضاً 9 جنوری 1964ء

(18) ن م راشد، ایضاً 26 جنوری 1968ء

(19) ن م راشد، ایضاً 14 جنوری 1970ء

(20) احمد ندیم قاسمی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 2 مئی 1963ء

(21) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 416 تا 425

(22) زینب عباس ایضاً ص 421

(23) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 25 مئی 1965ء

(24) احمد ندیم قاسمی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 15 جون 1965ء

(25) غلام عباس، 'نذر'، "چاند تارے" کراچی 1965ء

(26) زینب عباس ایضاً ص 426 تا 427

(27) زینب عباس ایضاً ص 427

(28) زینب عباس ایضاً ص 430

(29) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 5 دسمبر 1966ء

(30) ن م راشد ایضاً

(31) ن م راشد ایضاً 17 اکتوبر 1966ء

(32) غلام عباس، 'کن رس'، رسالہ "نیا دور" طویل کہانی نمبر، شمارہ نمبر 9، 10 کراچی س ن، ص 9 تا 36

(33) غلام عباس، 'سرخ جلوس'، رسالہ "نیا دور" کہانی نمبر، شمارہ نمبر 31، 32 کراچی س ن، ص 23 تا 43

(34) غلام عباس، 'حواشی'، رسالہ "نیا دور" شمارہ نمبر 35، 36 کراچی س ن، ص 232 تا 237

(35) غلام عباس "جزیرہ سخن وراں" رام پور، مارچ 1966ء

(36) الطاف گوہر "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 1967ء۔ یہ خط دراصل انگریزی میں لکھا گیا۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس اس کا اردو ترجمہ موجود ہے۔ یہ خط سرکاری کاغذ پر لکھا گیا ہے۔

(37) مرزا ظفر الحسن، 'غلام عباس'، رسالہ "غالب (ا)" کراچی 1975ء ص 146

(38) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 441

(39) یہ اطلاع نامہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ غلام عباس کے پتے میں "PECH Society Ltd." لکھا گیا ہے "Ltd." غلط معلوم ہوتا ہے۔

(40) غلام عباس کے اس خط کا عکس مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اس خط کی تاریخ 20 ستمبر 1968ء ہے۔

(41) الطاف گوہر کا خط 15 اگست کو، خواجہ شہاب الدین کا خط 15 اگست 1968ء کو، یوسف ظفر کا خط 16 اگست 1968ء کو اور راشد کا خط 20 اگست 1968ء کو لکھا گیا۔

(42) زینب عباس ایضاً ص 446

(43) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 جولائی 1968ء

(44) ن م راشد ایضاً 3 اگست 1968ء اور 20 اگست 1968ء۔ 3 اگست کے خط میں لکھا گیا ہے کہ "مسودے کا صفحہ 37 مکرر بھیج رہا ہوں چنانچہ موجودہ صفحہ نکال کر ضائع کر دو اور اس کی جگہ منسلک صفحہ 87 شامل کتاب کر دو۔ "ماورا" اور "ایران میں اجنبی" کی اشاعت مکرر کے بارے میں بھی جو فیصلہ ہو مجھے جلد اطلاع دو۔ میں ان کے نسخے بھی تمہیں درست کر کے بھجوا دوں گا۔" اسی طرح 20 اگست کے خط میں لکھا گیا۔ "تم نے "ماورا" اور "ایران میں اجنبی" کے "لا۔انسان" کے ساتھ ہم آہنگ ایڈیشن شائع کرنے کے بارے میں کوئی "ہوں ہاں" نہیں کی!"

(45) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 ستمبر 1968ء
(46) منیر نیازی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 7 جون 1969ء
(47) منیر نیازی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 18 دسمبر 1969ء
(48) منیر نیازی ایضاً 27 فروری 1970ء
(49) الف جیم 'کہانی ایک افسانے کی' رسالہ "آئین" لاہور 7 جولائی 1968ء، ص 4
(50) غلام عباس 'عرض حال'، "دھنک" کراچی 1969ء ص 6
(51) ستار طاہر 'تضادات'، "دھنک" پندرہ روزہ "تقاضے" کیم مئی 1985ء
(52) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 12 نومبر 1969ء
(53) ن م راشد ایضاً 20 اگست 1968ء
(54) ڈاکٹر نذیر احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 10 اکتوبر 1969ء
(55) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 459
(56) زینب عباس، ایضاً ص 460
(57) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 26 اکتوبر 1968ء
(58) "A Great Fiction Writer" اخبار "The Pakistan Times" کراچی، 19 جولائی 1970ء مصنف کا نام درج نہیں ہے۔
(59) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 16 جولائی 1970ء
(60) ستار طاہر 'غلام عباس کا ایک افسانہ "دھنک"'، رسالہ "کتاب" لاہور نومبر 1971ء ص 23 تا 24
(61) یہ معلوم نہیں کہ فلم "منڈی" ڈرامہ "گوندنی والا تکیہ" اور کیسٹ ٹیپ کب بنائے گئے۔
(62) غلام عباس 'نواب صاحب کا بنگلہ'، "1971ء کے منتخب افسانے" لاہور 1972ء ص 9 تا 11
(63) اشفاق احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 3 اگست 1971ء
(64) غلام عباس 'اوورکوٹ' (جاپانی ترجمہ، مترجم آسادہ یوتاکا) رسالہ "ہندوستانی ادب" شمارہ نمبر 7، ٹوکیو (مجلس ادب ہندوستان) 1972ء
(65) زینب عباس ایضاً ص 503
(66) ن م راشد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 27 جنوری 1975ء
(67) غلام عباس 'راشد --- چند یادیں' رسالہ "نیا دور" راشد نمبر 1976ء۔ یہ مضمون 1986ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ کتاب "ن م راشد ایک مطالعہ میں شامل کیا گیا۔ (ص 54 تا 60)
(68) غلام عباس ایضاً
(69) صلاح الدین محمود "غلاب عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) مئی 1974ء
(70) فیض احمد فیض "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 8 مارچ 1976ء
(71) غلام عباس 'چغتائی --- چند یادیں'، "عبدالرحمن چغتائی شخصیت اور فن" (مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا) لاہور 1980ء
(72) احمد ندیم قاسمی "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 11 نومبر 1976ء
(73) غلام عباس 'رینگنے والے'، رسالہ "نیا دور" شمارہ نمبر 56 تا 60، کراچی س ن، ص 13 تا 24
(74) غلام عباس 'اوتار' رسالہ "نیا دور" افسانہ نمبر کراچی س ن، ص 167 تا 183
(75) غلام عباس 'رینگنے والے'، رسالہ "جریدہ پشاور (11)" پشاور س ن، ص 249 تا 259۔ اس افسانے کا قلمی مسودہ کا ایک صفحہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

(76) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی، اکتوبر 1981ء
(77) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" لاہور 1991ء ص 54
(78) شہزاد منظر ایضاً ص 134
(79) غلام عباس 'روی' رسالہ "تخلیق ادب" کراچی 1970ء ص 242 تا 259
(80) یہ معلوم نہیں کہ یہ افسانہ کہاں چھپا۔
(81) ڈاکٹر نذیر احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 31 جنوری 1977ء
(82) اس انگریزی رسالے کا نام صحیح معلوم نہیں۔ رسالے کے مدیر داؤد کمال تھے اور مترجم کوئی انگریز خاتون تھی۔
(83) فیض احمد فیض "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 30 اگست 1977ء
(84) خالد حسن، فاروق حسن (مرتبہ) "Urdu Short Stories from Pakistan" دہلی 1983ء
(85) خالد حسن، فاروق حسن، ایضاً ص 11 تا 21
(86) خالد حسن، فاروق حسن ایضاً ص 135 تا 141
(87) غلام عباس 'آنندی' (جاپانی ترجمہ، مترجم: آساوہ یو آکا) رسالہ "ہندوستانی ادب" ٹوکیو 1978
(88) اطہر پرویز (مرتبہ) "اردو کے 13 افسانے" لاہور 1980ء
(89) اطہر پرویز "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 23 جنوری 1986ء
(90) غلام عباس "صوفی غلام عباس مصطفیٰ تبسم" (غیر مطبوعہ) 28 مارچ 1978ء یہ دس لائن پر مشتمل 12 صفحات کا مضمون ہے۔
(91) غلام عباس 'بندروالا' رسالہ "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء ص 53 تا 59
(92) غلام عباس 'دھنک' رسالہ "اردو بک ڈائجسٹ" کراچی یکم فروری 1979ء ص 5 تا 24
(93) غلام عباس 'چغتائی چند یادیں' "عبدالرحمٰن چغتائی۔۔۔ شخصیت اور فن" (مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا) لاہور 1980ء
(94) انتظار حسین 'غلام عباس افسانہ نگار نہ ہوتے تو موسیقار ہوتے' اخبار "مشرق" (ادبی صفحہ) لاہور 17 مارچ 1978ء
(95) الف نون "افسانہ کیا ہے (مشہور افسانہ نگار غلام عباس سے ایک گفتگو) اخبار "جنگ" کراچی 10 جولائی 1978ء ص 2
(96) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" لاہور 1991ء ص 105 تا 135
(97) انجم رشید "اردو کے معروف افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات" اخبار "حریت" کراچی 16 جون 1981ء
(98) "غلام عباس سے انٹرویو" (انگریزی) رسالہ "MAG" کراچی، 21 جون 1981ء
(99) انور سدید 'غلام عباس کا فن' یہ معلوم نہیں کہ یہ مضمون شائع ہوا یا نہیں بہرحال مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔
(100) "Honouring The Living Master" اخبار "DAWN" کراچی 28 اگست 1981ء
(101) "Is Short Story A Minor Genre?" Arid اخبار "DAWN" کراچی 4 ستمبر 1982ء
(102) صہبا لکھنوی 'غلام عباس' رسالہ "افکار" کراچی، اکتوبر 1981ء ص 27 تا 28
(103) ممتاز احمد خان 'غلام عباس۔۔۔ بحیثیت افسانہ نگار' رسالہ "افکار" کراچی، اکتوبر 1981ء ص 29 تا 31
(104) عقیل عباس جعفری "اردو کے افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات' اخبار "حریت" کراچی 27 نومبر 1982ء
(105) ڈاکٹر فرمان فتح پوری 'اردو افسانہ اور افسانہ نگاری' کراچی، جنوری 1982ء ص 109 تا 119
(106) ڈاکٹر عبادت بریلوی 'غلام عباس کی افسانہ نگاری' "افسانہ اور افسانے کی تنقید" لاہور 1982ء ص 229 تا 250
(107) آصف اسلم '3Hours With Ghulam Abbas' رسالہ "Herald" کراچی فروری 1982ء

(108) آصف فرخی (مرتبہ) "حرف من و تو" کراچی 1989ء ص 34

(109) طاہر مسعود 'میرا اوورکوٹ گوگول کے اوورکوٹ سے مختلف ہے' اخبار "جسارت" کراچی 25 جون 1982ء

(110) اکادمی ادبیات پاکستان "مقالات کل پاکستان اہل قلم کانفرنس" اسلام آباد 1982ء

(111) زینب عباس "You Never Can Tell" س ن، ص 557

(112) ڈاکٹر نذیر احمد "غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 21 فروری 1981ء

(113) غلام عباس "زندگی، نقاب، چہرے" دانیال کراچی، 1984ء

(114) غلام عباس "نوٹ" (قلمی مسودہ، غیر مطبوعہ)

(115) غلام عباس 'آصف فرخی پر تعارفی مضمون' "آتش فشاں پر کھلے گلاب" (از آصف فرخی) کراچی 1982ء

(116) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" 1983ء آئینہ ادب لاہور

(117) زینب عباس، ایضاً ص 569 تا 570

(118) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، انٹرویو (ملاقات سویا مانے) اورینٹل کالج، لاہور 11 اگست 1991ء

(119) زینب عباس ایضاً ص 574 تا 575

4—3—1 1982ء کے بعد غلام عباس شناسی

"اس سر سے پلٹ چکی یہ آفت، بالخیر
اور کٹ چکی، زندگی کی زحمت، بالخیر
اس قصے کے انجام نے بخشا آرام
افسانہ آسودگی، تمت بالخیر

1982ء

کس شان کا اجتماع فکر و احساس
پہنا ہوا حکمت نے حکایت کا لباس
فانوس خیال تھا کہ افسوں نظر
بے مثال فسانہ غلام عباس

1982ء

(از مظفر علی سید)"

"ممتاز افسانہ نگار غلام عباس کو سپرد خاک کر دیا گیا۔
مرحوم کی آخری تحریروں میں بھی تخلیقی حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ دانشوروں کا خراج تحسین
کراچی 2 نومبر (اسٹاف رپورٹر) برصغیر پاک و ہند کے ممتاز افسانہ نگار جناب غلام عباس کو آج سہ پہر سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان پر گزشتہ رات اچانک دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ نماز جنازہ مسجد سلمانیہ میں ادا کی گئی۔ فاتحہ سوئم 4 نومبر کو عصر اور مغرب کے درمیان 7۔ ایچ بلاک 2 بی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی میں ہوگی۔ آج دوپہران کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازے میں رشتہ داروں کے علاوہ جناب اختر حسین رائے پوری، جناب ابوالفضل صدیقی، جناب شوکت صدیقی، جناب رفیق خاور، جناب شان الحق، کمانڈر انور، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب علی نواز وفائی، پروفیسر عتیق احمد، جناب حسین عابدی، جناب فرید احمد، جناب شفیع عقیل اور جناب ولایت علی اصلاحی نے شرکت

ی۔ گھر پر محترمہ رضیہ فصیح احمد، محترمہ ہاجرہ مسرور، جناب علی احمد خاں، جناب پروفیسر ممتاز حسین اور علی امام نے تعزیت کی۔ جناب غلام عباس نے پسماندگان میں دو لڑکے اور چھ لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ ان کے دونوں صاحبزادے ملک سے باہر ہیں۔

غلام عباس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ غلام عباس کی آخری تحریروں میں بھی تخلیقی حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ کمانڈر انور نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ غلام عباس کی موت سے اردو ادب میں بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے جو بہت دنوں پر نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کو پیش کیا ہے۔ جناب شوکت صدیقی نے کہا کہ غلام عباس نے ہمیشہ اپنے افسانوں کو زندہ کرداروں سے سجایا۔ جناب اختر حسین رائے پوری نے کہا کہ غلام عباس نے اردو ادب کی ترقی اور خاص طور پر مختصر افسانے کو بام عروج پر پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

دریں اثناء آج رات ریڈیو پاکستان کے ایک تعزیتی پروگرام میں بیگم شائستہ اکرام اللہ نے غلام عباس کی موت کو اردو ادب میں ایک خلاء سے تعبیر کیا۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ ان کی موت سے ہماری ادبی اور فنی دنیا کا ایک بہت ہی وسیع حلقہ ویران ہو گیا۔ محترمہ ہاجرہ مسرور نے کہا کہ آج جب غلام عباس کو کفن میں لپٹا دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ اپنا مختصر افسانے لکھنے کا مخصوص فن جیسے اپنے ہی کفن میں لپیٹ کر لے گئے۔ اشفاق احمد نے کہا کہ غلام عباس ہماری اردو افسانہ نگاری کے ایک بہت قد آور ستون تھے اور ان سے ہم لوگوں نے لکھنا سیکھا تھا۔ جناب ابوالفضل صدیقی نے کہا کہ وہ ایک موجد تھے اور اردو ادب کا المیہ ہی ہے کہ ایسے موجد نہ صرف اٹھتے جا رہے ہیں بلکہ اپنا فن اور روایات بھی ساتھ ہی لیتے جا رہے ہیں۔ جناب جیلانی کامران نے کہا کہ "الحمرا کے افسانے" جس زبان میں لکھے گئے ہیں، وہ بہت حد تک منفرد ہے اور واشنگٹن ارونگ کی زبان سے کئی گنا بہتر ہیں۔ جناب ممتاز حسین نے کہا کہ انہوں نے ہمارے ادب میں خاص طور پر مختصر افسانہ نگاری میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس لئے ان کے افسانے بھی اردو ادب میں ایک کلاسیکی اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ کمانڈر انور نے کہا کہ جناب عباس کے انتقال کے دن شام کے چار بجے تک میں ان کے ساتھ تھا وہ خوش خرم تھے اور ان کا مجھ سے بچھڑ جانا مجھ پر بہت گراں گزرے گا۔ جناب جمیل جالبی نے کہا کہ ان کی موت سے جدید اردو افسانے کا فن آج ختم ہو گیا۔ "(۱)

3 نومبر 1982ء کے اخبار "جنگ" میں اس لمبی خبر کے ساتھ دو تصاویر بھی شائع ہوئیں۔ ایک تصویر میں غلام عباس کا جنازہ قبرستان کی طرف جا رہا ہے اور دوسری تصویر میں غلام عباس کی نماز جنازہ نرسری کی مسجد میں ادا کی جا رہی ہے۔

غلام عباس کے انتقال کی خبر سب سے پہلے اخبار "DAWN" کراچی میں 2 نومبر 1982ء کو شائع

ہوئی، مگر اچانک انتقال کی وجہ سے خبر بہت مختصر تھی۔ خبر یوں ہے:

"Ghulam Abbas dies

Famous literary writer Ghulam Abbas died last night of heart failure. His end came suddenly after midnight at his residence, M-72, Block No. VI PECHS. He was 73. He leaves behind eight children.

He will be buried today in the forenoon." (2)

غلام عباس کو قبرستان سوسائٹی میں دفن کیا گیا۔ یہ قبرستان ان کی رہائش کے نزدیک واقع ہے۔ ان کے قبر کے بارے میں پروفیسر محمد اسلم نے لکھا ہے:

"جناب چندریگر کے مزار سے پندرہ میٹر جانب شمال اردو کے عظیم ناول نگار اور افسانہ نویس غلام عباس محو خواب ابدی ہیں۔ انھوں نے آنندی، جاڑے کی چاندنی، جزیرۂ سخن وراں، جل پری، کن رس کے علاوہ اخبار پھول کا انتخاب شائع کر کے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ اگر موصوف آنندی کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ لکھتے، تب بھی وہ بڑے ادیب ہوتے۔ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے، اس کی آخری سطر کے چند حرفوں کو زمین کے تھور نے خراب کر دیا ہے۔ باقی عبارت یوں ہے:

اردو کے عظیم افسانہ نگار

غلام عباس

مرحوم و مغفور کی آخری آرام گاہ

تاریخ وفات 2 نومبر 1982ء

قطعہ تاریخ وفات

رفیقو اٹھا وہ صاحب فن جو مہر رخشندہ وطن ہے
چلو در شہر فن پہ لکھ دیں غلام عباس جان فن ہے" (3)

1403ھ

پھر 3 نومبر کے بعد بہت سے اخبارات اور رسائل میں غلام عباس کے انتقال اور اس کی ادبی خدمات کے متعلق مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً 4 نومبر 1982ء کے اخبار "DAWN" میں 3 نومبر کے جنازے کے بارے میں خبر دی جانے کے بعد مختلف ادباء کی آراء شائع ہوئیں۔

"Prof. Majnoon (Gorakhpuri); When ailing Prof.

Majnoon Gorakhpuri, eminent living critic was informed of the tragic news, he said: "It is undoubtedly a great loss to Urdu language and loterature in general and Urdu prose in paticular."

"Akhtar Raipuri" Dr. Akhtar Hussain Raipuri said: "He was a perfect gentleman and an outstanding short story writer. He said, Ghulam Abbas captured the "very living moments in life and environment and conveyed his message effectively. Shaukat Siddiqi; Novelist and short story writer Shaukat Siddiqi paid tributed to Ghulam Abbas for choosing character and themes from real life."

"Jamil Jalibi": Dr. Jamil Jalibi, a close friend of Ghulam Abbas, said he was a front -rank writer of subcontinent and became a classic in his life-time--- a real honour for a writer. He said the evolution of the creative process of Ghulam Abbas continued till the end.

Dr Jamil Jalibi mentioned "Anandi, Kan Ras, Over-coat, Kataba" and "Nak Katne Wale" as his most outstanding stories. Ghulam Abbas had full command over the language and his short stories immensly influenced regional literature he added.

"Wafai, Ali Nawaz Wafai, a prominent Sindhi intellectual, said half of the literary works of Ghulam Abbas had been translated in Sindhi and were now part of Sindhi literature." (4)

آراء کے ساتھ اس اخبار میں غلام عباس کی افسانہ نگاری پر لمبا مضمون بھی پیش کیا گیا۔ (۵) 4 نومبر کو پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق (مرحوم) نے غلام عباس کی بیوہ کے نام ایک پیغام بھیجا۔

اس میں غم کے اظہار کے ساتھ غلام عباس کی ادبی خدمات کی تعریف کی گئی۔ [6]

4 نومبر کو رسم قل ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، صہبا لکھنوی، شان الحق حقی، ابوالفضل صدیقی اور مشفق خواجہ نے شرکت کی۔ [7] 5 نومبر کے اخبار "جسارت" میں علی حیدر علی کا مضمون غلام عباس کے انتقال پر پیش کیا گیا۔ [8]

6 نومبر کو پاکستان رائٹرز گلڈ (سندھ زون) کا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ یہ جلسہ کراچی آرٹ کونسل کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کی۔ [9] اس موقع پر سید انور نے "غلام عباس کی یاد میں" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ [10] جو غلام عباس کی آخری عمر کے عزیز دوست تھے اور غلام عباس کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ [11]

سید انور نے اپنے مضمون میں غلام عباس سے آخری ملاقات کا ذکر کیا۔ یہ ملاقات یکم نومبر کی شام کو غلام عباس کے گھر پر ہوئی۔ ملاقات کے دوران صدر جنرل ضیاء الحق کے دورۂ کوریا کے متعلق بات چیت ہوئی۔ پھر انور نے شطرنج کی یاد بھی دلائی اور کہا کہ اس آخری ملاقات پر بھی دونوں شطرنج کھیلتے رہے۔

اس طرح اس جلسے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی غلام عباس کی یاد میں ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں انہوں نے ایک دلچسپ بات بتائی ہے:

"یکم نومبر کو دن میں گیارہ بجے کے قریب مجھ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے جمیل صاحب مجھے دو دن اور دے دیجئے۔ "نوجوان افسانہ نگار کے نام خط" کے چند صفحے رہ گئے ہیں، بس جمعرات کو لے لیجئے۔ رات کو ایک بجے کمانڈر انور کا فون آیا۔ بتایا کہ عباس صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ تو ہو چکا تھا اور جب میں جمعرات کو ان کے سوم میں شریک ہوا تو مجھے یاد آیا کہ یہی وہ دن اور وقت تھا جب مجھے غلام عباس صاحب سے ملنا تھا مگر وہ تو جا چکے تھے۔ وہاں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا!

رہنے کی کوئی جاگہ شاید نہ تھی انہوں کی
جو یاں سے اٹھ گئے ہیں وے پھر کبھو نہ آئے

[12]

"نوجوان افسانہ نگار کے نام خط" کا ذکر دوسرے اخبارات اور رسائل میں بھی نظر آتا ہے مگر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکا۔ آصف فرخی کی کتاب "حرف من و تو" میں اس سلسلے میں یہ ذکر آتا ہے:

"یہ خیال بھی یوں آیا کہ عباس صاحب فن افسانہ نگاری کے اسرار و رموز ایک نوجوان افسانہ نگار کے نام خط کی صورت میں لکھ رہے تھے۔ یہ کھلا مکتوب ایک لحاظ سے ان کے

لئے وہی حیثیت رکھتا تھا جو سمرسٹ ماہم کی کتاب میں The Summing Up کو حاصل ہے۔ لکھتے لکھتے ان کے ہاتھ میں کچھ تکلیف ہوئی تو اس طویل تحریر کا کچھ حصہ انہوں نے مجھے لکھوایا۔ وہ بولتے اور میں لکھتا جاتا۔"[13]

اس جلسے میں سید انور اور جمیل جالبی کے علاوہ پروفیسر جمیل اختر، خان الحق حقی اور اختر حسین رائے پوری نے اظہار خیال کیا۔ یہ خبر ایک تصویر کے ساتھ اخبار "DAWN" میں شائع ہوئی۔[14]

8 نومبر کو شہزاد منظر نے "غلام عباس" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ مضمون کس رسالے یا اخبار میں شائع ہوا یا نہیں۔ 1990ء میں شہزاد منظر کی اپنی کتاب "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" میں یہ مضمون شامل کیا گیا۔[15]

11 نومبر کے رسالے "MAG" میں "Ghulam Abass of Anandi" کے عنوان سے ایک انگریزی مضمون شائع ہوا۔[16] 12 نومبر کے اخبار "جسارت" میں علی حیدر ملک کا مضمون "ہم سب غلام عباس کے "اوورکوٹ" سے نکلے ہیں"[17] اور انور سدید کا مضمون "غلام عباس کی یاد میں" شائع ہوا۔ 12 نومبر کے لاہور کے اخبار "امروز" میں بھی انور سدید نے "غلام عباس کے لئے تعزیت" کے عنوان سے مضمون پیش کیا۔[18] اس اخبار میں ستار طاہر کا مضمون "غلام عباس کی یاد میں" بھی شائع ہوا۔[19]

12 نومبر کے اخبار "جنگ" میں غلام عباس پر خصوصی مضامین اور نایاب خطوط اور انٹرویوز شائع ہوئے۔ ایک تو غلام عباس کی اپنی تحریر "میں نے آنندی افسانہ کیوں لکھا ہے۔" اس میں غلام عباس نے "آنندی" لکھنے کے پس منظر کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ شوکت صدیقی کا مضمون بھی شائع ہوا۔ شوکت صدیقی نے لکھا کہ غلام عباس نے نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی اور کامیاب و کامران بھی رہے۔ عصمت چغتائی کا مضمون "غلام عباس کا افسانہ --- سمجھوتہ" بھی اس میں شامل ہے۔ احتشام حسین کے مضمون کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔ اس پرانے مضمون میں غلام عباس کی فن پر تنقید کی گئی ہے۔ خالد احمد کے مضمون میں لکھا گیا ہے کہ "چند ایسی سطور بھی جن میں لفظ کوئی مبالغے کا نہیں" 27 ستمبر 1937ء کو مولانا عبدالمجید سالک نے غلام عباس کے نام تحریر لکھی۔ وہ بھی اس میں شائع ہوئی ہے۔ اس طرح پطرس بخاری کی ایک تحریر 20 جون 1968ء کے ن۔ م راشد کے خط کا عکس اور غلام عباس کے نام سعادت حسن منٹو کے خط کا عکس بھی شائع ہوا ہے۔[20]

13 نومبر کے اخبار "اخبار خواتین" میں "غلام عباس کا فن عالمگیر اور لازوال ہے" کے عنوان سے ایک مضمون طبع ہوا۔[21] 19 نومبر کو راغب شکیب نے "جدید لکھاری کا خط غلام عباس کے نام" کو اخبار "جسارت" میں لکھا۔[22] 19 نومبر کے لاہور کے اخبار "امروز" میں منظر امکانی کا مضمون

"ادب میں درجہ بندی (غلام عباس کے بارے میں)" شائع ہوا۔ [23]

22 نومبر کے رسالہ "آہنگ" میں غلام عباس پر خصوصی مضامین شائع ہوئے۔ خود غلام عباس اس رسالے کے پہلے مدیر رہے تھے اور تقریباً 20 سال وہ اس رسالے کی ادارت کرتے رہے۔ اس رسالے میں شہزاد منظر کا مضمون "عام انسانوں کا داستان گو غلام عباس" [24] محشر بدایونی کا مضمون "چند یادیں غلام عباس" شائع ہوئے [25] اور اس کے بعد غلام عباس کا افسانہ "اوورکوٹ" بھی شامل کیا گیا۔ [26] شہزاد منظر کے مضمون کا عنوان دراصل ن۔ م راشد کا جملہ ہے جو "جاڑے کی چاندنی" کی تمہید کے لئے لکھا گیا تھا۔ محشر بدایونی اس وقت ریڈیو پاکستان میں ملازمت تھے اور ان کا شعری مجموعہ سجاد کامران سے شائع ہوا تھا۔ محشر بدایونی نے غلام عباس کے لئے قطعہ تاریخ لکھا:

رفیقو اٹھا وہ صاحب فن
جو مہر رخشندہ وطن ہے
چلو در شہر فن پہ لکھ دیں
"غلام عباس جان فن ہے"

(1982ء)1403ھ

25 نومبر کو ڈاکٹر نذیر احمد نے بیگم غلام عباس کے نام تعزیتی خط لکھا:

"برادرم غلام عباس کی وفات سے بے پناہ صدمہ ہوا۔ وہ میرے بچپن کے ساتھی تھے اور مجھ سے پانچ ایک سال چھوٹے تھے۔ بظاہر تو ان کی صحت بہت اچھی تھی، پھر پتہ نہیں وہ کچھ وقت اور کیوں نہ جیئے۔ وہ ملتے تھے تو ہم پرانے وقتوں کی یادیں تازہ کیا کرتے تھے، لیکن اب کوئی ایسا بھائی نہیں رہا جس سے میں پرانے وقتوں کی باتیں کرسکوں۔
میں ہندوستان گیا ہوا تھا، ابھی واپس آیا ہوں تو برادرم غلام عباس کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!--- برادرم غلام عباس اپنی کتابیں چھپوانے کا کبھی کبھی اذکار کیا کرتے تھے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی کام لاہور میں ہو تو مجھے مطلع فرمائیں جو کچھ کرسکتا ہوں کروں گا۔" [27]

یہ خط بیگم غلام عباس کے نام لکھا گیا ہے۔ یعنی ذاکرہ اور زینب دونوں بیگمات کے نام لکھا گیا۔

3 دسمبر کے اخبار "جسارت" میں علی حیدر ملک نے پھر غلام عباس پر مضمون لکھا۔ اس مضمون کا عنوان "پریس کلب میں غلام عباس مرحوم کی یاد" ہے۔ [28] 11 دسمبر کے اخبار "BLITZ" میں خواجہ احمد عباس نے "جہاں لنگڑے لولے مسکراتے رہے--- میں! (غلام عباس کی یاد میں)" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا۔ [29] اس طرح 24 دسمبر کے اخبار "جسارت" میں راغب شکیب

نے ایک مضمون "غلام عباس کی یاد میں" لکھا[30] اور دسمبر میں شائع ہونے والے رسالے "پندرہویں صدی" میں "غلام عباس دھیمے لہجے کا افسانہ نگار" نامی ایک مضمون شائع ہوا۔[31] راغب شکیب کا مضمون "غلام عباس کی یاد میں" کا دوسرا حصہ 7 جنوری 1983ء کے اخبار "جسارت" میں شائع ہوا[32] اور 1983ء کے رسالے "Third World International" میں افضال احمد کا انگریزی مضمون "Ghulam Abbas--A Valedictory"[33] کے ساتھ انور عنایت اللہ کا انگریزی ترجمہ ""Anandi"" بھی شائع ہوا۔[34] افضال احمد کے اس انگریزی مضمون میں غلام عباس کی سوانح کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اس کی افسانہ نگاری پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ انور عنایت اللہ کا یہ ترجمہ 1978ء میں رسالہ "Herald" میں شائع شدہ تھا۔ اس ترجمہ کے ساتھ یہ لکھا گیا ہے:

"The story has been translated into several languages including Russian, German, Japanese, Chinese, English, Czech, Arabic, Persian, Turkish, Swahili, Malay, Sindhi, Bengali, Hindi and Marathi." [35]

یوں غلام عباس کے انتقال پر بہت سے مضامین لکھے گئے اور یہ سارے مضامین غلام عباس کے انتقال کے موقع پر لکھے گئے۔ اس لئے زیادہ تر تعزیتی اور جذباتی رنگ میں ہیں۔ کچھ سوانح کے خاکے، انتقال سے پہلے کے خاکے ان کی ادبی زندگی کے خاکے وغیرہ پیش کئے گئے۔ یعنی اتنے مفصل انداز میں نہیں لکھے گئے بلکہ عام قارئین تک غلام عباس کی ادبی خدمات کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہیں۔

لیکن اس سال غلام عباس شناسی میں ایک اضافہ ہوا۔ جب شعبہ اردو یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔ اے کا ایک مقالہ پیش کیا گیا۔ نادیہ جلیل کے اس مقالے کا عنوان "مختصر افسانے کے نظریاتی مباحث اور غلام عباس کی افسانہ نگاری" تھا۔[36] اس مقالے کے نگران ڈاکٹر سجاد باقر رضوی تھے اور اس مقالے میں غلام عباس کی افسانہ نگاری کے موضوع پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ یعنی انسان اپنی بنیادی کمزوری کو کیسے چھپاتا ہے اور غلام عباس اسے افسانے میں کیسے دکھاتے ہیں۔

1983ء میں دہلی سے "Urdu Short Stories From Pakistan" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی۔[37] جس میں غلام عباس کے افسانے "White Man's Burden" اور "The Overcoat" شامل ہیں جیسا کہ 1977ء کے غلام عباس کا سوانح پیش کرتے ہوئے اس ترجمے کا ذکر ہو چکا ہے کہ "White Man's Burden" خالد حسن نے ترجمہ کیا مگر اس کے اردو متن کے عنوان کا معلوم نہیں "The Overcoat" کی مترجم زینب عباس ہے۔

اس طرح 1983ء میں بمبئی سے "کہانیاں" نامی افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس میں بھی غلام عباس کے دو افسانے شامل کیے گئے۔ ایک "ناک کاٹنے والے" ہے [38] اور "دوسرا چشم و چراغ"۔ [39] "ناک کاٹنے والے" مجموعہ "آنندی" میں شامل ہے مگر "چشم و چراغ" کسی مجموعے میں شامل نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے "کہانیاں" میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔

جولائی 1983ء میں رسالہ "ماہ نو" میں غلام عباس کے متعلق تین مضامین پیش کیے گئے۔ یعنی قائم نقوی کا "افسانے کا ایک دور غلام عباس" [40] محمود الحسن کا "غلام عباس کا اچھوتا تجربہ--- آنندی" [41] اور عالم خاں کا "غلام عباس--- نئے عہد کا داستان گو" [42] اس شمارے میں شامل کیے گئے اور آخری میں غلام عباس کا غیر مطبوعہ افسانہ "یہ پری چہرہ لوگ" طبع کیا گیا۔ [43]

یکم نومبر 1983ء کو کراچی میں غلام عباس کی برسی منائی گئی۔ اس موقع پر سید انور نے "غلام عباس کی برسی پر عقیدت کے پھول" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ [44]

1984ء میں کراچی کے "مکتبہ دانیال" سے غلام عباس کا کلیات "زندگی نقاب چہرے" شائع ہوا۔ [45] اس میں مجموعہ "آنندی" اور مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" کے سارے افسانے اور مجموعہ "کن رس" کے 6 افسانے ('لچک' اور 'اوتار' شامل نہیں کیے گئے) اور 'فرار'، 'بندر والا' اور 'روحی' شامل کیے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ "لچک" اور "اوتار" کیوں اس مجموعے میں شامل نہیں ہوئے۔ بہرحال غلام عباس کے بیشتر افسانوں کو اکٹھے کرنے کی وجہ سے قارئین کو خاصی آسانی ہوئی۔ [46]

اس سال میں ڈاکٹر محمد صادق کی تصنیف "Twentieth Century Urdu Literature" کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں بھی غلام عباس کے افسانوں "آنندی" "کتبہ" اور "سیاہ و سفید" پر تنقید کی گئی ہے۔ [47]

1984ء میں احمد علی کی مرتب کردہ کتاب "Serected Short Stories from Pakistan" شائع ہوئی۔ [48] اس میں زینب عباس کا ترجمہ "Overcoat" شامل ہے جبکہ مذکورہ خالد حسن کی مرتب کردہ کتاب میں "اوورکوٹ" کا عنوان "The Overcoat" تھا۔ 1984ء کے رسالہ "ہندوستانی ادب" (جاپانی) میں آسادہ یوتاکا نے "کتبہ" کا جاپانی ترجمہ شائع کرایا۔ [49]

اس سال میں یونس جاوید کا تحقیقی مقالہ "حلقہ ارباب ذوق" مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ [50] اس سے معلوم ہوا ہے کہ غلام عباس نے "حلقہ ارباب ذوق" میں دو مرتبہ افسانے پڑھے۔ ایک یکم مارچ 1948ء کو اور دوسرا 1967ء کے دوران اور دوسرا افسانہ جو انہوں نے حلقے میں پڑھا "دھنک" تھا۔

1985ء میں ستار طاہر کے مضامین رسالہ "تقاضے" میں بالاقساط شائع ہوئے۔ یکم مئی 1985ء کے "تقاضے" میں "فینسی ہیر کٹنگ سیلون"[51] پر اور یکم جون کے "تقاضے" میں "دھنک" پر مضمون لکھا گیا[52] اور یکم مئی کا مضمون یوں شروع ہوتا ہے:

"گزشتہ صحبت میں، میں نے غلام عباس مرحوم کی دو کہانیوں کے حوالے سے اپنی ملکی صورتحال پر کچھ گفتگو کرنے کے بارے میں لکھا تھا۔۔۔"[53]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ستار طاہر کے مضامین کی تعداد تین سے زیادہ ہے۔ اب صرف یکم مئی اور یکم جون والے دستیاب ہیں۔

1985ء میں بمبئی سے افسانوی مجموعہ "کہانیاں" کی دوسری جلد شائع ہوئی۔ اس میں غلام عباس کا "اوورکوٹ" شامل کیا گیا۔[54] اسی سال میں طاہر مسعود کے ادباء سے انٹرویوز کا مجموعہ شائع ہوا۔[55] اس میں غلام عباس کا انٹرویو بھی شامل ہے۔ اس میں افسانہ "اوورکوٹ" لکھنے کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب "A History of Urdu Literature" کی دوسری اشاعت بھی 1985ء میں ہوئی۔ اس میں جدید اردو ادب کے بارے میں اضافہ کیا گیا۔ جس میں غلام عباس پر بھی مختصر مضمون شامل ہے۔[56]

1986ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ کتاب "ن۔ م راشد ایک مطالعہ" شائع ہوئی۔[57] اس میں غلام عباس کا وہ مضمون شامل ہے جو "راشد چند یادیں" کے عنوان سے رسالہ "نیا دور" کے راشد نمبر میں شائع ہوا تھا۔ 19 ستمبر 1986ء کے اخبار "The Pakistan Times" میں "اوورکوٹ" کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔[58] اس کا ترجمہ اشفاق نقوی نے کیا ہے۔ 1987ء میں "گوندنی والا تکیہ" کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔[59]

1988ء میں انتظار حسین کے کالموں کا مجموعہ "ملاقاتیں" شائع ہوا۔[60] اس میں "غلام عباس" کے عنوان سے غلام عباس کی شخصیت پر مضمون شامل ہے۔ انتظار حسین نے لکھا:

"عباس صاحب ایک طرف نفسیاتی افسانے سے گریزاں ہیں۔ دوسری طرف اصلاحی اور تبلیغی رنگ سے بدکتے ہیں۔ کہنے لگے کہ "کرشن چندر نے اپنی افسانہ نگاری میں لیڈرانہ وصف پیدا کر لیا اور مصلح بن گیا۔ پھر اس نے یہ طور اختیار کیا کہ کرداروں کو پیچھے دھکیلا اور خود آگے آکر تقریر شروع کر دی۔

عباس صاحب آج بھی اپنی حقیقت نگاری میں خوش ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرا اپنا افسانے کا ایک تصور ہے۔ بازی گری اور معمہ بازی کا مطلق قائل نہیں۔ ابہام پیدا کر کے پڑھنے

والے کو مرعوب کر لیا جاتا ہے مگر میں سیدھے سچے انداز میں لکھنے کا قائل ہوں۔
یہ ہیں غلام عباس جو اردو افسانے کے کئی زمانے گزار چکے ہیں مگر اب بھی تھکے ہوئے نظر نہیں آتے۔"[61]

علاوہ ازیں "ڈاکٹر عبادت بریلوی" سے ملاقات میں بھی انہوں نے دلی کے حلقہ ارباب ذوق کی یادوں کے ساتھ غلام عباس کا ذکر کیا ہے۔[62]

1988ء میں ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" شائع ہوئی۔[63] یہ دراصل انوار احمد کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا حصہ ہے۔ اس میں غلام عباس کا مختصر سوانحی خاکہ[64] اور ان کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ سوانح کے حصے میں صہبا لکھنوی اور فرمان فتح پوری کے خاکوں سے استفادہ کیا اور "فکر و فن" کے حصے میں غلام عباس کے بیشتر افسانوں پر جائزہ لیا گیا ہے[65] بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلام عباس کے افسانوں پر تبصروں کا مجموعہ ہے۔ پہلے ان کے افسانوں کے موضوعات پر مجموعی جائزہ لیا گیا اور اس کے بعد ہر افسانے کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر افسانے پر مصنف کا مجموعی تاثر پیش کیا گیا ہے مگر تفصیل تک نہیں پہنچ سکا۔ یعنی "کتبہ" کو "ایک مؤثر اور کامیاب افسانہ" قرار دیا گیا ہے اور اس کہانی کے موضوع کو بتانے کے بعد چند جملے مثال کے طور پر دیئے گئے ہیں۔[66]

اس سال میں وقاص احمد خواجہ کی کتاب "Mornings in the Wilderness" طبع ہوئی۔[67] اس کتاب میں اردو نظم اور نثر کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہوا ہے اور غلام عباس کے افسانہ "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" کا انگریزی ترجمہ بھی۔ مترجم وقاص احمد خواجہ ہیں۔

1989ء میں آصف فرخی کی مرتب کردہ کتاب "حرف من و تو" شائع ہوئی۔[68] یہ ادباء کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ اس میں غلام عباس کا انٹرویو بھی شامل ہے چونکہ آصف فرخی غلام عباس کی آخری عمر کے قریبی دوست ہیں، اس لئے افسانہ نگاری پر بھی تفصیل سے بحث ہو سکی۔ آصف فرخی خود لکھتے ہیں کہ "یہ گفتگو 10 جنوری 1982ء کی صبح غلام عباس صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی اور اس کا محض ترجمہ انگریزی ماہنامے "دی ہیرلڈ" کے فروری 1982ء کے شمارے میں چھپا۔ اس کے طریقہ کار میں ایک بات وضاحت طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے عباس صاحب سے باقاعدہ سوال نہیں کئے تھے۔ اس لئے یہ گفتگو انٹرویو کی طرح سوال و جواب کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ چند موضوعات ان کے سامنے رکھ دیئے تھے اور باقی سب کچھ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اسی لئے انہیں یہ بات چیت خود بھی اس قدر دلچسپ معلوم ہوئی کہ وہ اسے اپنے مضامین کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔"[69]

"۔۔۔ میں ایک دن بہت سے سوال لے کر عباس صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ سوال تو میں ایک

بھی نہ کر پایا مگر مکالمہ ہو گیا۔ یہ تمام گفتگو میں نے لکھ ڈالی۔ پھر اسے کچھ کاٹ چھانٹ کر اور انگریزی روپ میں ڈھال کر رسالے کے سپرد کر دیا۔ جب یہ گفتگو چھپی تو اسے بالعموم پسند کیا گیا۔ خود عباس صاحب نے اس کے بارے میں خاصے اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اسے ان کے مجوزہ مجموعہ مضامین میں جس میں افسانے کے بارے میں مذکورہ کھلا مکتوب بھی شامل تھا، شریک اشاعت کر لیا جائے۔۔۔"(70)

آصف فرخی کا یہ انٹرویو نہ صرف غلام عباس شناسی کے لئے بلکہ افسانہ نگاری اور ادب کے بارے میں غور کرنے کے لئے مفید ہے۔ اس میں افسانے "اوورکوٹ" اور "آنندی" لکھنے کا پس منظر سے لے کر افسانے کی عظمت، ناول اور افسانے کا فرق اردو افسانہ نگاری کی خاصی رومانویت اور جنسیت کا دخل، اسلامی ادب، ترجمے کا مسئلہ وغیرہ مختلف موضوعات پر غلام عباس نے اظہار خیال کیا۔ ایک جگہ غلام عباس نے کہا:

"میں نے ایک دفعہ افسانے کے متعلق لکھا تھا کہ یہ ادب کی سہل ترین صنف ہے جس کے لئے لکھنے والے کا عالم فاضل ہونا ضروری نہیں۔ شاعری میں عروض وغیرہ کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ تاریخ دان کو تاریخی مواد جمع کرنا پڑتا ہے۔ ڈراما نویس کو اسٹیج کی ٹیکنیک سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ناول نویس کو بے حد صبر کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ناول لکھنے میں بعض دفعہ دس دس برس لگ جاتے ہیں، لیکن افسانہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو شخص اپنے عزیزوں، دوستوں کو طویل خط لکھتا رہا ہو یا لکھ سکتا ہو، وہ تھوڑی سی کوشش سے افسانہ بھی لکھ سکتا ہے، لیکن اس آسانی میں یہ امر بھی یاد رکھئے کہ جو چیز دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے، اتنی ہی وہ مشکل بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"(71)

غلام عباس نے کہا کہ انہوں نے ایک مرتبہ افسانہ نگاری کے متعلق لکھا تھا یہ 1961ء کے رسالہ "ہم قلم" میں شائع شدہ "افسانہ میری نظر میں" کی بات ہو سکتی ہے چنانچہ اس مضمون کا آغاز بھی یوں شروع ہوتا ہے:

"میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں۔۔۔"(72)

بہرحال آصف فرخی کا یہ انٹرویو غلام عباس کی افسانہ نگاری پر بحث کرنے کے لئے ضروری مواد فراہم کرتا ہے۔

1990ء میں وقاص احمد خواجہ کا غلام عباس پر مضمون اخبار "Frontier Post" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا اور اس میں غلام عباس کی افسانہ نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ (73)

اسی طرح اس سال میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے مضامین کا مجموعہ "باتیں" شائع ہوا۔ [74] اس میں سجاد باقر رضوی نے غلام عباس کو اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز قرار دیا ہے چنانچہ سجاد باقر رضوی نے لکھا:

"غلام عباس کے پاس نہ تو کوئی گھڑا گھڑایا مفروضہ تھا اور نہ کوئی بنا بنایا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ نہ وہ انسان کو بنیادی طور پر نیک سمجھتے تھے اور نہ بنیادی طور پر بد۔ البتہ یہ کہ وہ انسانی معاشرت میں بدی کی صورتحال کا ماخذ تصنع اور ریاکاری کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تصنع اور ریاکاری نفس یا انا کی تسکین کے لئے انسانی اوزار تھے--- یوں دیکھئے تو غلام عباس کے افسانوی مواد میں انسانی بدی کا مطالعہ ایک خاص اور اہم جہت رکھتا ہے۔ یوں وہ انسانی نیکیوں کی تلاش کے رومانی طریق کار سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر کلاسیکی ہے اور وہ یہ کہ جب انسانی زندگی اپنے حدود کو تسلیم نہیں کرتی تو اعلیٰ قدریں، نیکیاں اور اعلیٰ معیارات بدی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کلاسیکی نقطۂ نظر اشیاء اور انسانوں کو حدود میں دیکھتا ہے جبکہ رومانی نقطۂ نظر لامحدود کی تلاش کرتا ہے یہی وہ فرق ہے جو غلام عباس کو اپنے ہم عصر اور ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ممیّز کرتا ہے۔" [75]

اپریل 1990ء میں غلام عباس کے ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" کی تین قسطوں کا جاپانی ترجمہ رسالہ "اردو ادب" میں شائع ہوا۔ [76] یہ ترجمہ خاکسار راقم الحروف نے کیا اور اس ناولٹ کی چوتھی پانچویں اور چھٹی قسطوں کا ترجمہ بھی ستمبر 1991ء میں اسی رسالے میں شائع ہوا۔ [77]

جنوری 1991ء کے رسالہ "ماہ نو" میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون چھپا۔ اس کا عنوان "غلام عباس کے مرد و زن کی دنیا" ہے۔ [78] مضمون کا عنوان "مرد و زن کی دنیا" ہے اور یہ مضمون بعد میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضامین کے مجموعہ "افسانہ اور افسانہ نگار" میں شامل کیا گیا۔ [79]

پھر مارچ 1991ء میں شہزاد منظر کی کتاب "غلام عباس ایک مطالعہ" شائع ہوئی۔ [80] اس میں ضمیمے کے طور پر غلام عباس کا غیر مطبوعہ انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں اغلاط (مثلاً "غلام عباس نے آنندی کو 1947ء میں لکھا" [81] "گوندنی والا تکیہ 1953ء میں تکمیل تک پہنچا اور اسی سال میں ہندوستان سے یہ کہانی چھپ گئی۔ [82] وغیرہ) موجود ہونے کے باوجود غلام عباس کی سوانح کو سمجھنے کے لئے بہت ہی اہم واقعات شامل ہوئے ہیں۔ بچپن سے لے کر 1980ء تک کے مفصل بیانات نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر بچپن اور قیام دلی، پھر لندن سے واپسی کے فوراً بعد کے غلام عباس کے حالات معلوم کرنے کے لئے یہ انٹرویو بہت مفید ہے۔ پھر اس میں افسانہ لکھنے کا طریقہ، غلام عباس کے پسندیدہ تین افسانے "سرخ گلاب" "حمام میں" "آنندی" کا ذکر وغیرہ قابل توجہ ہیں۔ [83]

شہزاد منظر کی اس کتاب کے بارے میں پہلے ذکر ہو چکا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں جتنے مضامین شامل ہیں وہ 1983ء کے ارد گرد لکھے گئے ہوں گے۔ کیونکہ ان مضامین کا بنیادی مواد اس انٹرویو سے لیا گیا ہے۔ شہزاد منظر نے ایک جگہ لکھا ہے:

"فنی اعتبار سے بیدی (راجندر سنگھ) غلام عباس سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ فنی پختگی اور رچاؤ ہے اور ان کے افسانے دلوں کو زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس میں فرق یہ ہے کہ بیدی کے تمام افسانوں کی سطح اور معیار یکساں ہے جبکہ غلام عباس کے تمام افسانے فنی اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان کے بعض افسانے بہت اچھے، بعض کم اچھے اور بعض بہت برے ہیں جبکہ بیدی کے افسانوں کی سطح میں اس قدر اتار چڑھاؤ نظر نہیں آتا۔"(84)

اس میں صرف موضوعاتی انداز موجود ہے نہ کہ معروضی جائزہ صرف دعویٰ ہے، کوئی ثبوت نہیں۔ اگر غلام عباس کے تمام افسانے فنی اعتبار سے ایک جیسے نہیں تو کیسے؟ --- "بعض بہت اچھے" افسانے کون کون سے ہیں؟ اور "بعض کم اچھے" کون سے اور "بعض برے" کون سے؟ بہرحال اس کتاب میں جو انٹرویو شامل ہے وہ غلام عباس شناسی کے لئے مفید ہے۔

جون 1991ء کے رسالہ "قومی زبان" میں ممتاز احمد خاں کا مضمون "گوندنی والا تکیہ" شائع ہوا۔ (85)

1991ء میں علی گڑھ سے ڈاکٹر صغیر افراہیم کی کتاب "اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل" شائع ہوئی۔ یہ صغیر افراہیم کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی کتابی صورت ہے۔ اس میں غلام عباس کی چند کہانیوں کا ذکر موجود ہے جو 1927ء اور 1928ء میں رسالہ "نیرنگ خیال" اور "مخزن" میں چھپی تھیں۔ (86) پھر رسالہ "دائرے" میں شمیم احمد کا مضمون "غلام عباس کے افسانے" طبع ہوا۔ (87) یہ غلاب عباس کی افسانہ نگاری کے خلاف لکھا گیا واحد مضمون ہے۔ اور اس سال کے آخر میں غلام عباس کے گیارہ افسانوں کا جاپانی ترجمہ مجموعے کی صورت میں طبع ہوا۔ جس کا عنوان "آنندی" رکھا گیا اور خاکسار راقم الحروف اس کا مترجم ہے۔ اس مجموعے میں "اوور کوٹ"، "اس کی بیوی"، "بندر والا"، "تنکے کا سہارا"، "دو تماشے"، "آنندی"، "چکر"، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون"، "ناک کاٹنے والے"، "کتبہ" اور "ہمسائے" شامل ہیں۔ (88)

1992ء میں غلام عباس کے افسانوں کا مجموعہ "زندگی، نقاب، چہرے" کا تیسرا ایڈیشن، مکتبہ دانیال سے شائع ہوا (89) اور اسی ادارے سے "دھنک" کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ گیا۔ "دھنک" کا دوسرا ایڈیشن دراصل پہلے ایڈیسن پر نیا سرورق لگا کر چھاپ دیا گیا ہے۔ (90)

1992ء میں خاکسار راقم الحروف نے غلام عباس کے افسانہ "دھنک" کا حصہ جاپانی میں ترجمہ کرکے رسالہ "اردو ادب" میں چھاپ دیا[91] اور 1993ء میں باقی حصے کا ترجمہ مکمل کرنے[92] کے ساتھ ساتھ "دھنک کی اشاعت پر تحقیقی جائزہ" نامی ایک مضمون بھی پیش کیا۔[93] پھر 1994ء میں خاکسار راقم الحروف کا "غلام عباس کا تحقیقی جائزہ" نامی جاپانی مقالہ شائع ہوا۔[94] پھر 1994ء میں فضل جعفری کا مضمون 'غلام عباس کا افسانوی ادب' رسالہ "سوغات" میں شائع ہوا۔[95] اور اسی سال میں محمد حسن عسکری کے مضامین کا کلیات چھپ گیا تو اس میں غلام عباس کی افسانہ نگاری پر تنقیدی مضمون 'انسان اور آدمی' شامل کیا گیا۔ مگر عنوان 'غلام عباس کے افسانے' بنایا گیا ہے۔[96]

علاوہ ازیں غلام عباس شناسی کے لئے ایک اور اہم اضافہ یہ ہے کہ مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کی جتنی غیر مطبوعہ تحریریں موجود ہیں، انہیں رسالہ "غالب" کے غلام عباس نمبر میں شائع کئے جانے کا منصوبہ ہے۔ اس رسالے میں نہ صرف غلام عباس کی اپنی تحریریں ہوں گی بلکہ غلام عباس پر غیر مطبوعہ تنقیدی مضامین بھی شامل کئے جائیں گے۔ ان تنقیدی مضامین میں غلام عباس کی بیٹی کا مضمون "میرے ابا جان" بھی شامل ہے۔ جس میں لکھا گیا ہے کہ غلام عباس افسانے لکھتے وقت سب سے پہلے کرداروں کا تعین کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد پلاٹ بناتے ہیں۔ آخر میں افسانے کا عنوان تحریر کرتے ہیں۔[97] اسی طرح فتح محمد ملک کا "غلام عباس اور نیا افسانہ" اسلوب احمد انصاری کا "غلام عباس کے افسانے" فروغ احمد کا "غلام عباس--- آزاد خیال، صاحب طرز، قصہ گو افسانہ نگار" احمد یوسف کا "حمام میں" ممتاز احمد خاں کا "گوندنی والا تکیہ--- ایک کمزور ناول" اور مظفر علی سید کا "غلام عباس--- آنندی کے بعد" وغیرہ شامل ہوں گے۔ مظفر علی سید کا مضمون 72 صفحات پر مشتمل لمبا تنقیدی مضمون ہے اور اس طرح کے مضامین غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں کے ساتھ یکجا کئے جائیں تو غلام عباس کے بارے میں معلومات کا دائرہ مزید پھیل جائے گا۔

اس طرح غلام عباس کے انتقال کے بعد بھی ان کی افسانہ نگاری اور ادبی خدمات پر کئی مضامین لکھے گئے اور بعض کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں اگر اردو افسانہ کے متعلق کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو غلام عباس کا نام کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔ ایسی کتابوں کا نام بعد کی فہرست میں درج کیا گیا ہے۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو ادب پر بحث کرتے ہوئے غلام عباس کا ذکر ناگزیر ہے اور اسی وجہ سے اس پر اب بھی مضامین لکھے جارہے ہیں اور غلام عباس پر لکھنا صرف غلام عباس شناسی کے لئے نہیں بلکہ اردو ادب، خاص طور پر اردو افسانہ نگاری کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ غلام عباس کی قابلیت کی پہچان ان متعدد مضامین کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے۔

حواشی

(1) اخبار "جنگ" کراچی، 3 نومبر 1982ء
(2) اخبار "DAWN" کراچی، 2 نومبر 1982ء
(3) محمد اسلم "خفتگان کراچی" لاہور، 1991ء ص 221
(4) اخبار "DAWN" کراچی، 2 نومبر 1982ء
(5) اخبار "DAWN" کراچی، 3 نومبر 1982ء
(6) اخبار "DAWN" کراچی، 5 نومبر 1982ء
(7) ایضاً
(8) علی حیدر ملک 'غلام عباس کے انتقال پر مضمون، اخبار "جسارت" کراچی 5 نومبر 1982ء
(9) اخبار "DAWN" کراچی، 7 نومبر 1982ء
(10) سید انور "غلام عباس کی یاد میں" (غیر مطبوعہ) اس مضمون کا عکس مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ 25 لائن پر مشتمل 6 صفحات کا مضمون ہے۔ اس مضمون کے آخر میں 4 نومبر کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ مضمون 4 نومبر کو لکھا گیا۔
(11) سید انور، ایضاً۔ یہ کہانی اخبار "DAWN" کراچی 7 نومبر 1982ء میں بھی پیش کی گئی ہے۔
(12) ڈاکٹر جمیل جالبی 'غلام عباس' یہ مضمون 1991ء میں جمیل جالبی کے مضامین کے مجموعہ "معاصر ادب" میں شامل کیا گیا۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی "معاصر ادب" لاہور، 1991ء ص 226 تا 229)
(13) آصف فرخی "حرف من و تو" کراچی 1989ء ص 15
(14) اخبار "DAWN" کراچی 7 نومبر 1982ء
(15) شہزاد منظر 'غلام عباس'، "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" کراچی 1990ء ص 147 تا 154
(16) 'Ghulam Abbas of Anandi' رسالہ "MAG" کراچی 11 نومبر 1982ء ص 5 تا 7
(17) علی حیدر ملک "ہم سب غلام عباس کے اوورکوٹ سے نکلے ہیں" اخبار "جسارت" کراچی 12 نومبر 1982ء
(18) انور سدید "غلام عباس کی یاد میں" اخبار "جسارت" کراچی 12 نومبر 1982ء۔ اس مضمون کا مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔
(19) ستار طاہر 'غلام عباس کی یاد میں'، اخبار "امروز" لاہور 12 نومبر 1982ء ص 18
(20) اخبار "جنگ" (علم و ادب، تہذیب و ثقافت) کراچی 12 نومبر 1982ء
(21) 'غلام عباس کا فن عالمگیر اور لازوال ہے'، اخبار "خواتین" کراچی 13 نومبر 1982ء
(22) راغب شکیب 'جدید لکھاری کا خط غلام عباس کے نام'، اخبار "جسارت" کراچی 19 نومبر 1982ء
(23) منظر امکانی 'ادب میں درجہ بندی (غلام عباس کے بارے میں)' اخبار "امروز" لاہور 19 نومبر 1982ء
(24) شہزاد منظر 'عام انسانوں کا داستان گو غلام عباس'، رسالہ "آہنگ" کراچی 22 نومبر 1982ء ص 13 تا 14
(25) محشر بدایونی 'چند یادیں --- غلام عباس'، رسالہ "آہنگ" کراچی 22 نومبر 1982ء ص 15
(26) غلام عباس 'اوورکوٹ'، رسالہ "آہنگ" کراچی 22 نومبر 1982ء ص 16 تا 17

(27) ڈاکٹر نذیر احمد "بیگم غلام عباس کے نام ایک خط" (غیر مطبوعہ) 25 نومبر 1982ء

(28) علی حیدر 'پریس کلب میں غلام عباس مرحوم کی یاد' اخبار "جسارت" کراچی 3 دسمبر 1982ء

(29) خواجہ احمد عباس 'جہاں لنگوٹے لولے مسکراتے --- ہیں! (غلام عباس کی یاد میں)' اخبار "Blitz" کراچی' 11 دسمبر 1982ء (یہ مضمون اردو میں چھپا)

(30) راغب شکیب 'غلام عباس کی یاد میں' اخبار "جسارت" کراچی 24 دسمبر 1982ء

(31) 'غلام عباس دھیمے لہجے کا افسانہ نگار' رسالہ "پندرہویں صدی" کراچی' دسمبر 1982ء ص 64 تا 65

(32) راغب شکیب 'غلام عباس کی یاد میں' اخبار "جسارت" کراچی 7 جنوری 1983ء

(33) افضال احمد 'Ghulam Abbas A Valedictory' رسالہ "Third World International" کراچی 1983ء ص 79 تا 81

(34) غلام عباس 'Anandi' (انگریزی ترجمہ: مترجم انور عنایت اللہ) رسالہ "Third World International" کراچی 1983ء

(35) ایضاً

(36) نادیہ جلیل "مختصر افسانے کے نظریاتی مباحث اور غلام عباس کی افسانہ نگاری" (مقالہ برائے ایم اے اردو جامعہ پنجاب) غیر مطبوعہ لاہور 1983ء

(37) خالد حسن' فاروق حسن (مرتبہ) "Urdu Short Stories From Pakistan" دہلی 1983ء

(38) غلام عباس 'ناک کاٹنے والے' "کہانیاں (جلد اول)" (مرتبہ: ڈاکٹر مغنی تبسم' وحید انور) بمبئی 1983ء ص 350 تا 359

(39) غلام عباس 'دوسرا چشم چراغ' "کہانیاں (جلد اول)" (مرتبہ: ڈاکٹر مغنی تبسم' وحید انور) بمبئی 1983ء ص 360 تا 363

(40) قائم نقوی 'افسانے کا ایک دور غلام عباس' رسالہ "ماہ نو" لاہور جولائی 1983ء

(41) محمود الحسن 'غلام عباس کا اچھوتا تجربہ --- آنندی' رسالہ "ماہ نو" لاہور جولائی 1983ء

(42) عالم خاں 'غلام عباس --- نئے عہد کا داستان گو' رسالہ "ماہ نو" لاہور جولائی 1983ء

(43) غلام عباس 'یہ پری چہرہ لوگ' رسالہ "ماہ نو" لاہور جولائی 1983ء

(44) سید انور "غلام عباس کی برسی پر عقیدت کے پھول" (غیر مطبوعہ) یکم نومبر 1983ء۔ اس مضمون کے آخر میں 28 اکتوبر 1983ء کی تاریخ دی گئی ہے۔ یعنی اس تاریخ کو یہ لکھا گیا ہوگا۔ یہ مضمون مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے اور یہ 27 لائن پر مشتمل 4 صفحات کا مضمون ہے۔

(45) غلام عباس "زندگی' نقاب' چہرے" کراچی 1984ء

(46) لیکن اس نسخے میں چند غلطیاں نظر آتی ہیں جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہیں مثلاً افسانہ 'اس کی بیوی' میں ایک جملہ "اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا" کے بعد دوسرا جملہ "مجھے ثبوت مل گیا" نہیں ہے جو کہ "جاڑے کی چاندنی" میں موجود ہے۔

(47) ڈاکٹر محمد صادق "Twentieth Century Urdu Literature" کراچی 1983ء ص 314 تا 315

(48) احمد علی (مرتبہ) "Selected Short Stories From Pakistan" کراچی۔ 1984ء

(49) غلام عباس (جاپانی ترجمہ: مترجم: آسادہ یوتاکا) رسالہ "ہندوستانی ادب" ٹوکیو' 1984ء

(50) یونس جاوید "حلقہ ارباب ذوق" لاہور 1982ء

(51) ستار طاہر 'تضادات' رسالہ "تقاضے" لاہور یکم مئی' 1985ء

(52) ستار طاہر، ایضاً کیم جون 1986ء

(53) ستار طاہر، ایضاً کیم مئی 1985ء

(54) غلام عباس "اوورکوٹ" "کہانیاں (جلد دوم)" بمبئی 1985ء

(55) طاہر مسعود "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" کراچی، 1985ء

(56) ڈاکٹر محمد صادق "A History of Urdu Literature" (طبع دوم) کراچی 1985ء ص 591

(57) ڈاکٹر جمیل جالبی "ن م راشد --- ایک مطالعہ" کراچی 1986ء

(58) غلام عباس "اوورکوٹ" (انگریزی ترجمہ 'The Overcoat' مترجم: اشفاق نقوی اخبار "The Pakistan Times" 19 دسمبر 1986ء

(59) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" (طبع دوم) لاہور 1987ء

(60) انتظار حسین "ملاقاتیں" لاہور 1988ء

(61) ایضاً ص 20 تا 22

(62) ایضاً ص 34 تا 36

(63) ڈاکٹر انوار احمد "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" ملتان 1988ء

(64) ایضاً ص 253 تا 256

(65) ایضاً ص 257 تا 274

66) ایضاً ص 261 تا 262

(67) غلام عباس "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" (انگریزی ترجمہ "Mornings in the Wilderness" (مترجم: وقاص احمد خواجہ) لاہور 1988ء ص 169 تا 182

(68) آصف فرخی (مرتبہ) "حرف من و تو" کراچی 1989ء

(69) ایضاً ص 34

(70) ایضاً ص 16

(71) ایضاً ص 42

(72) غلام عباس "افسانہ میری نظر میں، رسالہ "ہم قلم" کراچی 1961ء ص 9

(73) وقاص احمد خواجہ "غلام عباس پر تنقیدی مضمون" (انگریزی) اخبار "Frontier Post" ن ن، 1990ء

(74) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی "غلام عباس، "باتیں" لاہور 1990ء ص 39 تا 40

(75) ایضاً

(76) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" (جاپانی ترجمہ، مترجم: سویامانے) رسالہ "اردو ادب" ٹوکیو، اپریل 1990ء

(77) غلام عباس، ایضاً ستمبر 1991ء

(78) ڈاکٹر سلیم اختر "غلام عباس کے مرد و زن کی دنیا" رسالہ "ماہ نو" لاہور جنوری 1991ء ص 18 تا 24

(79) ڈاکٹر سلیم اختر "افسانہ اور افسانہ نگار" لاہور 1991ء ص 188 تا 200

(80) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" لاہور مارچ 1991ء

(81) ایضاً ص 107 (1939ء درست ہے)

(82) ایضاً ص 112

(83) ایضاً ص 133

(84) ایضاً ص 112

(85) ممتاز احمد خاں "گوندنی والا تکیہ"، رسالہ "قومی زبان" کراچی، جون 1991ء ص 55 تا 58

(86) ڈاکٹر صغیر افراہیم "اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل" علی گڑھ 1991ء ص 193 تا 195

(87) شمیم احمد "غلام عباس کے افسانے"، رسالہ "دائرے" کراچی، جولائی اگست 1991ء ص 9 تا 24

(88) غلام عباس "آنندی" (جاپانی ترجموں کا مجموعہ، مترجم: سویامانے) اوساکا دسمبر 1991ء

(89) غلام عباس "زندگی، نقاب، چہرے" (طبع سوم) کراچی 1992ء

(90) غلام عباس "دھنک" (طبع دوم) کراچی 1992ء

(91) غلام عباس "دھنک" (جاپانی ترجمہ، مترجم: سویامانے) رسالہ "اردو ادب (4)" ٹوکیو 1992ء

(92) غلام عباس، ایضاً رسالہ "اردو ادب (5)" ٹوکیو 1993ء

(93) سویامانے "دھنک کی اشاعت پر تحقیقی جائزہ (جاپانی)" رسالہ "اردو ادب (5)" ٹوکیو 1993ء ص 1 تا 7

(94) سویامانے "غلام عباس کا تحقیقی جائزہ (1)" (جاپانی) رسالہ (تحقیقات زبانہائے و ادب خارجہ (16)" اوساکا 1994ء ص 91 تا 112

(95) فضل جعفری "غلام عباس کا افسانوی ادب" رسالہ "سوغات" 1994ء

(96) محمد حسن عسکری "مجموعہ محمد حسن عسکری" لاہور 1994ء ص 146 تا 151

(97) غلام عباس کی بیٹی کا یہ مضمون اردو میں ہے اور 15 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

0 – 4 – 1 غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریریں

غلام عباس کے سوانح کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ غلام عباس نے افسانوں کے علاوہ کہانیاں، نظمیں، ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے، لیکن غلام عباس کی بعض ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جو آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ ایسی تمام تحریروں کی فہرست ہم تین مقامات پر دیکھ سکتے ہیں۔ یعنی

1۔ غلام عباس کی بنائی ہوئی افسانوں کی فہرست
2۔ آصف فرخی کی بنائی ہوئی غلام عباس کی تحریروں کی فہرست
3۔ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ غیر مطبوعہ تحریریں

ان تینوں حوالوں کے ذریعے ہم غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ اس باب میں غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

1 – 4 – 1 غلام عباس کی بنائی ہوئی افسانوں کی فہرست

غلام عباس اپنی زندگی میں ”کن رس“ کے بعد چوتھا افسانوی مجموعہ شائع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس مجموعے کا عنوان بھی ”خوانِ یغما“ تجویز ہو چکا تھا۔ غلام عباس کے ایک ذاتی نوٹ میں اس مجموعے کی فہرست یوں بنائی گئی ہے:

”خوانِ یغما“

1- جیب کترا
2- زہریلی مکھی
3- آپ بیتی
4- چند خطوط
5- ناول نویس
6- عید کا تحفہ
7- جوہر کامل
8- موت کا درخت
9- کثافت صحافت
10- مقبرہ
11- ترکی
12- [1]

اس فہرست کے بارے میں چند باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ یعنی پہلی بات یہ ہے کہ غلام عباس نے لفظ ”یغمہ“ لکھا ہے مگر یہ ”یغما“ درست ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نمبر ۱۱ میں صرف ”ترکی“ لکھا گیا ہے مگر یہ ”ترکی ٹوپی“ ہوسکتا ہے جو 1928ء کے رسالہ ”نیرنگ خیال“ میں شائع ہوا تھا[2] اور یہ بعد میں رسالہ ”ماہ نو“ میں 1948ء میں دوبارہ طبع ہوا تھا[3] اور ”ماہ نو“ میں کہانی کی آخر میں لکھا گیا

ہے کہ یہ فرانسیسی افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس لئے اگر لفظ "ترکی" سے شروع ہونے والے عنوان کے افسانے کو "ترکی ٹوپی" سمجھا جائے تو یہ غلام عباس کا طبع زاد نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ترجمہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح اس فہرست کے آخر میں نمبر 12 دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غلام عباس ایک اور افسانہ اس مجموعے میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال اس فہرست سے ہمیں کل گیارہ افسانوں کے عنوانات معلوم ہو سکتے ہیں اور ان میں سے "جیب کترا، زہریلی مکھی، آپ بیتی اور چند خطوط" رسالہ "ماہ نو" میں غلام عباس کی زندگی میں شائع ہو چکے ہیں۔[4]

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ کے پاس نومبر 1956ء کا رسالہ "ماہ نو" موجود ہے جو دراصل غلام عباس کی ملکیت تھا۔ اس رسالے میں "زہریلی مکھی" طبع ہوا ہے اور غلام عباس نے شائع ہونے کے بعد اپنے قلم سے اس افسانے کی تصحیح کی۔ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ اس شمارے میں اصلاح کے نشان نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہ بات ممکن ہے کہ غلام عباس اس افسانے کی اصلاح کرنے کے بعد دوبارہ شائع کرانے کی خواہش رکھتے ہوں اور نمبر ۱۱ کے افسانے کو "نیرنگ خیال" والا افسانہ سمجھا جائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ غلام عباس کے ذہن میں کل 6 غیر مطبوعہ افسانے تھے جنہیں غلام عباس خود مجموعے کی صورت میں شائع کرانا چاہتے تھے یعنی "ناول نویس، عید کا تحفہ، جوہر کامل، موت کا درخت، کثافت صحافت اور مقبرہ" کو غلام عباس کے غیر مطبوعہ افسانے قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ سارے غیر مطبوعہ افسانے کہاں ہیں۔ اس وقت ہمیں صرف عنوانات معلوم ہیں۔

حواشی

(1) غلام عباس "فہرست (غیر مطبوعہ)" یہ فہرست خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

(2) غلام عباس 'ترکی ٹوپی'، رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور مارچ 1928ء

(3) غلام عباس 'ترکی ٹوپی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی جولائی 1948ء

(4) غلام عباس 'جیب کترا'، رسالہ "ماہ نو" کراچی جنوری 1957ء ص 24 تا 26
غلام عباس 'زہریلی مکھی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی نومبر 1956ء ص 26 تا 30
غلام عباس 'آپ بیتی'، رسالہ "ماہ نو" کراچی مارچ 1956ء ص 14 تا 16
غلام عباس 'چند خطوط'، رسالہ "ماہ نو" کراچی اپریل 1956ء ص 33 تا 35

1 – 4 – 2 آصف فرخی کی بنائی ہوئی غلام عباس کی تحریروں کی فہرست

غلام عباس کے آخری زمانے کے عزیز دوستوں میں سے ایک آصف فرخی ہیں۔ جنہوں نے غلام عباس کے افسانہ "آنندی" کا انگریزی ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں غلام عباس کا انٹرویو شائع کرایا تھا۔ آصف فرخی کی مرتب کردہ کتاب "حرف من وتو" غلام عباس شناسی کے لئے اور ان کی افسانہ نگاری کے لئے ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور غلام عباس نے بھی آصف فرخی کے پہلے افسانوی مجموعے "آتش فشاں پر کھلے گلاب" کے لئے ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔ ان باتوں سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس اور آصف فرخی کے درمیان کتنی گہری دوستی تھی۔

آصف فرخی کے پاس افسانہ "آنندی" کا قلمی مسودہ بھی ہے۔ اسی طرح ان کو غلام عباس کے متعلق معلومات بھی ہیں۔ آصف فرخی نے غلام عباس پر کام کرتے ہوئے غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں کی فہرست بنائی۔

اس فہرست میں موضوعات کے مطابق 23 تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ آصف فرخی نے لکھا ہے:

افسانے:

1- بہادری (اناطول فرانس)--- "ساقی" افسانہ نمبر
2- سبز طوطا
3- قینچی کے دو پھل
4- ایک دل پسند مصنف
5- سنسنی پیدا کرنے والی نامہ نگاری

مضامین:

1- دریائے نیل
2- موسموں کی بہاریں
3- کچھ موسیقی کے بارے میں
4- کچھ افسانے کے بارے میں --- رسالہ "ہم قلم"
5- انگریزی کے تین بڑے شاعر
6- افتادِ جوانی --- رسالہ "ماہِ نو"
7- امیر خسرو (بحیثیت ماہر موسیقی)
8- حاشئے --- رسالہ "نیا دور"

شخصیات:

1- منٹو
2- شاہد احمد دہلوی
3- امتیاز علی تاج
4- پطرس
5- عبدالرحمٰن چغتائی

کہانیاں:

1- نواب صاحب کا بنگلہ
2- رینگنے والے
3- خاندانی مہم
4- بندر والا
5- روحی
6- یہ ننھی منی چڑیاں"(1)

اس فہرست کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ یعنی افسانہ "بہادری" فرانسیسی ادیب اناطول فرانس کے افسانے کا ترجمہ ہے اور اسے پہلے رسالہ "ساقی" کے افسانہ نمبر میں

شائع کیا گیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ "سبز طوطا" غلام عباس نے 1930ء میں رسالہ "تہذیب نسواں" میں شائع کرایا تھا۔ [2] "قینچی کے دو پھل"، "ایک دل پسند مصنف" اور "سنسنی پیدا کرنے والی نامہ نگاری" کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ طبع ہو چکے ہیں یا نہیں۔

"مضامین" کی فہرست میں "دریائے نیل" ہے۔ زینب عباس نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ بی بی سی لندن میں غلام عباس کا کام انگریزی خبروں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ اردو پروگرام کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ جب دنیا کے مشہور دریاؤں کے بارے میں پروگرام بنا رہے تھے تو ان کے دوست "وقار" نے دریائے سندھ یا دریائے نیل کا پروگرام نشر کرایا تھا۔ پھر جب غلام عباس دریائے ٹیمز اور دریائے سین کا پروگرام بنا رہے تھے تو انھوں نے کرس (زینب عباس) سے مسودہ لکھنے کو کہا۔ [3]

اگر زینب عباس کی بات کو مانا جائے اور آصف فرخی کی فہرست کے مضمون "دریائے نیل" کو یہی بی بی سی والا مضمون سمجھا جائے تو یہ غلام عباس کا مضمون نہیں بلکہ "وقار" کا ہوگا مگر اس کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مضمون "کچھ افسانے کے بارے میں" رسالہ "ہم قلم" میں شائع ہوا تھا۔ 1961ء میں رسالہ "ہم قلم" میں "افسانہ میری نظر میں" کے عنوان سے غلام عباس کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ [4] اس لئے ممکن ہے کہ آصف فرخی کی فہرست کا مضمون یہی 1961ء والا مضمون ہو۔

مضمون "انگریزی کے تین بڑے شاعر" کا مسودہ اس وقت مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے اور اس کا عنوان "انگریزی کے تین بڑے شاعر --- ملٹن، جان ڈرائڈن، الگزینڈر پوپ" ہے۔ [5] یہ مسودہ 30 لائنوں پر مشتمل ساڑھے چار صفحات کا ہے اور اس مسودے کے کاغذ پر "Government of Pakistan. 1965" لکھا ہوا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مضمون 1965ء کے بعد تحریر کیا گیا مگر یہ معلوم نہیں کہ چھپا یا نہیں۔

مضمون "افتادِ جوانی" اور "حاشئے" کے بارے میں اس فہرست سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں "ماہ نو" اور "نیا دور" میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہیں غیر مطبوعہ نہیں کہا جا سکتا۔

شخصیت کے متعلق مضامین میں سے "منٹو" رسالہ "نقوش" کے "منٹو نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ [6]

امتیاز علی تاج کے بارے میں غلام عباس نے ایک مضمون لکھا تھا اور یہ مسودہ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے۔ یہ 13 لائنوں پر مشتمل ساڑھے چار صفحات کا مضمون ہے اور اس کا آغاز یوں ہے:

"کئی سال ہوئے سید امتیاز علی تاج نے ایک ڈرامہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "میری جان کس!

نے لی؟" اس ڈرامے میں آخر تک یہ کھل نہیں پاتا کہ ہیرو کا اصل قاتل کون تھا۔
قدرت کا یہ بڑا ظالمانہ مذاق معلوم ہوتا ہے کہ آج ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے پر بھی سید امتیاز علی تاج کے قاتلوں کا سراغ نہ لگایا جاسکا اور نہ یہ لمحہ ہو سکا کہ ان کے قتل کی اصل محرک کیا چیز تھی، دشمنی، انتقام یا محض چوری؟"[7]

امتیاز علی تاج کا قتل 19 اپریل 1970ء کو ہوا تھا۔ اس لئے اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ غلام عباس نے اس مضمون کو 1971ء میں لکھا۔

پطرس بخاری پر مضمون کا مسودہ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے۔ یہ 9 صفحات پر مشتمل مضمون ہے[8] مگر نامکمل ہے۔ چونکہ اس زمانے میں غلام عباس کی طبیعت خراب رہی اس لئے پطرس کی یاد میں مضمون لکھ کر رسالہ "نقوش" کے "پطرس نمبر" میں پیش کرنا تھا مگر یہ نہیں ہو سکا بلکہ "نقوش" کے پطرس نمبر میں غلام عباس کا محمد طفیل کے نام ایک خط طبع ہوا۔[9] اگر اس بات کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ پطرس بخاری پر غلام عباس کا مضمون مکمل نہیں ہو سکا مگر یہ بھی ممکن ہے کہ غلام عباس نے بعد میں پطرس پر مکمل مضمون لکھا ہو اور یہ مسودہ کہیں گم ہو گیا ہو۔

عبدالرحمٰن چغتائی پر مضمون کے بارے میں کچھ معلوم نہیں حالانکہ غلام عباس نے عبدالرحمٰن چغتائی کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں آغا عبدالحمید کے ساتھ گفتگو کر کے "چغتائی --- چند یادیں" کے عنوان سے وزیر آغا کی مرتب کردہ کتاب "عبدالرحمٰن چغتائی --- شخصیت و فن" میں شامل کرنے دیا۔[10] یہ تحریر گفتگو کی شکل میں مذکورہ کتاب میں شائع ہوئی ہے، بہ شکل مضمون نہیں۔

کہانیوں کی فہرست کو دیکھا جائے تو ان میں سے "نواب صاحب کا بنگلہ"، "رینگنے والے"، "بندر والا" اور "روحی" طبع ہو چکے ہیں۔[11] "خاندانی مہم" کا معلوم نہیں ہوا مگر "خاندانی معاملے" نامی ایک افسانہ غلام عباس نے لکھا تھا اور کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔[12]

"یہ ننھی منی چڑیا" کا مسودہ مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہے اور یہ مکمل صورت میں ہے۔[13]

یوں دیکھا جائے تو آصف فرخی کی اس فہرست سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس کے چند مضامین، ایک ترجمہ، شخصیات کے متعلق مضامین اور افسانے ہیں جو آج تک طبع نہیں ہوئے مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ ساری تحریریں آج دستیاب ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ بعض محفوظ ہیں مگر بعض کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔

حواشی

(1) ڈاکٹر آصف فرخی "فہرست" (غیر مطبوعہ) یہ فہرست مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔
(2) غلام عباس 'سبز طوطا' رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور 4 جنوری 1930ء، ص 26 تا 31
(3) زینب عباس "You Never Can Tell" (غیر مطبوعہ) س ن، ص 261
(4) غلام عباس "افسانہ میری نظر میں' رسالہ "ہم قلم" کراچی 1961ء ص 9 تا 11
(5) غلام عباس "انگریزی کے تین بڑے شاعر۔۔۔ ملٹن، جان ڈرائڈن، الگزینڈر پوپ" (غیر مطبوعہ)
(6) غلام عباس 'منٹو کی موت' رسالہ "نقوش" منٹو نمبر لاہور 1955ء ص 353 تا 354
(7) غلام عباس 'سید امتیاز علی تاج' (غیر مطبوعہ) س ن (1971ء؟)
(8) غلام عباس 'پطرس بخاری کے وفات کے موقع پر مضمون" (غیر مطبوعہ) س ن
(9) غلام عباس 'محمد طفیل کے نام ایک خط' رسالہ "نقوش" پطرس نمبر لاہور 1956ء
(10) غلام عباس 'چغتائی۔۔۔ چند یادیں' "عبدالرحمٰن چغتائی۔۔۔ شخصیت اور فن" (مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا) لاہور
(11) غلام عباس 'نواب صاحب کا بنگلہ' "1971ء کے منتخب افسانے" اسلام آباد 1972ء ص 9 تا 11
غلام عباس 'رینگنے والے' رسالہ "نیا دور" شمارہ 56 تا 60 کراچی س ن ص 13 تا 24
غلام عباس 'بندروا' رسالہ "افکار" کراچی 1981ء ص 53 تا 59
غلام عباس 'روحی' رسالہ "تخلیقی ادب (۱)" کراچی 1970ء ص 242 تا 256
(12) ڈاکٹر انوار احمد "اردو افسانہ تحقیق اور تنقید" ملتان ص 1988ء ص 256
(13) اس افسانے کے بارے میں اگلے باب میں ذکر کیا جاتا ہے۔

3-4-1 مشفق خواجہ کے پاس محفوظ غیر مطبوعہ تحریریں

غلام عباس شناسی کے لئے مشفق خواجہ کے پاس محفوظ تحریروں، اخباروں، رسائل اور خطوط کا دیکھنالازمی ہے اور ان چیزوں سے غلام عباس شناسی کے متعلق بہت سی نئی باتیں ہمارے سامنے نظر آتی ہیں۔ سوانحی مطالعے کے حصے میں غلام عباس کے نام خطوط کے ذریعے ہمیں غلام عباس کے حالات زندگی اور تصانیف کی اشاعت کے بارے میں مسائل وغیرہ کا خوب علم ہوا۔ اسی طرح مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کی بعض ایسی تحریریں موجود ہیں جو آج تک شائع نہیں ہوئیں۔
مشفق خواجہ کاارادہ یہ ہے کہ غلام عباس کے متعلق جتنی غیر مطبوعہ تحریروں ہیں، انھیں ادبی رسالہ "غالب" کے "غلام عباس نمبر" میں شائع کیا جائے اور ان کے ساتھ غلام عباس پر تنقیدی مضامین بھی چھپوائے جائیں تاکہ غلام عباس شناسی کے لئے سارے حوالے یکجا ہو جائیں۔ غیر مطبوعہ تحریریں مکمل طور پر رسالہ "غالب" میں طبع ہو جائیں گی۔ یہاں مختصراً ان تحریروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کی جتنی غیر مطبوعہ تحریریں موجود ہیں ان کو اصناف کے حوالے سے تقسیم کیا جائے تو نثر اور نظم دونوں نظر آئیں گی اور انھیں مزید تقسیم کیا جائے تو یوں فہرست بنائی جائے گی۔

نثر:

1- افسانہ

2- ڈرامہ

3- مضامین

4- ترجمہ

نظم:

1- غزل

2- مثنوی

اب اس فہرست کے مطابق غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

حصہ نثر

1- افسانہ:

غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریروں میں 9 افسانے موجود ہیں اور ان میں سے ایک انگریزی میں ہے اور ان میں سے 6 افسانے مکمل صورت میں ہیں اور 3 نامکمل ہیں۔

مکمل صورت کے 6 افسانوں میں سے 4 افسانوں کے عنوانات بھی لکھے گئے ہیں۔ یعنی "اغواء، یہ ننھی منی چڑیاں اور تتلی اور گلاب" اور "The Phoenix" ہیں۔ باقی دو افسانوں کے عنوانات نہیں دیئے گئے۔

"اغواء" 20 لائنوں پر مشتمل 7 صفحات کی کہانی ہے [1] اور "یہ ننھی منی چڑیاں" 20 لائنوں پر مشتمل 6 صفحات کی کہانی ہے۔ [2] اس کہانی کا آغاز یوں ہے:

"مجھے بچپن ہی سے پرندے پالنے کا شوق تھا۔ جب میری عمر کوئی دس گیارہ برس کی تھی تو میں نے ایک شخص کے پاس زرد زرد پروں والا ایک چھوٹا سا خوبصورت پرندہ دیکھا جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص نے وہ پرندہ اپنی انگلی پر بٹھا رکھا تھا۔ ایک مضبوط ڈوری اس کی کمر سے بندھی تھی جس کا سرا اس شخص نے اپنی انگلی پر لپیٹ رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ اس خوبصورت پرندے کو بیا کہتے ہیں اور یہ کسی حد کے کرتب دکھاتا ہے---" [3]

اسی طرح اس کہانی کا اختتام دیکھئے:

"--- مگر پھر بجائے اس کے کہ وہ اندر جاتیں، اندر والی جتی اور سرخ اچانک پھدک کر پنجرے کے دروازے سے باہر نکل آئے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے آن کی آن میں وہ پانچوں کی پانچوں چڑیاں ایک ساتھ باغیچے کی طرف اڑ گئیں۔ میں ان چڑیوں کی چالاکی اور

اپنی بے وقوفی پر ہاتھ ملتا کا ملتا رہ گیا۔ "(4)

کہانی "تتلی اور گلاب" کے عنوان کے نیچے غلام عباس نے لکھا کہ:

"آٹھ سے دس برس تک کی عمر کے بچوں کے لئے۔ "(5)

"ایک تھی تتلی اور ایک تھا گلاب کا پھول دونوں باغ کے ایک کونے میں الگ تھلگ رہتے تھے۔

تتلی گلاب کے پھول کو اپنا سہانا ناچ دکھاتی اور گلاب اسے دیکھ کر جھومتا اور مارے خوشی کے اپنی خوش پتیاں کھول دیتا کہ تتلی جتنا رس چاہے چوس لے۔ دونوں میں دوستی تھی اور وہ اپنی چند روزہ زندگی خوش خوش گزار رہے تھے۔۔۔ "(6)

پھر یہ کہانی یوں ختم ہو جاتی ہے:

"۔۔۔ یہ کہا اور اپنے خوشنما پر ہوا میں لہراتی اٹھکیلیاں کرتی، باغ کے اسی حصے کی طرف چل دی جس طرف حسین تتلیوں کا جھرمٹ گیا تھا۔ جہاں چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ رنگا رنگ اور قسم قسم کے پھول گملوں میں لگے تھے اور سنگ مرمر کے حوض میں لال لال خوبصورت مچھلیاں تیرتی تھیں۔ "(7)

"The Phoenix" غلام عباس کی انگریزی کہانی ہے۔ جس کا مسودہ 12 لائنوں پر مشتمل ساڑھے تین صفحات کا ہے۔ کہانی کے آخر میں انگریزی میں "Ghulam Abbas" لکھا جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبع زاد ہو گا۔ اس کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"When the phoenix grew a thousand years old, and the time came for him to die, he gathered dry havel(?) and twigs and made a funeral pile in his nest..." (8)

یہ غلام عباس کی واحد انگریزی کہانی ہے جو دستیاب ہے۔ اس حوالے سے اسے دلچسپ متن کہا جاسکتا ہے مگر اس کہانی کا سن تصنیف نہیں دیا گیا۔ ان کہانیوں کے علاوہ ایسے دو افسانے موجود ہیں جن کے عنوانات نہیں دیئے گئے لیکن مکمل صورت میں محفوظ ہیں۔

ان میں سے ایک افسانہ 21 لائنوں پر مشتمل 42 صفحات کا ہے یعنی "آنندی" سے بھی لمبی کہانی ہے۔ یہ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"یہ اس زمانے کا قصہ ہے کہ لڑکپن جوانی میں بدل رہا تھا۔ مجھے پھوپھا نے پالا ہوا تھا کیونکہ امی جان میرے لڑکپن ہی میں قضا کر گئی تھیں۔ پھوپھی جان اپنے زمانے میں بہت شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ گانے میں کوئی طوائف ان سے بڑھ کر نہ تھی اور دور دور سے انہیں

گانے کے لئے بلوایا جاتا تھا۔ وہ بہت طبیعت دار، ملنسار اور سمجھ دار تھیں۔۔۔"(9)

اور کہانی یوں ختم ہوتی ہے:

"کریم نے کہا کہ چلو بھئی (؟) انتظار کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں۔ آدھی رات کو جب ہم تماشا دیکھ کر واپس آئے تو منشی جی کی ادم (؟) اعرابی کے پاس سدھار ہو چکی تھی۔"

یہ کہانی ختم ہونے کے بعد غلام عباس نے ایک نشان "X" لگایا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔

اسی طرح ایک اور مکمل افسانہ ہے جس کا عنوان نہیں دیا گیا۔ اس کہانی کا مسودہ 12 لائنوں پر مشتمل 35 صفحات کا ہے اور اس کا آغاز یوں ہے:

"آدھی رات ادھر ادھر، سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار، بستی سے دور ایک اجڑے مقام پر اگلے وقتوں کا ایک برج بنا ہے۔ اس کی دیواریں سیاہ پتھر کی ہیں، اس کا دروازہ لوہے کا ہے۔ باہر ایک نوجوان سپاہی ہاتھ میں ننگی تلوار لئے پہرہ دے رہا ہے۔۔۔"(10)

اور اس کا اختتام:

"نوجوان سپاہی کو دیکھ کر ملکہ مہر نگار نے اپنی نظریں شرم سے جھکا لیں۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دبی زبان سے کہا:

"اے نوجوان تو نے سچ مچ میری عقل گم کر دی تو نے مجھے جیت ہی لیا۔"(11)

ان افسانوں کے علاوہ غلام عباس کے بعض ایسے افسانے موجود ہیں جو نامکمل ہیں۔ ایسے افسانوں کی تعداد تین ہے اور ان میں سے صرف ایک کہانی کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس کا عنوان "شاعر اعظم" ہے۔ اس کہانی کے 27 لائنوں پر مشتمل صرف 6 صفحات دستیاب ہیں۔ آگے شاید نہیں لکھا جا سکا۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"پہلی مرتبہ جب مجھے دمشق جانے کا اتفاق ہوا تو میرا عنفوان شباب تھا۔ ملاقات تو درکنار، اس کے مکان کے سامنے سے گزرنے کی بھی مجھے جرات نہ تھی۔۔۔"(12)

معلوم نہیں کہ یہ مسودہ کب لکھا گیا۔

باقی دو افسانے ایسے ہیں جو نامکمل ہیں اور عنوان بھی نہیں دیا گیا اور ان میں سے ایک کے مسودے میں کہانی کے 8 ابواب کے عنوانات دیئے گئے ہیں مگر صرف پہلا باب ہی مکمل صورت میں ہے اور باقی صرف عنوانات لکھے گئے ہیں۔ 8 عنوانات کی فہرست یہ ہے:

"1۔ تقریر مولانا صبغت اللہ

2۔ فرقہ پسند ہندو اخبار کے تاثرات

3- ننّی کا قصہ

4- خط مولانا صبغتہ اللہ کے نام حرم پیلی بھیت کا

5- تقریر مولانا صبغتہ اللہ

6- عام تباہی

7- پرتھوی کی بپتا

8- کلی رو تار"(13)

اور کہانی شروع ہونے سے پہلے غلام عباس نے یہ لکھا:

"یہ افسانہ میں نے دو سال قبل لکھا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔ یہ افسانہ میں نے کس جذبے کے تحت لکھا۔ یہ اس خدائے بزرگ و برتر ہی کو معلوم ہے جو دلوں کا حال جانتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"(14)

اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افسانہ اس مسودے کے لکھے جانے سے دو سال پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ یعنی اب ہمارے سامنے ایسا مسودہ موجود ہے جو دوبارہ لکھا جا رہا تھا۔ یہ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"ہندوستان سے مسلمانوں کو کلیتاً ختم کر دینے کے منصوبے بنائے گئے ہیں۔۔۔ شہروں قصبوں اور دیہات میں مسلم کش فسادات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں ان فسادات میں ہزاروں مسلمان مرد عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔"(15)

اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہانی فسادات کے متعلق ہوگی مگر اس کے ساتھ حیرت کا احساس بھی ہوتا ہے کہ غلام عباس اس طرح فسادات کو موضوع بنا کر افسانہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

دوسرے افسانے کا بھی صرف پہلا باب دستیاب ہے اور یہ مسودہ 8 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز یوں ہے:

"الٰہی بخش کا شمار شہر کے بڑے بڑے ٹھیکہ داروں میں ہوتا تھا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اس نے ایک معمار کی حیثیت سے ترقی کر کے ہزاروں روپے کی جائیداد پیدا کر لی تھی بلکہ اس کو فن تعمیر سے واقفیت، اپنے کام میں انہماک اور محنت و مستعدی کے باعث اسے ٹھیکہ داروں میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔۔۔"(16)

2- ڈرامہ:

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کے تین غیر مطبوعہ ڈرامے ہیں۔ ان میں سے دو مکمل ہیں اور

ان دو ڈراموں میں سے ایک کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کا نام "ننھی کی گڑیا" ہے اور اس کے ساتھ لکھا گیا کہ یہ "ایک ایکٹ کا ایک کھیل" ہے۔"(17)

"ننھی کی گڑیا" 19 لائنوں پر مشتمل 8 صفحات کا ڈرامہ ہے اور اس کا مسودہ یوں شروع ہوتا ہے۔

کردار:

رشید: عمر دس سال

اقبال: عمر بارہ سال

(دو بھائی)

ننھی: عمر سات سال--- ان کی بہن

(بچوں کے پڑھنے لکھنے کا کمرہ۔ دیواروں پر تصویریں اور نقشے لٹک رہے ہیں۔ ایک کلاک بھی لگا ہوا ہے۔ کمرے کے درمیان میں ایک چھوٹی سی میز بچھی ہے۔ رشید اور اقبال آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اقبال ہاتھ میں پنسل لئے ڈرائنگ کاپی پر کوئی تصویر کھینچ رہا ہے۔ رشید کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے)

اقبال: (تصویر بناتے بناتے رک کر رشید سے) قطب صاحب کی لاٹھ کی (؟)

رشید: ---

اقبال: (رشید کو جھنجھوڑ کر) جواب کیوں نہیں دیتے؟"(18)

دوسرا مکمل ڈرامہ 18 لائنوں پر مشتمل 19 صفحات کا ہے مگر اس کا عنوان معلوم نہیں۔ اس ڈرامے کا آغاز دیکھئے:

"کیمرہ دیہات کے مختلف مناظر (لہلہاتے کھیت، ریت، ہل وغیرہ) دکھاتا ہوا ایک دیہاتی مسجد کے گنبد و مینار پر مرکوز ہوتا ہے۔ مسجد کے صحن میں چٹائیوں پر مختلف عمروں کے دیہاتی بچے بیٹھے بغدادی قاعدہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا معلم جو اس مسجد کا امام بھی ہے ایک بہت بوڑھا اور کمزور شخص ہے جو دیہاتی لباس (تہمد، کرتہ، پگڑی) پہنے صدر میں بیٹھا انہیں پڑھا رہا ہے:

امام مسجد: بے زبر با

بچے : بے زبر با

امام مسجد: تے زبر تا

بچے : تے زبر تا---"(19)

تیسرا ڈرامہ نامکمل ہے اور اس کا بھی عنوان معلوم نہیں۔ اس ڈرامے کا مسودہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

کردار:

گلنار۔۔۔ بیس بائیس سال کی ایک لڑکی۔ خوبصورت چنچل شوخ دیدہ کی شلوار اور قمیض، بڑے بڑے پھولوں والی چھینرڈی (چھینٹ؟) ململ کا۔

مائی حمی: دیہاتن بڑھیا، مضبوط ہاتھ پاؤں، حد درجہ کی مکارہ عیارہ سیدھا سادہ دیہاتی لباس۔

پہلا منظر

ایک چھوٹے سے سٹیشن کا پلیٹ فارم

سٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر ایک بنچ جس پر گلنار اور مائی حمی نے قبضہ جما رکھا ہے۔ مائی حمی ایک گٹھڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہے۔ گلنار اس کے پائنتی دونوں ہتھیلیوں کو گدی کے نیچے رکھے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔"(20)

3۔ مضامین:

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کے دس غیر مطبوعہ مضامین ہیں اور سارے مضامین کے عنوانات بھی دیئے گئے ہیں۔ دس میں سے پانچ مکمل صورت میں موجود ہیں اور باقی پانچ ایسے ہیں کہ ان کا صرف ایک آدھ صفحہ دستیاب ہے اور باقی صفحات گم ہو چکے ہیں۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ مضامین بھی مکمل ہو چکے ہوں، لیکن اس وقت مکمل صورت میں دستیاب نہیں ہیں۔

عنوانات سے موضوعات کا بھی پتا چلتا ہے اور موضوعات کے مطابق انہیں تقسیم کیا جائے تو ان دس مضامین کی فہرست یوں بنتی ہے۔

① ادب کے متعلق مضامین ("اردو افسانے کی ترقی"، "ٹامس مان"، "غالب کے کلام میں صنائع بدائع"، "گل کرسٹ صاحب کی داناد شمنی"، "نقطہ اور بے نقطہ")

② شخصیت کے متعلق مضامین
"سید امتیاز علی تاج"، "صوفی غلام مصطفےٰ تبسم"

③ دوسرے مضامین ("آل انڈیا ریڈیو"، "حضرت مولانا عبدالحق صاحب قبلہ"، "مملکت اسلامی")

ان مضامین میں سے "ٹامس مان"، "غالب کے کلام میں صنائع بدائع"، "گل کرسٹ صاحب کی داناد شمنی"، "سید امتیاز علی تاج" اور "صوفی غلام مصطفےٰ تبسم" مکمل صورت میں موجود ہیں اور باقی

ناکمل ہیں۔

"ٹامس مان" 18 لائنوں پر مشتمل 5 صفحات کا مضمون ہے۔ (21)

"غالب کے کلام میں صنائع بدائع" 12 لائنوں پر مشتمل 10 صفحات کا ہے۔ (22)

"گل کرسٹ صاحب کی داناد شمنی" 16 لائنوں پر مشتمل 14 صفحات کا مضمون ہے۔ (23)

دراصل اس انداز کا مضمون "ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری" کے عنوان سے 1961ء میں رسالہ "اردو نامہ" میں طبع ہوا تھا۔ (24) اس لئے ممکن ہے کہ یہ ایک ہی مضمون ہو کیونکہ جو مضمون "اردو نامہ" میں چھپا اس میں گل کرسٹ کی ڈکشنری میں جتنی اغلاط اور حاکمانہ انداز نظر آرہا تھا اس پر خاصی طنز کی گئی ہے اور گل کرسٹ کی "داناد شمنی" ہی اس مضمون کا مرکزی موضوع رہا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دوسرے عنوان سے ایک مرتبہ شائع ہوا ہو گا۔

"سید امتیاز علی تاج" اور "صوفی غلام مصطفےٰ تبسم" یہ دونوں مضامین امتیاز علی تاج اور صوفی تبسم کے انتقال کے بعد ان شخصیات کی یاد میں لکھے گئے۔ "سید امتیاز علی تاج" 13 لائنوں پر مشتمل ساڑھے چار صفحات کا مضمون ہے (25) اور یہ امتیاز علی تاج کے انتقال (19 اپریل 1970ء) کے ایک سال بعد لکھا گیا۔ اسی طرح صوفی تبسم کا انتقال یکم جولائی 1978ء کو ہوا۔ (26) اس لئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صوفی صاحب سے متعلق یہ مضمون 1978ء کے بعد لکھا گیا ہو گا۔ (27)

باقی مضامین ناکمل صورت میں ہیں۔ "اردو افسانے کی ترقی" کے مسودے کا صرف ایک صفحہ دستیاب ہے اور اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"کہانی ادب کے بہت حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ مثنوی، ڈرامہ، قصہ، داستان، ناول، گو ان کی ہیئت جدا جدا ہے مگر ان سب کا محور کہانی ہی ہے۔ کہانی ادب کی قدیم ترین صنف بھی ہے اور جدید ترین بھی۔ قدیم یوں کہ آج سے پانچ چھ ہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب عروج پر تھی تو لوگ کہانیاں لکھا کرتے تھے۔۔۔" (28)

اسی طرح مضمون "نقطہ اور بے نقطہ" 19 لائنوں پر مشتمل ہے مگر صرف 3 صفحات موجود ہیں۔ (29) اس کے سنہ تحریر کا معلوم نہیں۔ یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"نقطے سے ہماری شناسائی بچپن میں اسی روز سے ہو گئی تھی جب ہم نے قاعدے کا پہلا سبق پڑھا تھا:

الف خالی، بے کے نیچے ایک نقطہ، تے کے اوپر دو نقطے، جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ۔۔۔"

(30)

اور اس مضمون میں انشاء اللہ خاں انشاء اور میر تقی میر کے اشعار مثال کے طور پر دیئے گئے

ہیں۔

مضمون "آل انڈیا ریڈیو" نامکمل صورت میں ہے۔ 22 لائنوں کا ایک صفحہ دستیاب ہے [31] اور یہ "آل انڈیا ریڈیو" کے بارے میں معلوماتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون کا حصہ دیکھئے:

"آل انڈیا نام ہے اس سرکاری محکمہ کا جو ہندوستان میں براڈ کاسٹنگ کا انتظام کرتا ہے۔ اس محکمہ کے منتظم اعلیٰ (؟) مسٹر اے۔ ایس بخاری ہیں جو کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں باقاعدہ طور پر براڈ کاسٹنگ کی ابتداء 23 جولائی 1927ء کو ہوئی جبکہ لارڈ اروِن نے جو اس وقت وائسرائے ہند تھے۔۔۔

۔۔۔ آل انڈیا ریڈیو حسب ذیل پندرہ روزہ رسالے شائع کرتا ہے:

دہلی سے "انڈین لسنر" (انگریزی) "آواز" (اردو) اور "سارنگ" (ہندی) کلکتہ سے "بے تار جگت" (بنگالی) اور ترچناپلی سے "وانونی" (تامل)" [32]

مضمون "حضرت مولانا عبدالحق صاحب قبلہ" 27 لائنوں پر مشتمل 3 صفحات کا ہے اور اس کے سنہ تحریر کا علم نہیں۔ [33] اس مضمون کو پڑھ کر یوں اندازہ ہوتا ہے کہ غلام عباس نے رسالہ "ہماری زبان" میں شائع شدہ مضمون کے جواب یا ردعمل میں یہ مضمون لکھا تھا چنانچہ اس مضمون کا آغاز اس طرح کا ہے۔

"تسلیم 16 اپریل کے پرچہ "ہماری زبان" میں ایک مضمون بعنوان "ریڈیائی اساتذہ کی اصلاحیں" نظر سے گزرا۔ مضمون نگار نے جس ادعا اور طمطراق کے ساتھ شروع کیا اور ایڈیٹر صاحب نے اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے جس متانت پوش مسخرگی کا انداز اختیار کیا، اسے دیکھتے ہوئے یہ مضمون حد درجہ مایوس کن ثابت ہوا اور وہی مثل ہوئی "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔" [34]

مضمون "مملکت اسلامی" بھی نامکمل صورت میں ہے اور یہ پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کا آغاز دیکھئے:

"ہمارے سامنے بار بار کہا گیا ہے کہ پاکستان کے مطالبے میں "مملکت اسلامی" کا مطلب قطعاً شامل تھا۔ پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے اہم لیڈروں کی بعض تقریروں سے بلاشبہ یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لہٰذا جب مملکت اسلامی کی حکومت ہوگی تو شاید ان کے ذہن میں کسی ایسے قانونی نظام تصور ہوگا جو اسلامی عقائد، اسلامی قانون شخصی، اسلامی اخلاقیات اور اسلامی ادارت پر مبنی ہو یا ان سے مخلوط ہو۔ جس شخص نے بھی پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اسے ان عظیم مشکلات کا ضرور

احساس ہوا ہے جو کسی ایسی سکیم میں لازماً پیش آئیں گی- یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا تصور قائم کرنے والے اولین مفکر سمجھے جاتے ہیں---"(35)

4- ترجمہ:

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کے تین ترجمے موجود ہیں- ان میں سے ایک اپنے افسانہ "کتبہ" کا فارسی ترجمہ ہے (36) اور دوسرا اپنے افسانہ "جواری" کا انگریزی ترجمہ ہے (37) اور تیسرا انگریزی ادیب اوسکر وائلڈ کی ایک نظم کا اردو ترجمہ ہے- (38) ان میں سے "جواری" کا ترجمہ اور اوسکر وائلڈ کی نظم کا ترجمہ مکمل صورت میں ہیں-

افسانہ "کتبہ" کا فارسی ترجمہ غلام عباس کے ہاتھ سے کیا گیا ہے چونکہ ترجمہ پر اصلاح بھی اپنی لکھائی سے کی گئی ہے- اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ غلام عباس کا اپنا ترجمہ ہو گا مگر یہ صرف 12 لائنوں پر مشتمل نامکمل ترجمہ ہے اور اس کا عنوان نہیں دیا گیا- اس ترجمہ کا حصہ دیکھیے:

"دریک فرخی شہریک سلسلہ طویلی عمارت ہا است- ہمہ تقریباً یک وضعی و گرد ھریک باغچہ پر فضا- دفتر خانہائے گوناگوں، بزرگ و کوچک داریں عمارت ھا میماند و بیش و کم چہار ہزار تفر کارہا میکنند---"(39)

غلام عباس کے افسانہ "جواری" کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا ہے اور اس ترجمہ کا عنوان "Gamblers" رکھا گیا ہے- یہ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ غلام عباس نے کیا یا نہیں- یہ مسودہ انگریزی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا گیا ہے اور 26 لائنوں پر مشتمل ساڑھے دس صفحات کا ترجمہ ہے- اس کا آغاز اس طرح شروع ہوتا ہے:

"The police raid was so well organized that not one of them was able to get away. In any case where could they have gone? There was only one staircase, and the police had set a guard on it from the very first..." (40)

"چشمہ" اوسکر وائلڈ کی ایک مشہور نظم کا ترجمہ ہے (41) مگر یہ مسودہ صرف فوٹو کاپی کی صورت میں موجود ہے- اس کے سن تحریر کا علم نہیں-

حصہ نظم

۱- غزل:

مشفق خواجہ کے پاس غلام عباس کی ایک غزل محفوظ ہے اور غزل کے نیچے لکھا گیا ہے کہ "یہ غزل مطلع سے تو عاری ہے مگر مقطع موجود ہے، بشرطیکہ آپ میرا تخلص "بحر" یا "ساحل" یا "عزم" تصور کریں۔"(42)

یہ معلوم نہیں کہ "آپ" کون تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غلام عباس نے کسی خاص شخصیت کو دکھانے کے لئے یہ غزل پیش کی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "آپ" سے مراد قارئین ہوں۔ بہرحال یہ غزل غلام عباس شناسی کے لئے ایک دلچسپ نمونہ ہو سکتی ہے۔ غلام عباس کی غزل دیکھئے:

بے پرو بال نہیں منت کش معنی ہنوز
متہائے اوج ہے حد نظر میرے لئے

یہ مرصع آسماں یہ ماہ و انجم، بحر و بر
محو حیرت ہوں کہ کیوں یہ کروفر میرے لئے

ہیں بنات النعش بھی وارفتہ رسم جنوں
ٹوٹنا انجم کا ہے رقص شرر میرے لئے

روکش خورشید ہے ہر قطرہ خوناب اشک
ہے تماشا عشرت عرض ہنر میرے لئے

موج بحر زندگی سرگشتہ ساحل نہیں
ہر نفس ہے دعوت عزم سفر میرے لئے (43)

2- مثنوی:

غلام عباس کے مسودے میں ایک مثنوی بھی موجود ہے جو ایک نوٹ بک پر ہے جس کے ہر صفحے پر 5 اشعار لکھے گئے ہیں اور پورے 43 صفحات پر مشتمل دو سو سے زائد اشعار کی ہے۔(44) ویسے غلام عباس نے اس مثنوی کا عنوان نہیں دیا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کب لکھی گئی۔ انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں بھی کہی تھیں۔ نظموں کا مجموعہ "چاند تارے" کی صورت میں وجود میں آیا(45) مگر اس طرح کی مثنوی کا دستیاب ہونا غزل کی طرح غلام عباس شناسی کے لئے ایک اضافہ ہو گا۔ اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

کبھی چین میں ایک تھا بادشاہ
ہمارا تمہارا خدا بادشاہ
تھا فرخندہ بخت اور روشن جبیں
اسے خلق کہتی تھی خاقان چیں (46)
وہ عادل تھا اور نیک دل نیک خو
تھا شہرہ ان اوصاف کا چار سو
رعایا مگن اور خوش تھی سپاہ
تھا آزاد ہر فکر سے بادشاہ
اسے حسن سے تھا عجب ہی لگاؤ
وہ صنعت گری کا بھی رکھتا تھا چاؤ
محل تھا سفید اس کا بلور کا
یہ سمجھو بنا تھا وہ بس نور کا (47)

اور اس مثنوی کا آخری حصہ دیکھئے:

رعایا کو دیں مرگ شہ کی خبر
کہ ہو والئی تخت اس کا پسر (48)
اچانک کھلا باب ایوان شاہ
ہوئی خیرہ یہ دیکھ کر ہر نگاہ
کہ خود ما بدولت ہیں جلوہ نما
لبوں پہ لئے خندہ دل ربا
کیا شاہ نے ان سے پھر یوں خطاب (49)
میں تھا منتظر آپ ہی کا جناب!" (50)

ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس کی ایسی غیر مطبوعہ تحریریں مشفق خواجہ کے پاس موجود ہیں جو غلام عباس شناسی کے سلسلہ میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں اور مشفق خواجہ ان تحریروں کے ساتھ غلام عباس پر غیر مطبوعہ تنقیدی مضامین (مثلاً غلام عباس کی بیٹی کا مضمون "میرے ابا جان" فتح محمد ملک کا "غلام عباس اور نیا افسانہ" اسلوب احمد انصاری کا "غلام عباس کے افسانے" فروغ احمد کا "غلام عباس --- آزاد خیال، صاحب طرز، قصہ گو افسانہ نگار" احمد یوسف کا "حمام میں" ممتاز احمد خاں کا "گوندنی والا تکیہ --- ایک کمزور ناول" اور مظفر علی سید کا

"غلام عباس--- آنندی کے بعد" وغیرہ) بھی رسالہ "غالب" کے "غلام عباس نمبر" میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس لئے رسالہ "غالب" کی اشاعت سے غلام عباس شناسی کا ایک نیا رخ سامنے آنے کا امکان نظر آتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس "اغواء" (غیر مطبوعہ) س ن
(2) غلام عباس "یہ ننھی منی چڑیاں" (غیر مطبوعہ)
(3) ایضاً
(4) ایضاً
(5) غلام عباس "تتلی اور گلاب" (غیر مطبوعہ) س ن
(6) ایضاً
(7) ایضاً
(8) غلام عباس "The Phoenix" (غیر مطبوعہ) س ن
(9) غلام عباس "غیر مطبوعہ افسانہ" س ن
(10) ایضاً
(11) ایضاً
(12) ایضاً
(13) غلام عباس "شاعر اعظم" (غیر مطبوعہ) س ن
(14) غلام عباس "غیر مطبوعہ افسانہ" س ن
(15) ایضاً
(16) ایضاً
(17) ایضاً
(18) غلام عباس "ننھی کی گڑیا" (غیر مطبوعہ ڈرامہ) س ن
(19) ایضاً
(20) غلام عباس "غیر مطبوعہ ڈرامہ" س ن
(21) ایضاً
(22) غلام عباس "تامس مان" (غیر مطبوعہ) س ن
(23) غلام عباس "غالب کے کلام میں صنائع بدائع" (غیر مطبوعہ) س ن
(24) غلام عباس "گل کرسٹ صاحب، کی داناد شمنی" (غیر مطبوعہ) س ن
(25) غلام عباس 'ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری' رسالہ "اردو نامہ" کراچی 1961ء ص 43
(26) غلام عباس 'سید امتیاز علی تاج' (غیر مطبوعہ) س ن

(27) محمد اسلم "مشاہیر پاکستان" اسلام آباد 1990ء
(28) غلام عباس 'صوفی غلام عباس مصطفیٰ تبسم'، (غیر مطبوعہ) س ن
(29) غلام عباس 'اردو افسانے کی ترقی'، (غیر مطبوعہ) س ن
(30) غلام عباس 'نقطہ اور بے نقطہ'، (غیر مطبوعہ) س ن
(31) ایضاً
(32) غلام عباس 'آل انڈیا ریڈیو'، (غیر مطبوعہ)
(33) ایضاً
(34) غلام عباس 'حضرت مولانا عبدالحق صاحب قبلہ'، (غیر مطبوعہ) س ن
(35) غلام عباس ایضاً
(36) غلام عباس 'مملکت اسلامی'، (غیر مطبوعہ) س ن
(37) غلام عباس 'کتبہ'، (فارسی ترجمہ) س ن
(38) غلام عباس 'Gamblers' (انگریزی ترجمہ) (غیر مطبوعہ)
(39) غلام عباس 'چشمہ'، (اردو ترجمہ) (غیر مطبوعہ)
(40) غلام عباس "کتبہ" (فارسی ترجمہ) (غیر مطبوعہ) س ن
(41) غلام عباس "Gamblers" (انگریزی ترجمہ) (غیر مطبوعہ) س ن
(42) غلام عباس (چشمہ) (اردو ترجمہ) (غیر مطبوعہ) س ن
(43) غلام عباس 'غیر مطبوعہ غزل'، س ن
(44) ایضاً
(45) غلام عباس 'غیر مطبوعہ مثنوی'، س ن
(46) غلام عباس "چاند تارے" کراچی 1965ء
(47) یہ شعر مسودے میں اضافے کے طور پر بعد میں لکھا گیا ہے۔
(48) یہ مصرعہ پہلے "کہ ہو والئی تخت شہ کا پسر" لکھا ہوا تھا اور بعد میں "شہ" کی جگہ "اس" تبدیل کیا گیا ہے۔
(49) یہ مصرعہ پہلے "کیا شہ نے درباریوں سے خطاب" تھا اور بعد میں تبدیل کیا گیا۔
(50) غلام عباس 'غیر مطبوعہ مثنوی'، س ن

غلام عباس کے فن
کا تحقیقی جائزہ

0 – 0 – 2 غلام عباس کے فن کا تحقیقی جائزہ

پس منظر:

غلام عباس کی ادبی خدمات کے بارے میں آج تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر تنقیدی ہوتے ہیں اور عام طور پر غلام عباس کے افسانوں کے موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بہترین مثال غلام عباس کے دوسرے افسانوی مجموعے "جاڑے کی چاندنی" میں مشتمل ن۔ م راشد کی "تمہید" ہے۔ اس میں "ثنویت" کے حوالے سے غلام عباس کی افسانہ نگاری پر جو بحث کی گئی ہے وہ غلام عباس پر ایک مثالی تنقید سمجھی جاسکتی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں کے موضوعات کو دیکھا جائے تو ان کے کئی پہلو ہمارے سامنے نظر آئیں گے۔ مثلاً ثنویت کے حوالے سے "اوورکوٹ"، "اس کی بیوی" جیسے افسانے ہیں اور منافقت کے حوالے سے 'بندروالا'، 'آنندی'، 'تنکے کا سہارا'، 'دو تماشے'، جیسے افسانے ہیں اور زندگی کی مجبوریوں سے بے بس ہونے والے انسان کا ذکر 'ناک کاٹنے والے'، 'فینسی ہیرکٹنگ سیلون'، 'کتبہ'، 'جواری'، 'بحران'، 'چکر'، میں نظر آئے گا اور انہی موضوعات پر اردو میں تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ غلام عباس کے فن کو اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور غلام عباس کے متن پر تحقیقی مطالعہ کرنے سے ان کی فنی خصوصیات ہمارے سامنے نظر آئیں۔ اس تحقیقی جائزے کے لئے یہاں پلاٹ، کردار نگاری، جزئیات نگاری اور مکالمہ نگاری کا مطالعہ کیا جائے گا۔

0 – ۱ – 2 غلام عباس کے افسانوں کے پلاٹ

غلام عباس کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے افسانوں کے پلاٹ پر غور کرنا ضروری ہے کیونکہ پلاٹ افسانہ نگاری کے لئے اہم عنصر ہے اور پلاٹ کی کامیابی کے بغیر افسانوں میں ربط اور تاثر کی پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

غلام عباس کے افسانے کے پلاٹ کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ دھیمے انداز سے آگے چلتا ہے اور یہ دھیما پن غلام عباس کے افسانہ نگاری کی نمایاں خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "دھیما پن" کا کیا مطلب ہے؟--- اور غلام عباس نے پلاٹ میں کیسے دھیما پن پیدا کیا؟ اس سوال کے لئے یہاں چند مثالوں کے ساتھ غلام عباس کے افسانوں کے پلاٹ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

1 – 1 – 2 پلاٹ کی ساخت

کہانی کے پلاٹ میں عموماً ابتداء، وسط اور اختتام موجود ہے اور یہ ارتقائی منزلیں کہانی کے زمان و مکاں اور واقعات کی تبدیلی کے حوالے سے ہمیں نظر آتی ہیں۔ غلام عباس کے افسانہ "جواری" میں کہانی اس طرح آگے چلتی ہے:

منظر: 1- پولیس کا جواریوں کو پکڑ لینا۔ (7 لائن، 20.47 فیصد)

منظر: 2- پکڑے جانے والی جواریوں کی جزئیات نگاری، کرداری نگاری (37 لائن، 13.1 فیصد)

منظر: 3- مرکزی کردار نکو کا ذکر (16 لائن، 5.7 فیصد)

منظر: 4- تھانے میں جواریوں کی آپس میں بات چیت (110 لائن، 38.9 فیصد)

منظر: 5- دوسری صبح تھانے میں داروغہ صاحب کے حکم کا انتظار (47 لائن، 16.6 فیصد)

منظر: 6- داروغہ صاحب کا فیصلہ اور جواریوں کا ردعمل (61 لائن، 2.6 فیصد)

منظر: 7- سارے جواریوں کا تھانے سے نکلنا (5 لائن، 1.8 فیصد)[1]

یہ کہانی 283 لائنوں پر مشتمل ہے۔ کہانی کے آغاز اور اختتام کے لئے نسبتاً کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی منظر "1" اور منظر "7" کے لئے پورے 283 لائنوں میں سے صرف 12 لائن (4.24 فیصد) استعمال ہوئی ہیں اور منظر "2" اور منظر "3" جہاں اس افسانے کے مرکزی کردار جواریوں کی کردار نگاری کی گئی ہے، ان کے لئے 53 لائن (18.73 فیصد) مستعمل ہیں۔ پھر منظر 4 اور 5 میں پریشاں جواریوں کا ذکر کرداروں کی بات چیت اور حرکتوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ وہاں 157 لائن (55.5 فیصد) ہیں اور منظر 6 میں داروغہ صاحب کے عجیب و غریب فیصلے کے مطابق جو حرکات نظر آتی ہیں۔ یہ 61 لائن (21.6 فیصد) پر مشتمل ہیں۔

گویا لائنوں کی تعداد کے حوالے سے "جواری" کے پلاٹ کی کیفیت کو دیکھا جائے تو ہمیں یہ باتیں نظر آئیں گی:

1- مصنف کہانی کے آغاز کے لئے کم الفاظ استعمال کر کے قاری کو آسانی سے مگر جامع انداز میں پس منظر پیش کرتے ہیں۔
2- مصنف کردار نگاری کے حوالے سے کہانی کو آگے چلاتے ہیں اور اس کے لئے زیادہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔
3- اختتام تک پہنچنے کے لئے کم الفاظ (منظر 6 اور 7) استعمال کرنے سے کہانی کی رفتار میں تیزی پیدا کی گئی ہے۔

دوسری مثال "کتبہ" کو دیکھئے۔ اس افسانے کی ساخت اس طرح ہے:

منظر: 1- شہر میں واقع دفاتر کے ارد گرد کے مناظر کا ذکر (11 لائن، 4.9 فیصد)
منظر: 2- مرکزی کردار شریف حسین کا تعارفی بیان (11 لائن، 4.9 فیصد)
منظر: 3- ملازموں کی جزئیات نگاری (لباس، بول چال) (31 لائن، 13.3 فیصد)
منظر: 4- شریف حسین کے کتبہ خریدنے کا اور کتبہ پر نام لکھوا کر گھر میں رکھنے کا ذکر (86 لائن، 38.4 فیصد)
منظر: 5- چند سال گزر جانے کے بعد شریف حسین کے کتبہ کی طرف کم توجہ دینے لگنا (13 لائن، 5.8 فیصد)
منظر: 6- شریف حسین کو کتبہ کی یاد آنا (20 لائن، 8.9 فیصد)
منظر: 7- پھر کتبہ کی طرف کم توجہ دیا جانا اور اسے گھر کے مختلف مقامات پر بے کار رکھا جانا (21 لائن، 9.4 فیصد)
منظر: 8- منظر 6 کے پانچ سال بعد کے شریف حسین کے حالات (8 لائن، 3.6 فیصد)
منظر: 9- شریف حسین کا انتقال (15 لائن، 6.7 فیصد)
منظر: 10- شریف حسین کے انتقال کے بعد بیٹے کا کتبہ کو قبر پر نصب کرنا (8 لائن، 3.6 فیصد) [2]

اور اس افسانے کے پلاٹ کی ساخت کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کہا جا سکتا ہے:

1- کہانی کا آغاز کم الفاظ کی منظر نگاری کے حوالے سے ہوتا ہے۔ (11 لائن)
2- پھر مرکزی کردار شریف حسین کا تعارف بھی مختصر مگر جامع انداز میں ہوتا ہے۔
3- منظر 3 میں ملازمین کی جزئیات نگاری سے کہانی میں حقیقت نگاری کا انداز پیدا ہوتا ہے۔
4- منظر 4 سے منظر 7 تک شریف حسین کی بے بسی کو کتبہ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے اور اس کے لئے 140 لائن (62.5 فیصد) استعمال ہوئی ہیں۔

5- زماں کی تبدیلی شریف حسین کی گھریلو صورتحال یا کتبہ کے حوالے سے ہوتی ہے اور منظر 8 میں لکھا گیا ہے کہ "اس (شریف حسین) کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آگیا تھا۔" "خم" کا ذکر دراصل منظر 3 کی جزئیات نگاری میں ہو چکا ہے اور اس ذکر کے حوالے سے شریف حسین کے بڑھاپے کا ذکر اشارتی طور پر کیا گیا ہے یعنی منظر 3 کی جزئیات نگاری منظر 8 میں دوبارہ مستعمل ہونے سے دونوں میں زماں کے فاصلے کے باوجود ایک ربط قائم کیا گیا ہے۔

6- اس کہانی کا آخری منظر بھی کم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے اختتام تک تیز رفتار سے کہانی چلتی ہے۔

گویا افسانہ 'جواری'، اور 'کتبہ'، دونوں کے پلاٹ کی ساخت میں ایک مماثلت نظر آ رہی ہے۔ یہ دونوں افسانے غلام عباس کے پہلے مجموعے "آنندی" میں شامل ہیں۔ مجموعہ "آنندی" میں سے ایک اور مثال افسانہ 'آنندی'، کے حوالے سے پلاٹ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

منظر: 1- کہانی کا پس منظر بلدیہ کی منظر نگاری، بلدیہ میں چلنے والی بحث کی وضاحت (3 لائن، 0.8 فیصد)

منظر: 2- بلدیہ کی بحث کی منظر نگاری، بلدیہ کا فیصلہ (74 لائن، 19.4 فیصد)

منظر: 3- بیواؤں کے لئے منتخب کیا جانے والے علاقے کا ذکر (9 لائن، 2.3 فیصد)

منظر: 4- بیواؤں کی نئی رہائش کی تعمیر کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں کی آمد مزار کا ذکر (82 لائن، 21.6 فیصد)

منظر: 5- ایک نئے شہر کا وجود میں آنا۔ چھ مہینے بعد چودہ مکان بن کر تیار ہو جانا۔ نئے شہر کی جزئیات نگاری، شہر میں بسنے والوں، آنے والوں کی تفصیل نگاری، نئی عمارات کی تعمیرات (183 لائن، 48.2 فیصد)

منظر: 6- بیس سال بعد کے شہر کی صورت حال، شہر کے نام کی وضاحت (20 لائن، 5.3 فیصد)

منظر: 7- آنندی کی بلدیہ کا حال، بلدیہ میں چلنے والی بحث کی وضاحت (9 لائن، 2.3 فیصد)[3]

یہ افسانہ پورے 380 لائنوں پر مشتمل ہے اور اس افسانے کے پلاٹ میں بھی یہ خصوصیات نظر آتی ہیں:

1- کہانی کا آغاز مختصر ہونے کے باوجود قاری کے ذہن میں پس منظر تیار کرتا ہے۔

2- منظر 2 میں "منافقت" کی نمائندگی کے طور پر بلدیہ کے اجلاس کا ذکر تفصیل سے کیا جاتا ہے۔ یہ حصہ پوری کہانی کا تقریباً بیس فیصد بنتا ہے۔

3- منظر 3، 4 اور 5 میں ایک نئے شہر کے وجود میں آنے کا ذکر جزئیات نگاری اور کردار نگاری کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے کے لئے مصنف نے دو تہائی سے زائد (72.1 فیصد) جگہ دے دی۔ ان مناظر کی جزیات سے لطافت بھی پیدا ہوئی ہے۔

4- منظر 6 اور منظر 7 اختتام تک پہنچنے کے لئے اور آخری دلچسپ منظر سامنے لانے کے لئے ایک فضا پیدا کرتے ہیں اور ان میں نئے شہر کی سہولتوں کی تفصیل نگاری کے بعد اس افسانے کے مرکزی کردار یعنی "شہر آنندی" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں مفصل انداز ہونے کے باوجود منظر 3، 4 اور 5 کے مقابلے میں مختصر اور سلیس بیان نظر آتا ہے۔ اس لئے قاری کو اختتام کی طرف جلدی لے جاتے ہیں۔ گویا یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہاں شہر آنندی کی سہولتوں کا ذکر زیادہ مفصل ہوتا تو اختتام اس قدر موثر نہیں ہو سکتا تھا۔

5- اختتام میں یہی منظر 1 دوبارہ پیش کیا جاتا ہے مگر منظر 1 اور منظر 8 میں بیس سے زیادہ سال کا فرق ہے اور یہ منظر 8 مختصر سا معلوم ہوتا ہے۔ غلام عباس کے ہاں اس طرح کا پلاٹ "دھنک" میں بھی نظر آتا ہے جس میں پہلے "ہوٹل موہن جو ڈارو" کا ذکر کیا جاتا ہے اور "نیا پاکستان" وجود میں آنے کے بعد یہ ملک تباہ ہو جاتا ہے اور آخری منظر میں "ہوٹل موہن جو ڈارو" کے آثار کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس اختتام کے لئے صرف 9 لائن (2.3 فیصد) مستعمل ہیں۔ اختتام کا ذکر مختصر مگر موثر ہونا گویا غلام عباس کی افسانہ نگاری کا اہم عنصر معلوم ہوتا ہے۔

'جواری'، 'کتبہ'، اور 'آنندی' یہ تینوں افسانے مجموعہ "آنندی" میں شامل ہیں۔

اب مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" کے چند افسانوں کے حوالے سے "پلاٹ" کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

افسانہ 'اوورکوٹ' خود غلام عباس کے پسندیدہ افسانوں میں سے ایک تھا اور اس افسانے کو "آنندی" کے ساتھ غلام عباس کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس افسانے کے پلاٹ کی ساخت اس طرح بنتی ہے۔

منظر: ۱- مرکزی کردار ایک نوجوان کا تعارف --- زماں "جنوری کی ایک شام" اور مکاں (لاہور کے "ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے ---") اور نوجوان کی وضع قطع کا ذکر جس میں "اوورکوٹ" کا بھی ذکر

ہے۔ (7 لائن، 3.6 فیصد)

منظر: 2۔ سردی ہونے کے باوجود نوجوان لڑکے کا خوش رہنا۔ لارنس گارڈن سے چیرنگ کراس کی طرف چلنا۔ (13 لائن، 6.7 فیصد)

منظر: 3۔ مال روڈ پر گزرنے والے لوگوں کی منظر نگاری (4 لائن، 2.1 فیصد)

منظر: 4۔ نوجوان کے اوور کوٹ کا ذکر (4 لائن، 2.1 فیصد)

منظر: 5۔ نوجوان کا مال روڈ کی سیر کرنا، پان والا، بلی، سینما گھر، موسیقی کی دکان (71 لائن، 36.8 فیصد)

منظر: 6۔ ایک نوجوان جوڑے کا ذکر اور نوجوان لڑکے کا اس جوڑے کے پیچھے چلنا (23 لائن، 12 فیصد)

منظر: 7۔ ایک لاری کا نوجوان لڑکے کو کچلنا (9 لائن، 4.7 فیصد)

منظر: 8۔ ہسپتال کا ذکر (16 لائن، 8.3 فیصد)

منظر: 9۔ نوجوان کے کپڑوں کا اتارے جانا (17 لائن، 8.8 فیصد)

منظر: 10۔ نوجوان مردے کا ذکر (3 لائن، 1.6 فیصد)

منظر: 11۔ نوجوان کے اوور کوٹ میں موجود چیزوں کا ذکر (7 لائن، 3.6 فیصد)(4)

اس افسانے کے لیے 193 لائن استعمال ہوئی ہیں اور اس افسانے میں بھی پلاٹ کی ساخت کا وہی ''توازن'' نظر آتا ہے۔ یعنی

1۔ منظر 1 اور 2 کے حوالے سے کہانی کا پورا پس منظر پیش کیا جاتا ہے۔ منظر 1 میں مرکزی کردار نوجوان لڑکے کی وضع قطع کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور منظر 2 میں شہر کے لوگوں کی حرکات پیش کی گئی ہیں اور اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شدید سردی کے باوجود نوجوان کو اپنے اوور کوٹ کی وجہ سے سردی نہیں لگ رہی۔ گویا یہ منظر بھی اوور کوٹ کی وجہ سے خوش ہونے والے لڑکے کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔

2۔ منظر 3، 4، 5 اور 6 کہانی کو آگے چلانے والے مناظر ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اوور کوٹ کا ذکر بھی لازماً آتا ہے۔ مثلاً منظر 3 میں مختلف لوگوں کے مختلف اوور کوٹ کا ذکر کیا جاتا ہے اور منظر 4 میں نوجوان کے اوور کوٹ کی اچھی سلائی اور کالر جیسے اجزاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر منظر 5 میں بھی اوور کوٹ کے کاج میں اٹکے ہوئے شربتی رنگ کے گلاب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا منظر نگاری کے ذریعے کہانی آگے چلتی ہے مگر مصنف ہر منظر میں کہیں نہ کہیں اوور کوٹ کا ذکر لانے سے قاری کے ذہن میں اوور کوٹ کا امیج دہراتے معلوم ہوتے ہیں

اور منظر 6 جو کہ اختتام کے متعلق اہم واقعہ ہونے کے باوجود، پہلے کے مناظر کی طرح قاری کو معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا منظر 3 اور 5 ہونے کی وجہ سے نوجوان جوڑا بھی ضمنی کردار معلوم ہوا ہے مگر دراصل انہی کرداروں کے حوالے سے کہانی اختتام کے منظر تک پہنچتی ہے۔

3۔ منظر 7 میں داخل ہو کر قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ منظر 6، منظر 7 کے لئے تیار کیا گیا تھا اور یہ اتفاقی حادثہ ہونے کے باوجود منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

4۔ منظر 8 اور منظر 9 میں ہسپتال کا ذکر ہے۔ اس کے لئے زیادہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے، لیکن مصنف نوجوان کی پہنی ہوئی ایک ایک چیز کا ذکر کر کے اختتام تک لے چلتے ہیں۔ اگر یہاں اتاری جانے والی چیزوں کا ذکر زیادہ مفصل ہوتا تو قاری کو اختتام تک پہنچنے میں زیادہ وقت لگ سکتا تھا۔ یعنی یہ منظر 8 اور 9 کہانی کے آخری منظر میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ان مناظر کا مختصر ہونا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

5۔ منظر 10 میں دراصل اس کہانی کے بنیادی موضوع "ثنویت" کو نوجوان لڑکے کے مردے کے حوالے سے اشاراتی طور پر پیش کیا جاتا ہے اور یہ حصہ بھی صرف 3 لائنوں پر مشتمل ہے۔ اس مختصر انداز کی وجہ سے کہانی تیزی کے ساتھ اختتام کو پہنچتی ہے۔

6۔ منظر 11 میں جتنی چیزیں پیش کی گئی ہیں، ان کا ذکر منظر 5 میں ہو چکا ہے۔ اس لئے ان ساری چیزوں سے قاری واقف ہے اور یہاں چھوٹی موٹی چیزوں کا ذکر ہونے کی وجہ سے حقیقی انداز زیادہ ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن میں گزشتہ مناظر کی یاد تازہ تر ہو جاتی ہے۔ یہ اختتام کو مؤثر بنانے میں مدد کرتا ہے۔ آخری دو لائن میں "بیدی کی چھڑی" گم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ "افسوس کہ" ایسے الفاظ سے شروع ہونے کے باعث نوجوان کے لئے رحم اور ہلکی سی تضحیک کے احساس کا باعث بنتا ہے۔

گویا اس افسانے میں بھی پلاٹ کی مذکورہ بالا خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اب غلام عباس کے ایک اور مشہور افسانہ 'اس کی بیوی' کے پلاٹ کو دیکھئے۔

منظر: 1۔ کمرے کا ذکر، رومانوی انداز میں موسم کا ذکر (7 لائن، 3.2 فیصد)

منظر: 2۔ نوجوان کی خود کلامی، صرف نجمی کی بات ہو رہی ہے (8 لائن، 3.6 فیصد)

منظر: 3۔ کردار "نجمہ" کا تعارف اور اس پر نسرین کا رد عمل (14 لائن، 6.4 فیصد)

منظر: 4۔ نوجوان کے نسرین کے پاس آنے کی وجہ کی وضاحت (3 لائن، 1.4 فیصد)

منظر: 5۔ نوجوان اور نسرین کا مکالمہ (44 لائن، 20 فیصد)

منظر: 6- کردار "نسرین کا تعارف" اس کی ماضی کی یاد کے حوالے سے (13 لائن، 5.9 فیصد)

منظر: 7- دوسری صبح نوجوان کا گم ہونا (12 لائن، 5.5 فیصد)

منظر: 8- نوجوان کی واپسی، ناشتہ پکانا، کھانا کھایا، نوجوان اور نسرین کا مکالمہ (62 لائن، 28.2 فیصد)

منظر: 9- تیسرے پہر نوجوان اور نسرین دونوں کا بازار میں نکلنا (23 لائن، 10.5 فیصد)

منظر: 10- شام کو گھر پہنچنا، نوجوان "نجمہ" کا راز واضح کرنا (5 لائن، 2.3 فیصد)

منظر: 11- نوجوان کا سو جانا اور اچانک رو پڑنا، نسرین کا اسے آغوش میں بھینچ لینا (5 لائن، 2.3 فیصد)[5]

یہ افسانہ پوری 220 لائنوں پر مشتمل ہے اور اس ساخت کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

1- کہانی کی ابتداء (منظر 1 اور 2) کے لئے کم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

2- منظر 3، 4 اور 6 میں مرکزی کرداروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ درمیان میں مکالمے (منظر 5) کے باعث کرداروں کا تعارف فطری انداز میں ممکن ہو سکا ہے۔ ورنہ اگر درمیان میں منظر 5 نہ ہوتا تو مسلسل کرداروں کا تعارف جاری رہنے کی وجہ سے کہانی کا فطری انداز مجروح ہونے کا خطرہ تھا۔

3- منظر 8 اس کہانی میں سب سے لمبا حصہ ہے اور یہ منظر 5 کی طرح مکالمہ نگاری کی مدد سے آگے چلتا ہے۔ اگر منظر 8 منظر 6 کے فوراً بعد آتا تو تبدیلی نہ ہونے کی وجہ سے بے لطفی پیدا ہو سکتی مگر منظر 7 میں ہلکی سی تبدیلی لائی جانے کی وجہ سے منظر 8 بھی تازہ معلوم ہوتا ہے۔

4- منظر 9 وقفہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کہانی "نجمہ" کے راز کی وضاحت کی طرف چلتی ہے۔

5- منظر 10 میں نوجوان اور نسرین کی مکالمہ نگاری کی مدد سے "نجمہ" جو کہ نوجوان کی "بیوی" ہوتی تھی۔ اس کے راز کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سے "نوجوان کی بیوی" (اس کی بیوی) کا امیج بدل جاتا ہے۔

6- منظر 11 میں نسرین کے عمل میں رحم اور محبت کا انداز پیش کیا جاتا ہے اور منظر 10 کے فوراً بعد آنے کی وجہ سے قاری کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی بیوی کون ہے، آیا نجمہ ہے یا نسرین؟--- اور یہ اختتام صرف 5 لائنوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود پوری کہانی کا موضوع یہاں واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے۔

اسی طرح غلام عباس کے ایک اور افسانہ 'فینسی ہیر کٹنگ سیلون' کے پلاٹ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔
اس افسانے کے پلاٹ کی ساخت دیکھئے:

منظر: 1- مرکزی کردار، چاروں حجاموں کا تعارف، کس طرح ان حجاموں کی ملاقات کے ہونے کا اور ان لوگوں نے کیسے فیصلہ کرنی کا ذکر (5 لائن، 2.1 فیصد)

منظر: 2- زماں و مکاں کی وضاحت، دکان حاصل کرنے کا ذکر (6 لائن، 2.1 فیصد)

منظر: 3- "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" وجود میں آنے کا ذکر، دکان کی سجاوٹ، چاروں حجاموں کی تیاری کی جزئیات نگاری (49 لائن، 17.2 فیصد)

منظر: 4- "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" کا کامیابی سے چلنا (28 لائن، 9.8 فیصد)

منظر: 5- "منشی" کا آنا اور اسے دکان پر ملازمت ملنا اور دکان کا اچھی طرح چلنا (33 لائن، 11.6 فیصد)

منظر: 6- تین ماہ سے زائد گزرنے کے بعد "استاد" کا مسئلہ پیدا ہونا (58 لائن، 20.4 فیصد)

منظر: 7- منظر 6 کا مسئلہ دوبارہ بگڑ جانا، استاد کی شکایت اور اس کے مطابق نیا فیصلہ (41 لائن، 24.4 فیصد)

منظر: 8- دکان کی آمدنی کا کم ہونا اور "منشی" کے ہاتھ میں دکان کا انتظام چلا جانا، بیشتر مکالمہ منشی کا ہے (62 لائن، 21.8 فیصد)

منظر: 9- منشی کے کہنے پر چاروں حجاموں کا گم سم رہ جانا (3 لائن، 1.1 فیصد)[6]

یہ افسانہ 285 لائنوں پر مشتمل ہے۔ اس ساخت سے یہ باتیں واضح ہوتی ہیں کہ:

1- منظر 1 اور 2 کے لئے بہت کم الفاظ ہیں (11 لائن 3.9 فیصد) مگر اس پس منظر کی وضاحت کی وجہ سے قاری آسانی سے کہانی کی فضا میں داخل ہو جاتا ہے۔

2- منظر 3 میں دکان کی سجاوٹ کی جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ یہاں شہر "آنندی" کی تعمیر کی جزئیات نگاری کی طرح دکان کے ایک ایک جز کی باریک واقعہ نگاری کی جاتی ہے اور اس جزئیات نگاری سے لطافت پیدا ہوتی ہے۔

3- منظر 4 اور 5 میں دکان کی خوش حالی کا ذکر ہے اور منظر 5 میں کردار "منشی" کا ذکر آتا ہے۔ یہ دراصل اس کہانی میں اہم کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا اوور کوٹ میں نوجوان جوڑا ضمنی کردار معلوم ہوتے وجود میں آتے ہیں مگر انہی کی وجہ سے کہانی اختتام تک چلی جاتی ہے اسی طرح مگر منظر 4 کے بعد منظر 5 آنے کی وجہ سے قاری کو منشی کا ذکر فطری معلوم ہوتا

ہے۔

4۔ منظر 6 اور 7 میں "استاد" کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ضمنی کہانی معلوم ہوتی ہے مگر یہ دونوں مناظر منظر 8 اور 9 کے اختتام کے لئے ضروری ہیں کیونکہ منظر 6 اور 7 میں دکان کا انتظام "استاد" کے ہاتھ میں چلا جاتا نظر آتا ہے اور اسے پڑھ کر ہمیں دوسرے تین حجاموں کے لئے احساس رحم پیدا ہوتا ہے مگر منظر 8 میں داخل ہوتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آخر "استاد" بھی شکار بن جاتا ہے اور چاروں حجام جنہوں نے اسی دکان کو قائم کیا اور اسی دکان پر کام کیا۔ وہ سب ایک منشی کے ملازم بن کر ہمارے سامنے نظر آتے ہیں حالانکہ یہ منشی پہلے ملازم کے طور پر اس دکان پر آیا تھا۔ منظر 6 اور 7 اختتام کو زیادہ مؤثر بنانے میں مدد کرتے ہیں۔

5۔ منظر 9 میں چاروں حجام سر جھکا کر بے بس رہ جاتے ہیں اور یہ منظر 6 کے آخر میں استاد کے کردار کے ذریعے پیش کیا جا چکا ہے یعنی "استاد کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ اس تجویز کے حق میں نہ اس کے خلاف اس نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھی"--- اور بالآخر منظر 9 میں چاروں حجام خاموش رہ جاتے ہیں۔ مجبوریوں میں انسانی بے بسی کو مصنف ان آخری 3 لائنوں میں واضح کیا۔

ان کیفیات کو دیکھتے ہوئے ہمیں غلام عباس کے پلاٹ کی ساخت کے بارے میں عمومی خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غلام عباس کے سارے افسانوں کا پلاٹ اس طرح نہیں ہو سکتا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ غلام عباس کے نمایاں افسانوں کے پلاٹ میں ایک مماثلت نظر آتی ہے اور یہ مماثلت غلام عباس کے پلاٹ کی ساخت کا بنیادی عنصر سمجھی جا سکتی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں کے پلاٹ کی ساخت کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

- آغاز مختصر مگر جامع انداز میں ہوتا ہے اور آغاز میں چونکا دینے والا قاری کو چونکا کر قاری کی توجہ کھینچنے والا عنصر نظر نہیں آتا۔ پہلے منظر کے طور پر مختصر بیان ہوتا ہے۔ یعنی آغاز میں مکالمہ (ممتاز مفتی کی "چپ" کی طرح) نہیں لایا جاتا۔
- درمیان میں جزئیات نگاری، کردار نگاری یا منظر نگاری کے ذریعے حقیقت نگاری کی جاتی ہے اور اسی سے افسانے میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔
- غلام عباس کے افسانوں کے درمیان میں ضمنی کہانی جیسے بیانات بھی نظر آتے ہیں مگر یہ دراصل اختتام کو مؤثر بنانے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔
- اختتام میں ایک موڑ نظر آتا ہے مگر اس موڑ کے لئے کہانی کے درمیان میں جزئیات نگاری

کی مدد سے کئی واقعات مسلسل پیش کئے جاتے ہیں اور اس سلسلہ واقعات کا آخری حصہ آخری موڑ کی طرف لانے میں مدد کرتا ہے۔ درمیان میں مختلف واقعات مسلسل نظر آنے کی وجہ سے قاری کو اختتام کا منظر منطقی مگر موثر طور پر نظر آتا ہے۔

- آغاز کی طرح اختتام بھی مختصر مگر جامع انداز میں ہوتا ہے۔ اختتام سے پہلے نسبتاً لمبے واقعات پیش کئے جانے کی وجہ سے قاری کو اختتام کی رفتار تیز معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے قاری میں حیرت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

- آغاز اور اختتام مختصر ہونے کے باوجود درمیان میں واقعات تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اور اس کا بہاؤ منطقی طور پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کے ہاں "دھیماپن" نظر آتا ہے۔ درمیان میں قاری کو وقفوں کی طرح واقعات کا تسلسل نظر آتا ہے۔ دراصل یہ سارے واقعات اختتام کے لئے تیار کئے گئے ہیں مگر جزئیات نگاری، کردار نگاری اور منظر نگاری میں مفصل انداز ہونے کی وجہ سے دھیماپن پیدا ہوتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس 'جواری'، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 9 تا 23

(2) غلام عباس 'کتبہ'، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 39 تا 50

(3) غلام عباس 'آنندی'، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 170 تا 189

(4) غلام عباس 'اوورکوٹ'، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 17 تا 26

(5) غلام عباس 'اس کی بیوی'، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 27 تا 39

(6) غلام عباس 'فینسی ہیر کٹنگ سیلون'، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 90 تا 105

2 – 1 – 2 پلاٹ کا زمان و مکاں

غلام عباس کے افسانوں کے پلاٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک اور بات یعنی زمان و مکاں کے بارے میں بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر غلام عباس کے افسانوں کی خصوصیت دھیما پن ہو تو پلاٹ کی ساخت کے علاوہ بعض دیگر افسانوی عناصر زمان و مکاں میں بھی ایسا عنصر موجود ہونا چاہئے جس کو دیکھ کر ہم دھیما پن محسوس کر سکتے ہوں۔ یعنی اگر غلام عباس کے افسانوں میں فلیش بیک جیسی تکنیک زیادہ مستعمل ہو تو کہانی کے تسلسل میں دھیما پن پیدا ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس باب میں یہ بات دیکھی جائے گی کہ غلام عباس کے ہاں پلاٹ کے زمان و مکاں کی کیا کیفیت ہے۔ کیا یہاں چونکا دینے والی خصوصیات ملتی ہیں یا دھیمے دھیمے، آہستہ آہستہ آگے چلنے والا پلاٹ موجود ہے۔

اس مطالعے کے لئے پلاٹ کی ساخت کے سلسلے میں جن افسانوں کو کئی مناظر میں تقسیم کیا گیا ہے، انہی مثالوں کے حوالے سے زمان و مکاں کی خصوصیات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ یہاں مطالعے کے لئے اہم بات یہ ہے کہ غلام عباس کے بیشتر افسانوں میں ماضی کا ذکر ہے مگر یہاں اسے "حال" ہی میں سمجھا جاتا ہے۔ ماضی کا مطلب یہ ہے کہ فلیش بیک یا دوسرے طریقے سے کہانی کے آگے چلنے والے وقت کے تسلسل کے برخلاف ماضی کی طرف چلے جانے والے وقت کو پیش کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ کہانی تو وقت کے تسلسل میں آگے چلی ہے۔ اس لئے جو منظر، گزشتہ منظر کے بعد منطقی طور پر (وقت کے تسلسل کے مطابق) پیش آئے تو اسے بھی "حال" سمجھا جائے گا۔

یہاں اس مطالعہ کے لئے چند افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور ہر افسانے کے مناظر کے زمان و مکاں کے حوالے سے نقشہ سا بنایا گیا ہے۔ آئندہ ان نقشوں کی مدد سے جائزہ لیا جائے گا۔

”جواری“

منظر	1	2	3	4	5	6	7
زمان	حال (رات)	حال	حال	حال	حال (دوسری صبح)	حال	حال
مکان	بیٹھک کا یک منظر	بیٹھک	تھانہ	تھانہ	تھانہ	تھانہ	تھانے کے باہر

”کتبہ“

منظر	1	2	3	4	5	6	7
زمان	حال	حال	حال	ماضی بعید	حال (چند سال بعد)	حال	حال
مکان	شہر کے فاتر	شہر کے وفاتر	بازار گھر	دفتر گھر	دفتر	گھر	دفتر گھر

منظر	8	9	10
زمان	حال (منظر ۷ کے بیس سال بعد)	حال (شریف حسین کی عمر پچپن)	حال
مکان	گھر	گھر	قبرستان

"آنندی"

منظر	1	2	3	4	5	6	7
زمان	حال	حال	حال	حال	حال	حال	حال (بیس سال بعد)
مکاں	بلدیہ	بلدیہ	نیا علاقہ	نیا علاقہ	نیا علاقہ	نیا علاقہ	بلدیہ

"اوور کوٹ"

منظر	1	2	3	4	5	6	7	8
زمان	حال (جنوری کی ایک شام)	حال	حال	حال	حال	حال	حال	حال
مکاں	مال روڈ	مال روڈ	مال روڈ	مال روڈ	مال روڈ	مال روڈ	مال روڈ۔ ہسپتال	

منظر	9	10	11
زمان	حال	حال	حال
مکاں	ہسپتال	ہسپتال	ہسپتال

”اس کی بیوی“

منظر	1	2	3	4	5	6
زمان	حال (رات)	حال	ماضی/حال	ماضی	حال	ماضی/حال
مکان	کمرہ	کمرہ	کمرہ (نوجوان کے ماضی کاحول)	کمرہ	کمرہ	(نسرین کے بچپن کاحول)

منظر	7	8	9	10	11
زمان	حال (دوسری صبح)	حال	حال (تیسرے پہر)	حال (شام)	حال
مکان	کمرہ	کمرہ	کمرہ/بازار	کمرہ	کمرہ

"فینسی ہیئر کٹنگ سیلون"

منظر 1 —— 2 —— 3 —— 4 —— 5 —— 6 —— 7 ——

زمان حال —— حال —— ماضی/حال —— حال —— حال —— حال —— حال ——

مکاں شہر —— شہر —— دکان —— دکان —— دکان —— دکان —— دکان ——

منظر 8 —— 9

زمان حال —— حال

مکاں دکان —— دکان

"گوندنی والا تکیہ" (قسط ا)

	1	2	3	4	5	6	7
منظر	1	2	3	4	5	6	7
زمان	حال	ماضی بیس سال پہلے کا حال	حال	حال	حال	حال	حال
مکاں	اسٹیشن	قصبہ کے بارہ مختلف مقامات	اسٹیشن	قصبہ	ہوٹل	قصبہ	

	8	9	10
منظر	8	9	10
زمان	حال	حال	ماضی
مکاں	گوندنی والا تکیہ	ہوٹل	تکیہ

اب انہی مثالوں کے حوالے سے پلاٹ کے زمان و مکاں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

1- حال کا تسلسل:

'جواری'، 'آنندی اور 'اوورکوٹ کا پلاٹ ایسا ہے کہ جس میں صرف حال ہی کا ذکر ہے، اگرچہ یہ مستقبل کی طرف چلا جاتا ہے مگر منطقی طریق کار کی وجہ سے اس میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اور مکان کی تبدیلی بھی مناسبت کے ساتھ ہوتی ہے، لیکن ان تینوں افسانوں میں سب سے کامیاب پلاٹ 'آنندی' کا ہے کیونکہ منظر1 اور منظر6 کے درمیان زماں میں بیس سال کا فرق ہونے کے باوجود ایک جیسا مکان پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ کہانی قاری کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ یعنی زماں کی تبدیلی کے باوجود مکان کی کوئی تبدیلی (یعنی مکان، (شہر، بلدیہ، بازار) نہیں ہوئی۔ یہ ساری چیزیں انسانی پیداوار ہیں اور اس کا مطلب انسانی منافقت، انسانی انائیت اور انسانی خواہشات کی فرمانروائی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ "آنندی" میں زمان و مکاں کے تغیر کو کمال طریقے سے استعمال کیا گیا ہے اور اس طرح کی پلاٹ کی ساخت غلام عباس کے دوسرے افسانے "دھنک" میں بھی نظر آتا ہے۔ "دھنک" میں پہلے مستقبل (بیسویں صدی کے اواخر کی ایک شب) کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے اور وہاں ہوٹل "موھن جو ڈارو" کی محفل کی مصوری کی گئی۔ پھر کہانی آگے چلتی ہے کہ معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ملاؤں کا حکومت کے خلاف ہنگامہ شروع ہونا، ملاؤں کی حکومت کا قائم ہونا، پھر ملاؤں کے درمیان جھگڑا۔ آخرکار معاشرے کی تباہی ہوتی ہے۔ افسانہ "آنندی" میں ایک نیا شہر، نیا معاشرہ پیدا ہوتا ہے اور اس نئے معاشرے میں پرانے معاشرے کا انداز پھر نظر آتا ہے مگر "دھنک" میں نیا معاشرہ پھر تباہ ہو جاتا ہے اور آخر میں "ہوٹل موہن جو ڈارو" کے آثار قدیمہ پیش کئے جاتے ہیں اور "موہن جو ڈارو" ہی دراصل تباہ ہوئے معاشرے کی علامت ہے۔ یعنی آخر میں دوبارہ ایک ہی نام (موہن جو ڈارو) آنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان نے دوبارہ ایک "نیا موہن جو ڈارو" بنا دیا۔ یہی طنزیہ انداز ہی اس کہانی کو زیادہ موثر بنانے کا عنصر ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی کامیاب کہانیاں حال ہی کے تسلسل سے بیان کی گئی ہیں۔

2- حال کے تسلسل میں ماضی کا ذکر:

'کتبہ'، 'اس کی بیوی'، اور 'دفینسی ہیر کٹنگ سیلون'، میں وقت کا تسلسل مستقبل کی طرف منطقی طور پر چلا جاتا ہے مگر درمیان میں ماضی کا ذکر بھی آتا ہے۔ مثلاً "کتبہ" میں اس طرح ذکر آتا ہے:

"(ا) مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں

ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسی محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

(2) شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا۔

(3) مگر اس سنگ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔"(1)

اس حصے میں (1) اور (3) کا زمان ایک ہی ہے یعنی "حال" ہے اور اس کے درمیان میں (2) ماضی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" میں بھی اس طرح کرداروں کے ماضی کا ذکر حال ہی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

"(1) ان حجاموں نے ان خامیوں کا زیادہ خیال نہ کیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ایک دن انہیں یہ سب سامان بنا بنایا مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور استاد کہلاتا تھا اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے۔ (2) جن کے گھر وہ ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر داڑھی مونڈنے جایا کرتا تھا (3) اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا اس نے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم اور لاریوں کے اڈے سنبھال رکھے تھے۔ (4) دن بھر کسبت گلے میں ڈالے داڑھی بڑھوں کی ٹوہ میں رہا کرتا (5) اور دوسرے دو حجام جو نو عمر تھے (6) ڈیڑھ دو دو روپے یومیہ پر کبھی کسی دکان میں تو کبھی کسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔"(2)

یہاں (1)، (3) اور (5) کا زمان حال ہے اور (2)، (4) اور (6) "ماضی" ہے۔ یعنی 'کتبہ'، اور 'فینسی ہیر کٹنگ سیلون'، دونوں میں ماضی کا ذکر کرداروں کی وضاحت کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور حال ہی میں شامل ہو کر کردار نگاری کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

'اس کی بیوی' میں ماضی کا ذکر بار بار آتا ہے اور نوجوان کی بیوی "نجمہ" کا کردار خود "ماضی کا کردار" ہے جو حال میں موجود نہیں اور نوجوان لڑکا اس کی یاد میں کھو گیا ہے۔ اس لئے جہاں بھی "نجمہ" کا ذکر آتا ہے وہ ماضی کا ذکر ہوتا ہے مگر 'کتبہ' کی طرح 'اس کی بیوی' میں بھی کرداروں کی وضاحت کے لئے حال میں ماضی کا ذکر نظر آتا ہے۔

"--- (1) ان دو گھنٹوں میں وہ اس نوجوان کی متاہل زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی محروم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ (2) اسے بچپن

ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا(3) یہ کہ (4) نجمہ کا باپ ان کی شادی کے خلاف تھا مگر ماموں اور چچا حق میں تھے۔ (5) یہ (6) نجمہ لمبے قد کی تھی۔ اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا۔۔۔ وہ کروشئے سے مور بہت اچھا بنایا کرتی۔۔۔" (3)

یہاں (1)، (3) اور (5) حال ہیں ("یہ کہ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارا ذکر نوجوان نے نسرین کو سنایا تھا۔ کہانی میں نوجوان کی کہی ہوئی باتوں کو پیش کرنے سے نوجوان اور نجمہ کے ماضی کی وضاحت ہو رہی ہے) اور (2)، (4) اور (6) ماضی ہیں۔ اسی طرح دوسری مثال دیکھئے:

"کئی دن ہوئے اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی اسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا اور آخر جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ دو راتوں کے لئے اس عورت کو خرید سکے تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رخ کیا۔" (4)

یہاں نوجوان لڑکے کی نسرین کو خریدنے کی وجہ ظاہر کی گئی ہے اور یہ سارا واقعہ ماضی کی بات ہے۔

اس افسانے کی تیسرے کردار "نسرین" کا ماضی اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"(1) یہ قمری مہینے کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک تاریک سا تھا۔ ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔ نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب وہ ستاروں سے آشنا ہوئی تھی اس کی عمر چار برس کی تھی۔

(2) ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی سٹیشن پر اترے تھے۔ اس سٹیشن پر لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے ننگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں سٹیشن ہی پر ٹھہرے رہے مگر کوئی سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھڑی بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔۔۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو

گئی۔ آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی مگر باپ کی صورت دیکھنا اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔۔۔“(5)

یہاں (1) حال ہے اور (2) ماضی ہے اور ماضی کا بیان (1) کے حوالے سے شروع ہوتا ہے یعنی نسرین ستاروں کے حوالے سے ماضی کی یاد کرتی ہے۔ اس لئے ماضی کا یہ ذکر فطری اور مناسب ہے۔

گویا غلام عباس کے ہاں فلیش بیک جیسی تکنیک بہت کم نظر آتی بلکہ زمان و مکاں کی تبدیلی مناسبت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے افسانوں میں دھیماپن پیدا ہوتا ہے مگر غلام عباس کے سارے افسانے ایسے نہیں ہوتے۔ غلام عباس کے ناولٹ 'گوندنی والا تکیہ' میں فلیش بیک کی تکنیک کئی مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔ خاص طور پر پہلی قسط میں یہ فن کئی مقامات پر نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہاں 'گوندنی والا تکیہ' کی پہلی قسط کے پلاٹ کے زمان و مکاں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

منظر 2 میں کردار ”میں“ (دراصل اس کردار کا نام سلطان ہے) کے ماضی کا ذکر خود کلامی کے حوالے سے ہوتا ہے یعنی یہ ”کتبہ، فینسی ہیر کٹنگ سیلون اور اس کی بیوی“ کی طرح ماضی کا ذکر ہے، لیکن منظر 7 اور 10 کے ہاں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ خاص طور پر منظر 7 میں بیس سال پہلے کے تکیہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد فوراً کہانی حال میں واپس آتی ہے مگر مکاں ایک ہی ہے۔ زمان میں بیس سال کا فرق ہے اور زمان کے اس فرق نے مکاں کو تبدیل کر دیا تھا۔ مدت کے بعد آبائی وطن واپس آنے والے آدمی کے لئے بچپن کے عزیز مناظر کا بدلنا افسردگی کا باعث بنتا ہے یعنی اسے ”Nostalgia“ کہا جاسکتا ہے۔ زمان کے ساتھ مکاں بھی بدلتا جاتا ہے۔ 'گوندنی والا تکیہ' کی پہلی قسط کا یہ بنیادی موضوع ہے اور دوسری قسط کے بعد آخر تک ماضی کا واقعہ ”حال“ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور اس ناولٹ کے آخر میں دوبارہ ”حال“ (ہوسٹل) کا ذکر آتا ہے۔ اس لئے اس ناولٹ میں فلیش بیک کی تکنیک کا بخوبی استعمال نظر آتا ہے۔

عموماً غلام عباس کے افسانوں کے زمان و مکاں میں ایک تسلسل اور منطقی بہاؤ نظر آتا ہے، لیکن زیادہ تر ”حال“ ہی کا ذکر وقت کے تسلسل کے مطابق آگے چلتا ہے اور کردار نگاری کے لئے یعنی کردار کی وضاحت کے لئے بعض اوقات منطقی انداز سے ماضی کا ذکر دلایا جاتا ہے۔ کہانی میں رکاوٹ پیدا نہ ہونے والی خصوصیت کو بھی غلام عباس کے افسانے میں دھیماپن پیدا کرنے والا ایک اہم عنصر کہا جاسکتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس "کتبہ"، "آنندی" (طبع جدید) کراچی 1968ء ص 43 تا 44

(2) غلام عباس "فینسی ہیر کٹنگ سیلون"، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء

(3) غلام عباس "اس کی بیوی"، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء

(4) ایضاً

(5) ایضاً ص 28

0 – 2 – 2 غلام عباس کے افسانوں کی کردار نگاری اور جزئیات نگاری

سوانح کی تحقیق میں لکھا گیا ہے کہ غلام عباس نے 1961ء میں رسالہ "ہم قلم" میں "افسانہ میری نظر میں" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا اور اس میں لکھا کہ کردار نگاری افسانہ نگاری کا اہم عنصر ہے۔ چنانچہ عباس نے لکھا:

"جہاں تک میری اپنی افسانہ نویسی کا تعلق ہے میں خام مواد بڑی حد تک زندگی ہی سے لیتا ہوں۔ کہانی لکھنے کے لئے سب سے پہلے مجھے ایک کردار کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ کردار سچ مچ کا یعنی گوشت اور پوست کا بنا ہونا چاہئے۔ میں اسے اپنے ذہن میں تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ مجھے زندگی ہی میں مل جاتا ہے۔ میرا اس پر کچھ قابو نہیں ہوتا اور نہ میں اپنے نظریات اس کی زبان سے کہلواتا ہوں۔ میں تو خود چپکے چپکے اس کی باتیں سنتا اور اس کے اعمال و افعال کو دیکھتا رہتا ہوں اور یوں رفتہ رفتہ میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہوں۔ کردار سے افسانہ نگار کی اسی جان پہچان کو میں دراصل کردار نگاری سمجھتا ہوں۔"(1)

اور غلام عباس کے دوسرے مجموعے "جاڑے کی چاندنی" کی تمہید میں ن۔ م راشد نے لکھا:

"یوں تو غلام عباس کے سبھی کردار زندگی کے تمام دکھوں کے ساتھ ہر قدم پر مصالحت کرنے کے عادی ہیں اور زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے ہی کو اپنے لئے راہ نجات جانتے ہیں، لیکن اس کے افسانوں کی قریب قریب سبھی عورتیں خاص طور پر مرد کی "خدمت گزار" (چراغ بی بی) کی خواہشات کے سامنے بے بس (بیوہ سیدانی) اس لئے اصلی یا خیالی دکھ درد کی داستان سن کر گداز ہو جانے والی (نسرین) یا مرد کو ہر حالت میں خدا کی دین سمجھنے والی (بہار) نظر آتی ہیں۔ تاہم عباس ان افسانہ نگاروں میں نہیں جو مرد کو ہمیشہ عورت کے حق میں رہزن ثابت کرتے رہتے ہیں، بلکہ اس کے مردانہ کرداروں میں کچھ ہی

کیوں نہ رکھتے ہوں، بظاہر اکثر عورت کے محافظ بھی ہیں۔ یوں نہیں کہ ان کی حیوانی خواہشات سرے سے دب گئی ہوں، لیکن چاہے کبھی مذہب اور کبھی معاشرت کی آڑ لے کر وہ بے بس مجبور عورت کے نگہبان اور خیراندیش ضرور بن جاتے ہیں اور اس کو ہر قسم کی اذیت سے بچانے کے لئے ہر طرح کے جائز ناجائز اعمال کو روا رکھتے ہیں، وہ عورتیں خود ہر حالت میں مرد کے ساتھ نباہ کی قائل ہیں اور اس سے الگ ہونا انہیں اکثر گوارا نہیں ہوتا۔ گناہ اس کے کسی کردار کا پیچھا نہیں کرتا۔ وہ سب کے سب جائز و ناجائز کو زندگی کی تفریح اور لذت کا جز سمجھتے ہیں۔ جیسے اس کے بغیر زندگی کے کھوکھلے اور سونے ہو جانے کا ڈر ہو۔ اس کے کرداروں میں کہیں ایسے نوجوان ہیں جن کی آرزوئیں دل کو دل میں رہ جاتی ہیں، کہیں وہ جو ایک آئینے میں دو صورتیں دیکھ کر دل بہلا لیتے ہیں، جو روتے ہیں تو ایک عورت کے کندھے پر سر رکھ کر اور پرستش کرتے ہیں تو دوسری عورت کی جن میں ایک غائب ہے اور دوسری حاضر ہے اور دونوں ایک دوسری میں مخلوط ہوتی چلی جاتی ہیں، کہیں وہ ادھیڑ عمر کے مرد ہیں جو کسی مجبور عورت پر رحم کھا کر اس سے عقد کر لیتے ہیں، کہیں وہ جو دوسروں پر احسان کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیتے ہیں اور پھر اس احسان کو بھلا دینا بھی انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ عمر رسیدہ لوگ ہیں جو زندگی کی دوڑ میں نئی پود سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اس کا غصہ ایک ایسے غریب پر نکالتے ہیں جسے وہ اپنے خیال میں فضول جدیدیت کی تمثیل سمجھتے ہیں، پھر وہ غریب لوگ ہیں جو روائتی انداز میں امیروں کی خدمت گزاری کو اپنی پوری زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ لوگ جوان پڑھ ہوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے کرتا دھرتا بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جنہیں بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے لالچ دوست داری کے اصولوں سے بھی منحرف کر دیتے ہیں۔

مجھے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غلام عباس کے افسانوں کے ہیرو اس کے افسانوں کے لئے اتنے اہم نہیں جتنے وہ ضمنی کردار جن سے اس کے افسانوں کے اندر زندگی کا پورا میلہ صورت پکڑتا ہے، اس میلے میں طرح طرح کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ سرکاری افسر، کلرک، فنکار، کالجوں کے طلبہ اور طالبات، اخباروں کے نمائندے، نرسیں، اینگلو انڈین لڑکیاں، مزدوروی پیشہ لوگ، بیمہ ایجنٹ، خوانچہ فروش، عشق میں شعر کہنے والے، گودیوں کھلانے والے پرانے نوکر اور ماما ئیں، نمازی پرہیزگار، کسان وغیرہ وغیرہ۔ غلام عباس کی دنیا اس بے پناہ خلقت سے بھری پڑی ہے، انہی میں سے وہ اپنے بڑے کرداروں کو نکالتا ہے اور انہی کے اندر انہیں پھر سے ڈال دیتا ہے۔ انہی کی مدد سے وہ انسانی دنیا کی چھوٹی بڑی

کوتاہیوں پر ہنستا ہے، انہی کے اعمال سے غلام عباس اپنا یہ بنیادی تصور ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی دنیا میں کوئی چیز اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ انسان ہمیشہ سے دوسرے انسان کی حیلہ سازیوں کے سامنے بے بس چلا آرہا ہے اور ان حیلہ سازیوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان شر کو بھی خیر کے پہلو بہ پہلو جگہ دے تاکہ دونوں کے آہنگ سے دنیا زیادہ خوبصورت اور زیادہ رنگین ہوتی چلی جائے۔"(2)

ن۔ م راشد کی اس تمہید میں غلام عباس کی کردار نگاری کی فکری سطح پر بحث کی گئی ہے اور یہی جامع بحث غلام عباس کی کردار نگاری پر بہترین تنقید معلوم ہوتی ہے گویا تنقیدی حوالے سے ن۔ م راشد نے غلام عباس کی کردار نگاری کی اہمیت کو واضح کیا۔

یہاں غلام عباس کی کردار نگاری کا فنی جائزہ لیا جاتا ہے اور تحقیقی حوالے سے بھی کردار نگاری کی اہمیت کا مطالعہ کیا جائے گا۔

حواشی

(1) غلام عباس "افسانہ میری نظر میں"، رسالہ "ہم قلم" کراچی 1961ء ص 9 تا 11

(2) ن م راشد "تمہید" "جاڑے کی چاندنی (از غلام عباس)" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 12 تا 15

1 – 2 – 2 غلام عباس کے افسانوں کے کردار

غلام عباس کے افسانوں میں مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کو مرکزی اور ضمنی کرداروں میں تقسیم کیا جائے تو ہر افسانے کے کرداروں کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے:

'جواری'

مرکزی کردار: نکو

ضمنی کردار: من سکھ پنواڑی، وثیقہ نویس، چمڑے کا سوداگر، سرکاری دفتر کا اکاؤنٹینٹ، مہاجن کا بیٹا، داروغہ صاحب، سپاہی

'ہمسائے'

مرکزی کردار: اکبر

ضمنی کردار: اکبر کی ماں، بیوی، بیوی کے ماں باپ، منیر، اکبر کے دوست

'کتبہ'

مرکزی کردار: شریف حسین

ضمنی کردار: دفتر کے کلرک (ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، کارکن) بازار کے لوگ (لیکچرباز حکیم، سنیاسی، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانا، کھڑے کھڑے تصویر اتارنے والے فوٹو گرافر، کباڑیوں کا دکان دار) شریف حسین کی بیوی، بچے

'ناک کاٹنے والے'

مرکزی کردار: جبار خان، گلباز خان، صحبت خان

ضمنی کردار: رنگ علی، حسین بخش، منھی جان، سلیم اللہ (شیخ صاحب)

'چکر'

مرکزی کردار: چیلا رام

ضمنی کردار: سیٹھ چھنامل، چھنامل کے دوست یا رشتہ دار (ٹھیکہ دار، بہنوئی، سیٹھ بانکے بہاری، چیلا رام کی بیوی، چھوٹی لڑکی، ردلو)

'آنندی'

مرکزی کردار: شہر آنندی

ضمنی کردار: بلدیہ کے ارکان (بھاری بھرکم رکن، اعداد و شمار سے خاص شغف رکھنے والا رکن، رکن جو اخبار میں مدیر تھا، پنشن یافتہ معمر رکن، پرانی تہذیب کے علمبردار رکن، صدر بلدیہ) بیوائیں، بیوائیوں سے ملنے والے، منشی، میر صاحب، معمار، مزدور، راج، بیواؤں کے رشتہ دار، بڑھیا اور اس کا لڑکا، بوڑھا کسان، سری پائے بیچنے والا شخص، مسجد کا ملا، کبابی، بٹھیاری اور اس کا میاں، نوجوان دیہاتی نائی، شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش، فقیر، بنیا، حلوائی، شیر فروش، قصائی، کنجڑا، درزی، حجام، ٹٹ پونجئے، سیاطی، بزاز، پنساری، نیچہ بند، عطار، رکشہ والا، شہر کے مہاجن، تانگے والے، گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کے لوگ، شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے، غریب غرباء، سقے سر کی تیل مالش والے، شہر آنندی کی بلدیہ کے ارکان

'اوور کوٹ'

مرکزی کردار: نوجوان لڑکا

ضمنی کردار: تانگے والے، انگریز بچے، شہر کے عیش پسند طبقے کے لوگ، بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلباء و طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو، پان والا، اینگلو انڈین لڑکیاں، موسیقی کا دکان دار، قالین کا دکان دار، نوجوان جوڑا، اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان، نوعمر نرسیں شہناز اور مس گل

'اس کی بیوی'

مرکزی کردار: نوجوان لڑکا، نسرین، نجمہ

ضمنی کردار: ثمن، نسرین کی پھوپھی، نوجوان لڑکے کی والدہ اور چھوٹی بہن (زیری)

'سایہ'

مرکزی کردار: سجان

ضمنی کردار: وکیل صاحب، نوکر، وکیل کی بیگم اور بچے اور بچیاں، وکیل کے بچوں کے ماموں ڈاکٹر علیم الدین، شبیر

'فینسی ہیر کٹنگ سیلون'

مرکزی کردار: چار حجام

ضمنی کردار: منشی، استاد کی بیوی اور بچے

'تنکے کا سہارا'

مرکزی کردار: میر صاحب، مرحوم کی بیگم

ضمنی کردار: میر صاحب، بچے (کبریٰ، صغریٰ، فرزند علی، حشمت علی، کلثوم) حاجی صاحب، حاجن صاحب کی بیگم جگن بی، حاجی صاحب کے بیٹے (ٹائپسٹ اور بیمہ کا کام کرنے والا) ٹھیکہ دار غلام رسول، فروٹ مرچنٹ مہر فضل دین، انجینئر چوہدری فتح محمد، مہرانی سگو، دودھ دہی کا دکان دار، قصاب کنجڑا، گاڑی بان، میر صاحب کے ہمسایہ نوجوان جوڑا، مولوی صاحب فرزند علی کے سکول کا لڑکا

'تپلی بائی'

مرکزی کردار: میں

ضمنی کردار: تپلی بائی "خوبصورت ایکٹرس) میرے والدین، تھیٹر کا مالک، حکیم صاحب، کمیٹی کا ایک ملازم لڑکا، عزیز دوست اور اس کی صاحبزادی، میزبان (عیال دار اور کاروباری شخص) تپلی بائی کی بیٹی

'دو تماشے'

مرکزی کردار: میں، مرزا برجیس

ضمنی کردار: جوتے کے دکان دار، اندھا فقیر اور پانچ سالہ لڑکی

'غازی مرد'

مرکزی کردار: چراغ بی بی

ضمنی کردار: چراغ بی بی کا شوہر علیا، چراغ بی بی کے والد (مسجد کا بوڑھا امام) گاؤں کے بڑے بوڑھے، گاؤں کی ایک بیوہ کی لڑکی رحمتے، گاؤں دھوپ چڑھی کا زمیندار عمرو اور اس کی دلہن

'یہ پری چہرہ لوگ'

مرکزی کردار: بیگم بلقیس تراب علی

ضمنی کردار: سیٹھ تراب علی، بلقیس کے لڑکے لڑکیاں (جگو، سگو)

'بحران'

مرکزی کردار: سرکاری کالج میں فلسفہ کا پروفیسر سہیل، چاند خاں، فوجی افسر

ضمنی کردار: چاند خاں کی بڑھیا ماں، بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی، راج، مزدور، چوکیدار، ٹھیکہ دار، چپڑاسی، سیاہ برقع والی عورت، باپ بیٹے، وکیل صاحب

'بندر والا'

مرکزی کردار: میں

ضمنی کردار: مسٹر شاہ صاحب، شاہ صاحب کی بیگم، شاہ صاحب کا بیٹا امان اللہ شاہ، بوڑھے، بچے، جوان، بندر والا

'دھنک'

مرکزی کردار: پاکستان

ضمنی کردار: دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر، سائنس دان، مفکر اور صحافی، ہوٹل کے خدام، فلاپیا، آدم خان (کیپٹن)، ملا صاحب، پولیس، عوام، سبز پوش، نیلی پوش، سیاہ پوش، سفید پوش، مغربی مسافر (دو مرد، دو عورتیں)، گائیڈ

ان مثالوں سے غلام عباس کے افسانوں کے کرداروں کے سلسلے میں چند باتیں نظر آتی ہیں یعنی:

1- غلام عباس کے افسانوں میں اکیلا کردار کہیں نہیں ہوتا بلکہ دو سے زائد کردار ضرور پیش کئے جاتے ہیں۔

2- یہ ضروری نہیں کہ افسانے میں مرکزی کردار انسان ہو۔ 'آنندی' اور 'دھنک' میں مرکزی کردار "معاشرہ" ہے جو انسانی پیداوار ہے۔ 'آنندی' ایک شہر ہے اور 'دھنک' کا مرکزی کردار "پاکستان" یعنی ایک ملک ہے اور انسانی کردار کو اس مرکزی کردار کا جز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

3- بیشتر افسانے بیانیہ انداز میں چلتے ہیں مگر 'پتلی بائی'، 'دو تماشے'، اور 'بندر والا' کی طرح خود کلامی یا آپ بیتی کے انداز سے چلنے والے افسانے بھی ہیں۔ ان افسانوں میں مرکزی کردار

"میں" ہے اور اس قسم کے افسانے غلام عباس کے ابتدائی دور (مجموعہ "آنندی") میں نظر نہیں آتے مگر "جاڑے کی چاندنی" کے بعد نظر آتے ہیں۔

4- بعض افسانوں میں ضمنی کرداروں کو مسلسل پیش کیا جاتا ہے اور اس سے کہانی کے ماحول کی حقیقت نگاری ہوتی ہے۔ مثلاً 'اوورکوٹ' میں:

"نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نظران کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، کالجوں کے طلباء اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو، زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے، ہر قسم کے اوورکوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خالی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جسے نیلام میں خرید اگیا تھا۔"(1)

اسی طرح افسانہ 'چکر' کا ایک حصہ دیکھئے:

"تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے۔"(2)

5- بعض کرداروں کا نام نہیں دیا گیا مثلاً 'اوورکوٹ' کا مرکزی کردار "نوجوان" ہے اور 'اس کی بیوی' کا بھی "نوجوان" ہے۔ اسی طرح 'پتلی بائی' کا "میں" (یہ بھی نوجوان لڑکا ہے) 'دو تماشے' اور 'بندر والا' کا "میں" اور "دھنک" کے علاوں کا کوئی نام نہیں، بلکہ اس کے لئے وضع قطع کے حوالے سے "سبز پوش" "پتلی پوش" جیسے نام دیئے گئے ہیں۔ خود کلامی یا آپ بیتی جیسے انداز کے افسانوں میں مرکزی کردار کے لئے "میں" کافی معلوم ہوتا ہے مگر 'اوورکوٹ' اور 'اس کی بیوی' کے نوجوانوں کے لئے نام نہ دیا جانا کرداروں میں پراسراریت کا انداز پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے اور ایک گمنام کردار کا سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

6- غلام عباس کے افسانوں میں مرد اور عورت دونوں طرح کے کردار نظر آتے ہیں اور نسوانی کرداروں کی خصوصیات کے بارے میں ن۔ م راشد کی تمہید میں مفصل ذکر کیا گیا ہے(3) مگر نسوانی کرداروں کو دیکھا جائے تو طوائف کا کردار جگہ جگہ نظر آتا ہے مثلاً 'ناک کاٹنے والے' کی بائی جی، 'آنندی' کی بیوائیں، 'اس کی بیوی' کی نسرین، 'پتلی بائی' کی پتلی بائی، 'بردہ فروش' کی مائی جمی، 'کن رس' کی لڑکیاں، 'گوندنی والا تکیہ' کی برقع والی خاتون اور غیر مطبوعہ

افسانہ میں بھی مشہور طوائف کا ذکر آتا ہے۔ [4] یہ سوچا جاسکتا ہے کہ چونکہ غلام عباس کا بچپن پرانے لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر ہی گزرا تھا اس لئے غلام عباس نے اس طرح کے ماحول کا مشاہدہ کیا ہو اور سوانح کے حصے میں یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ غلام عباس نے دلی میں ہونے والے "آنندی" کے قصہ جیسے واقعے کا تجربہ کیا تھا۔ ممکن ہے اس طرح کے ماحول کے زیر اثر غلام عباس کو موسیقی کا شوق بھی پیدا ہوا ہو۔ چنانچہ بعض کہانیوں میں موسیقی کا ذکر بھی (ناک کاٹنے والے، 'آنندی'، 'اوورکوٹ'، 'پتلی بائی'، 'گوندنی والا تکیہ') جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

اور غلام عباس کے افسانوں کے کرداروں میں انتہائی امیر لوگ یا انتہائی غریب لوگ نظر نہیں آتے بلکہ ایسے کردار عموماً نظر آتے ہیں جن کا کاروبار یا جن کی حیثیت کیسی ہو، بہرحال ان کو روزی تو ملتی رہتی ہے۔ یعنی غلام عباس کے ہاں کردار غربت میں دھنسے ہوئے نہیں بلکہ زندگی کی دوسری مجبوریوں کے سبب معاشرے میں پیدا ہونے والی کشمکش یا منافقت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس لئے غلام عباس کے افسانوں میں کلرک کا کردار ('جواری'، کا سرکاری اکاؤنٹینٹ، 'کتبہ'، کا شریف حسین اور دفاتر کے ملازم، 'چکر'، کا چیلا رام، 'اوورکوٹ'، کے شہر کے لوگ، 'تنکے کا سہارا'، کا میر صاحب) بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ "کلرک" سے مراد یہ ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور اسے ملازمت بھی مل چکی ہے مگر وہ تنخواہ کی کمی یا ملازمت اور زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہے اور ان مجبوریوں کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک بے بس یا کم نصیب آدمی کی علامت کے طور پر "کلرک" کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ گویا اس حوالے سے دیکھا جائے تو 'فینسی ہیر کٹنگ سیلون'، کے چار حجام، 'بحران'، کا پروفیسر، چاند خاں اور فوجی افسر وغیرہ بھی کلرکوں کی طرح کے کردار ہیں۔ یعنی عام انسان کی بے بسی کا ذکر ہی غلام عباس کے افسانوں کا ایک اہم موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔

حواشی

(1) ن م راشد: محولہ بالا

(2) اس کہانی کے بارے میں "غلام عباس کی غیر مطبوعہ تحریریں" کا باب ملاحظہ ہو۔

(3) غلام عباس 'اوورکوٹ'، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 19

(4) غلام عباس 'کتبہ'، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 40

2 – 2 – 2 غلام عباس کے افسانوں میں کرداروں کی جزئیات نگاری

غلام عباس نے رسالہ "ہم قلم" میں افسانہ نگاری پر لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ کردار نگاری کے ساتھ جزئیات نگاری اہم عنصر ہے۔ غلام عباس نے لکھا:

"کردار نگاری کے ساتھ ساتھ ایک بہت ضروری چیز ہے، جزئیات نگاری۔ ان جزئیات کو براہ راست زندگی کے مشاہدے اور تجربے کا حاصل ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ایک معمولی سی بات فرض کر کے لکھ لی جاتی ہے، اگر وہ تجربے کے خلاف ہو، تو وہ افسانے کے سارے تاثر کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح ایک غلط سر پورے راگ کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔"[1]

پلاٹ کی ساخت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات واضح ہوئی تھی کہ غلام عباس کے افسانے کے پلاٹ میں عموماً آغاز اور اختتام مختصر ہوتے ہیں اور درمیان میں جزئیات نگاری کے حوالے سے حقیقت نگاری کی جاتی ہے اور اس سے کہانی میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔

جس طرح غلام عباس نے کہا ہے کہ "جزئیات کو براہ راست زندگی کے مشاہدے اور تجربے کا حاصل ہونا چاہئے۔" غلام عباس کے سوانح کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں معلوم ہوا کہ غلام عباس کے بیشتر افسانوں کا پس منظر غلام عباس کی اپنی زندگی میں دیکھے ہوئے واقعات سے پھوٹتا ہے مثلاً 'آنندی'، 'اوورکوٹ'، 'چکر'، 'مکرجی بابو کی ڈائری'، 'غازی مرد'، 'تنکے کا سہارا'، 'کن رس'، 'بہروپیا'، 'یہ پری چہرہ لوگ'، 'بحران'، 'بندر والا'، 'بامبے والا'، 'ایک درد مند دل'، 'دیئلی بائی'، جیسے افسانوں کے بارے میں غلام عباس نے خود لکھا کہ "یہ خود مجھ پر ہی گزری ہوئی وارداتیں ہیں۔"[2]

سارے واقعات کا غلام عباس نے خود مشاہدہ کیا تھا اس لئے جزئیات نگاری میں حقیقی انداز لانے میں مدد مل گئی ہوگی اور اسی وجہ سے کہانی کا ہر جز زیادہ زندہ ہوتا نظر آتا ہے۔ یہاں غلام عباس

کے افسانوں میں سے جزئیات نگاری کی چند مثالوں کو دیکھ کر اس کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں کردار نگاری پر زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے کردار نگاری اور جزئیات نگاری دونوں مل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یعنی یہ "کرداروں کی جزئیات نگاری" ہے۔ خاص طور پر غلام عباس نے کرداروں کی وضع قطع کی جزئیات نگاری کر کے کرداروں کو زندہ اور حقیقی انداز میں پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لئے یہاں کرداروں کی جزئیات نگاری کا مطالعہ کیا جاتا ہے اس کی چند مثالیں دیکھئے:

'جواری'

"(1) بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے نکو نکو کہا کرتے تھے۔ (2) یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سرمے کے ڈورے، سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ، دانت پانوں کے کثرت استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہو گئے تھے۔ گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی۔ دائیں طرف کے بال کیک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے۔ (3) ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس پر دوشالہ زری کے حاشئے والا اوراوڑھ لیا کرتا۔ (4) اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹتا اور بانٹ لیتا تھا۔"(3)

یہاں پہلے مرکزی کردار کا تعارف کرایا جاتا ہے (1) مگر بیٹھک کے مالک کا اصل نام نہیں دیا گیا۔ صرف اس کا عرف دیا گیا ہے۔ پھر (2) کے یہاں نکو کی جسمانی خصوصیات کی جزئیات نگاری ہوئی ہے، پھر (3) میں نکو کے لباسوں کا ذکر ہے۔ (4) میں اس کردار کی حرکتوں کی کیفیت پیش کی گئی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس کہانی میں اس مرکزی کردار کے علاوہ کسی دوسرے کردار کی اس قدر تفصیل سے جزئیات نگاری کہیں نہیں کی گئی۔

'ہمسائے'

"(1) اگست کی ایک صبح کو ابھی آفتاب نے مشرقی سلسلہ کوہ کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گھر سے نکلا۔ اس کی عمر مشکل سے آٹھ نو برس کی لگتی تھی۔ (2) اس نے سرخ اون کا پل اوور اور نیکر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بادامی رنگ کا فل بوٹ تھا جس کے کنارے مینہ سے بھیگ بھیگ کے سیاہ پڑ گئے تھے۔"

"(3) پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی سات برس
گی برآمدے میں آئی۔ (4) اس نے ہلکے سبز رنگ کا پھولدار ریشمی کرتا اور کلی دار پاجامہ
پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر فیروزی اون کا کوٹ نما سویٹر تھا۔ دونوں شانوں پر ایک چٹیا
تھی جس کے سرے پر سفید ربن بندھا ہوا تھا۔ سینے پر آسمانی رنگ کے ہوائی ریشم کا ننھا سا
دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سبز سویڈ کے سینڈل تھے۔"(4)

"(5) اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر بعد بیری ابا کی انگلی پکڑے جنہوں نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا
انگریزی سوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا، کاٹھ کے زینے سے اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ پیچھے
پیچھے اس کی امی مصری وضع کا سیاہ ریشمی برقعہ پہنے پان چباتی ہوئی آ رہی تھیں۔ (6) اکبر بنچ
پر بیٹھا ان لوگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر بار بار بیری پر پڑتی تھی جس نے
اب کلی دار پاجامہ اور دوپٹہ اتار کر فراک پہن لیا تھا۔ دور سے اس کی گوری گوری بھری
بھری پنڈلیاں بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان کے پاس بھورے بالوں کی ایک لٹ ہوا
سے اڑ اڑ کے بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی تھی جسے وہ اپنے ننھے سے ہاتھ سے ہٹا ہٹا دیتی
تھی۔"(5)

'ہمسائے' کی ان مثالوں سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ (1) میں پہلے مرکزی کردار اکبر کی عمر اور جسمانی
کیفیت (چھوٹا سا لڑکا) کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر (2) میں اکبر کے کپڑوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ دوسری
کردار بیری کی جزئیات نگاری میں بھی دکھائی دیتا ہے یعنی (3) میں بیری کی عمر اور جسمانی کیفیت (ننھی
سی لڑکی) پھر (4) میں اس کے لباسوں کی تفصیل سے جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ (5) میں بیری کے
والدین کی وضع قطع کا ذکر ہے، مگر چونکہ کہانی میں بیری کی اہمیت زیادہ ہے اس لئے (6) میں بیری کی
جزئیات نگاری مفصل انداز میں ہوئی ہے اور اس افسانے میں بھی مرکزی کردار "اکبر" اور "بیری"
کے سوا کسی دوسرے کردار کی اس قدر جزئیات نگاری نہیں ہوئی۔

'دکتبہ'

"(1) تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں، ان میں ٹائپسٹ،
ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹینٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت
کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی مگر بعض
ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص خاکی زین کے نیکر
اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی
توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں

کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کی نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نے رنگروٹ سستے سے سلائے ڈھلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نک ٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔" (6)

"(2) ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنہیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنہیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس، تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آگیا تھا اور کند استروں سے متواتر داڑھی مونڈھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔" (7)

"(3) اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آگیا تھا۔" (8)

'کتبہ' میں مرکزی کردار شریف حسین کی جزئیات نگاری کم نظر آتی ہے بلکہ دفاتر کے ملازموں کی جزئیات نگاری باکمال انداز میں ہوئی ہے۔ یہ گویا افسانے کی منظر نگاری سی صورت اختیار کرتی ہے مگران سارے کلرکوں میں سے ایک شریف حسین بھی ہے یعنی شریف حسین کے طبقے کے لوگوں کی جزئیات نگاری کرنے سے مصنف نے افسانے میں حقیقی انداز پیدا کیا اور اس کی مثال پہلے اور دوسرے منظر میں دکھائی دیتی ہے مگر دوسرے منظر میں "خم" کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل بڑھاپے کی علامت ہوتا ہے اور تیسرے منظر میں دوبارہ اسی کا ذکر آتا ہے یعنی "خم" کا ذکر محض جزئیات نگاری کا ایک حصہ نہیں بلکہ قاری کو یہ سمجھا دیتا ہے کہ شریف حسین بھی عمر رسیدہ کلرک بن گیا

یعنی مصنف نے جزئیات نگاری میں ایک باہمی ربط قائم کیا۔

ناک کاٹنے والے،

"خو، چشتی کے ساتھ جاتا ہے" پہلے آدمی نے کہا(1) وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا مگر اس کے خدوخال دونوں سے زیادہ درشت تھے (2) گلے میں سیاہ دھاریوں والے سرخ گلوبند دو بل دے کر سرے چغے کے اندر رکھے تھے۔ اس کے دانت پیلے پیلے تھے (3) چوڑا دھانہ، بائیں رخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔"(9)

"بولو" جبار خاں نے کہا "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" (4) اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اس کے اوپر کے ایک دانت پر پلیٹینم کا خول چڑھا تھا جو کافی گھس چکا تھا اور ہڈی نظر آنے لگی تھی۔"(10)

"تیسرے آدمی نے پوچھا (5) اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلوبند لپیٹ رکھا تھا (6) اس کی پیشانی تنگ تھی اور ناک پر ایک بڑا سا مسا اس کی آنکھوں میں سرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی ہو (7) ان میں سے کسی کی داڑھی بھی ہفتے بھر سے کم کی منڈی ہوئی نہیں تھی۔" (8) ننھی جان نے ساری کے اوپر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر اور کف لومڑی کی کھال کے تھے۔ سرخ ساری کی مناسبت سے پاؤں میں سرخ سینڈل تھے۔ آدھے سر اور کانوں کو ایک سفید باریک سلک کے مفلر سے ڈھک رکھا تھا جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ ان لوؤں میں روپہلی ٹوپ دو ننھے ننھے پورے، چاندوں کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کے رخساروں پر غازہ سرخ دھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ (9) اس کی عمر بائیس تیئس برس سے زیادہ نہ تھی۔ چال ڈھال سے وہ ایک الہڑ حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں سے مسکرانے والی، گہرے گہرے سانس لینے والی۔"(11)

یہاں (1) سے (7) تک تین پٹھانوں کی جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ (1)، (4) اور (5) کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کردار کا تعارف کرتے ہوئے ہمیشہ باقی دونوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یعنی باقی دونوں کے مقابلے میں ایک کی نمایاں خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر (7) میں تینوں کی مماثل کیفیت بتائی گئی ہے اور درمیان میں ہر ایک کردار کی خاص جسمانی کیفیت ((3)، (4)، (6)) پیش کی گئی ہے۔ (2) اور (5) میں لباسوں کی جزئیات نگاری بھی کی گئی ہے اور یہ تینوں اس افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔

"ننھی جان" کی جزئیات نگاری کے لئے مصنف نے پہلے وضع قطع کی تفصیل بیان کی ہے۔

اس سے اس لڑکی کی خوبصورتی کا اندازہ قاری کو ہوتا ہے۔ پھر اس کی جسمانی خصوصیت (9) میں پیش کی گئی ہے۔ گویا یہ کردار اس افسانے میں صرف آخری منظر میں آتا ہے مگر تین پٹھان تو اس لڑکی ہی سے ملنے آئے تھے۔ اس لئے قاری کو بھی پڑھتے ہوئے ایسی خواہش یقیناً پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہوگی۔ اس لڑکی کی جزئیات نگاری سے کہانی میں حسین انداز پیدا ہوا ہے۔

'چکر'

"(1) اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، ہاتھ پیر ابھی مضبوط تھے۔ معلوم ہوتا تھا جوانی میں صحت بہت اچھی ہوگی۔ (2) اس کا لباس گرمی سردی ہر موسم میں قریب قریب ایک ہی وضع کا تھا۔ کھدر کا کرتا، موٹی ململ کی دھوتی چار خانے کے کپڑے کا کوٹ، سر پر سیاہ کرنسی ٹوپی، (3) پاؤں میں تری کا جوتا چونکہ اسے دن بھر چلتے رہنا پڑتا تھا اس لئے یہ جوتا بوٹ چپل وغیرہ کی نسبت، زیادہ پائیدار ثابت ہوا تھا۔ اس جوتے نے شروع شروع میں اس کے پیروں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی مگر جب اس نے اس کے ٹخنوں اور پیروں کی انگلیوں پر سخت سخت سیاہ گٹے ڈال دیئے تو تکلیف رفع ہو گئی۔

(4) علاوہ ازیں ایک پرانا چھاتا جس کی موٹھ ہاتھی دانت کی اور فیشن ایبل بنی ہوئی تھی۔ اس کے لباس کا جز بن گیا تھا (5) یہ چھاتا دراصل سیٹھ چھنامل کے بڑے لڑکے کا تھا جس نے بہت دن ہوئے اسے ردی کر کے پھینک دیا تھا۔ سیٹھ کی نظر پڑ گئی اپنے ہاں اس کا کوئی مصرف نہ دیکھ کر انھوں نے اپنے منیم کو دے دیا مگر چیلارام کو اس چھاتے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔" (12)

'چکر' میں بھی مرکزی کردار چیلارام کی جسمانی کیفیت پہلے (1) میں ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر (2) میں لباسوں کی جزئیات نگاری کی گئی ہے مگر یہاں مصنف کا کمال یہ ہے کہ کردار کی جزئیات نگاری کرتے ہوئے کردار کی روزمرہ زندگی کی تکلیف اور مسائل کا ذکر بھی شامل کر دیا۔ (3) کا ذکر کردار کی جزئیات نگاری معلوم ہوتی ہے مگر یہ دراصل (4) تک پہنچ کر چیلارام کی تکلیف کی وضاحت کرتا ہے۔ اسی طرح (4) کا ذکر (5) تک پہنچ کر کردار کی مجبوری کی وضاحت ہو جاتا ہے۔

'اوورکوٹ'

"(1) جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ (2) یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا (3) لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے

ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔"(13)

"(4) نوجوان کا اپنا اوورکوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا، بانہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔"(14)

"(5) اس اثناء میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیردار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ، وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹا گندھا ہوا تھا، جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔"(15)

"(6) اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نک ٹائی اور کالر کیا، سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتار اگیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سوئٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کی پیٹی کی بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نک ٹائی ہو گی، خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے، اس لئے لوگوں کی ان پر

نظر نہیں پڑتی تھی۔ اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔" (16)

افسانہ 'اوورکوٹ' غلام عباس کے کرداروں کی جزئیات نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔ (1) افسانے کا آغاز ہے' زمان و مکاں کے تعارف کے بعد مرکزی کردار نوجوان لڑکے کی جزئیات نگاری شروع ہوتی ہے۔ (2) میں "خاصا فیشن ایبل" لکھا جانے کی وجہ سے (3) میں نوجوان کی وضع قطع کی جتنی جزئیات نگاری کی جاتی ہے' اسے قاری "فیشن ایبل" سمجھ لیتا ہے۔ (4) میں نوجوان کے اوورکوٹ کی جزئیات نگاری ہوتی ہے یعنی پہلے (3) میں نوجوان کی شکل و صورت کی مجموعی جزئیات نگاری ہوئی ہے۔ پھر وقفہ کے بعد صرف اوورکوٹ کی جزئیات نگاری کی گئی ہے۔

(5) کی جزئیات نگاری دراصل مرکزی کردار کی نہیں بلکہ نوجوان جوڑے کی جزئیات نگاری ہے۔ ان مرد اور عورت کی جزئیات نگاری کو دیکھتے ہوئے بظاہر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ غلام عباس نے مرکزی کردار کے علاوہ بھی دوسرے کرداروں کی جزئیات نگاری بھی کی اور یہ کہانی کے لئے غیر ضروری اضافہ تھی مگر یہ درست نہیں کیونکہ قاری کو ان دونوں کی جزئیات نگاری پڑھتے ہوئے دلچسپی پیدا ہوتی ہے جس طرح اوورکوٹ پہنے ہوئے نوجوان کو ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کی جزئیات نگاری مصنف نہیں کر رہے بلکہ اوورکوٹ والے نوجوان کی آنکھوں کے سامنے ہونے والی کیفیت معلوم ہوتی ہے یعنی قاری بھی اوورکوٹ والا نوجوان بن کر ان دونوں کو دیکھتا معلوم ہوتا ہے۔ قاری نوجوان کے کردار میں گم ہو کر سارے مناظر دیکھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (5) کی جزئیات نگاری دلچسپ اور زندہ معلوم ہوتی ہے۔ (6) میں نوجوان کا لباس ایک ایک کر کر اتارا جاتا ہے اور یہاں جزئیات نگاری سے نوجوان کا پورا نقاب اتارا جاتا ہے۔ اس لئے جتنے مفصل انداز میں جزئیات نگاری ہوتی ہے اتنی ہی کہانی مؤثر ہوتی ہے۔

'اس کی بیوی'

"(1) وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی۔ وہ چاندنی پر ہیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی مگر اس وقت برقی لیمپ کی مدھم نیلی روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں' گھنے ابروؤں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔"

(19)

"اس کی بیوی" میں منظر کی جزئیات نگاری زیادہ ہے، کرداروں کی جزئیات نگاری دوسرے افسانوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے مگر پھر بھی جزئیات نگاری صرف مرکزی کردار نوجوان لڑکے کی ہوتی ہے۔ دوسرے ضمنی کرداروں کی نہیں ہوتی۔

ان مثالوں کو دیکھ کر غلام عباس کے کرداروں کی جزئیات نگاری کی چند مماثل خصوصیات نظر آتی ہیں یعنی:

1- غلام عباس جب بھی کسی کردار کی جزئیات نگاری کرتا ہے وہ کہانی میں اہم حصہ ادا کرنے والا ہوتا ہے۔

2- یا تو ایسے کرداروں کی جزئیات نگاری ہوتی ہے کہ اسے پڑھ کر کرداروں کے اردگرد کے ماحول کا اندازہ ہوتا ہے ('کتبہ' کے دفاتر کے ملازموں کی جزئیات نگاری)

3- یا ایسے کرداروں کی جزئیات نگاری کی جاتی ہے جو کہانی کے لئے ضمنی کردار معلوم ہوتے ہیں مگر قاری کو ان کرداروں کو جزئیات نگاری کے ساتھ دیکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور مصنف قاری کی خواہش کے مطابق ایسے ضمنی کرداروں کی جزئیات نگاری بھی کرتا ہے ("ناک کاٹنے والے" کی ننھی جان اور "اوورکوٹ" کا نوجوان جوڑا) اس جزئیات نگاری سے کہانی میں حسن پیدا ہوتا ہے اور قاری کہانی کے کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا محسوس کرتا ہے۔

4- کردار کی جزئیات نگاری کے ساتھ کردار کا تعارف بھی ہوتا ہے۔ یعنی کردار کی عمر، قدر، جسمانی خصوصیات وغیرہ کے حوالے سے بھی کردار کی پہچان کروائی جاتی ہے مگر بیشتر جزئیات نگاری کرداروں کی وضع قطع کے حوالے سے ہوتی ہے۔

5- غلام عباس کے کرداروں کی جزئیات نگاری، ہر کردار کے تعلق رکھنے والے طبقہ اور حیثیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ 'کتبہ' کے ملازموں کی وضع قطع، 'اوورکوٹ' کے نوجوان کا دفیشن ایبل، صورت 'چکر' کے چیلارام کا لباس، 'ناک کاٹنے والے' کے پٹھانوں اور ننھی جان کی شکل وصورت، یہ سب اپنے اپنے طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

6- غلام عباس کے کرداروں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ غلام عباس کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کا مرکزی کردار انسان نہیں بلکہ "معاشرہ" ہے مثلاً 'آنندی' اور 'دھنک' کا مرکزی کردار "شہر آنندی" یا "ملک پاکستان" ہے۔ اگر اجتماع کو "آنندی" اور "دھنک" کا مرکزی کردار سمجھا جائے تو بات آسان ہے کیونکہ معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے۔

معاشرے کا جز انسان ہی ہے اور معاشرے میں انسانوں کے علاوہ بھی مختلف اجزاء ہوتے ہیں۔ مثلاً اخلاقی قدریں، رسم و رواج عمارتیں، بازار، مکانات، تہذیب و تمدن "یہ سب معاشرے" نامی کردار کے اجزاء ہوتے ہیں۔ اس لئے افسانہ "آنندی" اور "دھنک" میں معاشرے کے مختلف اجزاء کی جزئیات نگاری مفصل انداز میں کی گئی ہے اور غلام عباس نے استعارے کے طور پر لکھا کہ:

"بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔" (18)

افسانہ "آنندی" اور "دھنک" میں معاشرے کی جتنی جزئیات نگاری کی گئی ہے، وہ دراصل کردار "معاشرے" کی وضع قطع کی جزئیات نگاری ہے۔ اس لئے یہ پوری جزئیات نگاری مرکزی کردار "معاشرے" سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ قاری اسے پڑھ کر حقیقی انداز محسوس کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ گویا یہ بھی غلام عباس کے کرداروں کی جزئیات نگاری کی ایک تکنیک سمجھی جا سکتی ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس "افسانہ میری نظر میں" رسالہ "ہم قلم" کراچی 1961ء ص 11
(2) غلام عباس "غیر مطبوعہ نوٹ" س ن
(3) غلام عباس "جواری"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 11
(4) غلام عباس "ہمسائے"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 25
(5) غلام عباس ایضاً ص 30
(6) غلام عباس "کتبہ"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 40 تا 41
(7) ایضاً ص 41
(8) ایضاً ص 41
(9) غلام عباس "ناک کاٹنے والے"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 103
(10) ایضاً ص 103
(11) ایضاً ص 103 تا 104
(12) غلام عباس "چکر"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 110 تا 120
(13) غلام عباس "اوور کوٹ"، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 18
(14) ایضاً ص 19
(15) ایضاً ص 22
(16) ایضاً ص 25 تا 26
(17) غلام عباس "اس کی بیوی"، "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 29
(18) غلام عباس "آنندی"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 170

0 – 3 – 2 غلام عباس کے افسانوں کا اسلوب

غلام عباس کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت اسلوب ہے اور غلام عباس کے اسلوب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سیدھا سادہ ہوتا ہے اور بیانیہ انداز میں کہانی آگے چلتی ہے۔ کرداروں کی حیثیت کی مناسبت سے مکالمہ نگاری بھی ہوتی ہے۔ ویسے غلام عباس نے بچپن سے سلیس اور سادہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ اس کی دو بنیادی وجوہ ہیں یعنی:

① وہ رسالہ "پھول" میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کی وجہ سے اسلوب کی سادگی کی طرف مائل ہوئے۔

② انہوں نے غیر ملکی کہانیوں کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اسلوب کی سلاست کی اہمیت کو محسوس کیا۔

پہلی وجہ کے سلسلے میں سوانح کے مطالعے میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور خاص طور سے جب غلام عباس نے "پھول" کا انتخاب 1963ء میں چھپوایا تھا۔ اس وقت انہوں نے دیباچے میں لکھا کہ "پھول" کی اہمیت ادیبوں کو زبان و بیان کی سادگی سکھانے میں تھی۔

بہر حال اس سے واضح ہوتا ہے کہ غلام عباس کے ہاں اسلوب کی سلاست کی اہمیت کا شعور تھا۔

مجموعی طور پر غلام عباس کے افسانے کا اسلوب سیدھا اور سلیس ہوتا ہے، اس باب میں غلام عباس کے افسانوں کے اسلوب کا مطالعہ کرتے ہوئے مکالمہ نگاری اور تشبیہ و استعارہ کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان دونوں پہلوؤں سے غلام عباس کے اسلوب کے ایک اور پہلو کو روشن کیا جائے گا۔

1 – 3 – 2 غلام عباس کی مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری کے لئے بنیادی عنصر یہ ہے کہ مکالمہ کردار کی حیثیت کے مطابق ہو یعنی ہر کردار اپنے معاشرے، طبقے اور حیثیت سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ اس کے مکالمے میں اپنے پورے پس منظر کی نمائندگی نظر آتی ہو۔

غلام عباس کی مکالمہ نگاری میں یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔ یہاں چند مثالوں کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

'تنکے کا سہارا'

"استاد نے یہ دودھ بھیجا ہے چائے کے لئے (ا) ہر روز ایسے ہی آیا کرے گا۔۔۔ اور وہ دودھ کا کوزہ لڑکی کو دے کر چلا گیا۔"

یہاں (ا) میں قواعد کی غلطی ہے ("آیا کروں گا" درست ہے) اور اس سے اس کردار (لڑکے) کی گفتگو زیادہ زندہ معلوم ہوتی ہے۔

'ناک کاٹنے والے'

"(ا) تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"باہر گیا ہے۔" رنگ علی نے کہا جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خاں نے پوچھا۔

"سینما دیکھنے۔ سینماہ بائیسکوپ!" رنگ علی نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔ (1)

"(2) "بولو" جبار خاں نے کہا۔ "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" (2)

"(3) سلام سرکار!" حسین بخش نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ سارنگئے ہیں۔"

"سارنگی بجاتے ہیں، سارنگی جو ساز ہے۔"

"خو تو سازندہ کیوں نہیں کہتا۔"

"ہاں، ہاں وہی۔"

"اور تم خود کیا کرتا ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"میں طلبہ بجاتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"خو تم بھی سازندہ ہے؟"

"جی ہاں!"

"لمحہ بھر خاموشی رہی۔ "(3)

"(4) "خود دیکھو۔" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ "ادھر قلیان ملیان بھی ہیں؟"

"قلیان تو نہیں حقہ ہے سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

"ہم حقہ نہیں پے گا۔"

"پان پیش کروں؟"

"ہم پان نہیں کھاتا۔"

"سگریٹ۔۔۔؟"

"سگریٹ؟۔۔۔ خیر چرس کا سگریٹ مضائقہ نہیں ہے۔"

"چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا، سرکار!" رنگ علی نے کہا۔ "(4)

'ناک کاٹنے والے' میں تین پٹھان کردار آتے ہیں اور ان کے مکالمے میں بھی 'تنکے کا سہارا' کی میاں کی طرح اردو کی ایسی غلطیاں ہیں جہاں فعل کی واحد اور جمع کا فرق نہیں ہوتا یا اسم کے مذکر اور مونث کا فرق نہیں ہوتا۔ اس طرح کی غلطیاں عموماً ایسے لوگ کرتے ہیں جن کی مادری زبان میں اردو کے برخلاف اس طرح کا قاعدہ نہ ہو چنانچہ ان تینوں کی مادری زبان پشتو ہے ("خو") اس لئے ان کے مکالمے میں (1)، (2)، (3)، (4) جیسی غلطیاں نظر آتی ہیں۔

پٹھانوں کی اردو کی غلطیوں کے مقابلے میں کردار رنگ علی اور حسین بخش کی اردو ہمیشہ میزبان کی بولنے والی اردو ہے۔ (3) میں "سلام سرکار" (4) میں "قلیاں تو نہیں حقہ ہے سرکار" اور "پان پیش کروں" جیسے مکالمے نظر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس مکالمے میں جن جن باتوں پر گفتگو ہوئی ہے ان سے پٹھانوں کی اس بات کا اندازہ

ہوتا ہے کہ یہ لوگ روزمرے کی زندگی میں کون کون سے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کن کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ (---(ا) میں "بائیسکوپ" (2) میں "سازندہ" (4) میں "قلیاں، چرس") یعنی مکالمے میں ان کرداروں کے مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں۔

'اوورکوٹ'

"(ا) نہیں نہیں ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ ایک سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔" لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔
ایک چھوٹی سی سفید بلی سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آکر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آچڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:
(2) "پور لٹل سول!"[(5)]

یہاں مرکزی کردار نوجوان لڑکے کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ (ا) میں کہتا ہے کہ "ہم خود چینج دے گا۔" یہ قواعد کی غلطی محض اس لڑکے کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ہوئی ہو، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نوجوان شعوری طور پر انگریزی کی بولی جانے والی اردو کی نقل کر رہا ہو اس لئے (ا) کے فوراً بعد بلی کا واقعہ لا کر مصنف نے نوجوان کے منہ سے انگریزی جملہ "پور لٹل سول" نکال دیا۔ قاری کو اسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ لڑکا لباس کی حد تک ہی نہیں بلکہ مکالمے میں بھی اپنے زمانے کا فیشن ایبل انداز اختیار کرتا ہے۔

'اس کی بیوی'

"(ا) سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں نجمی سے ملتی ہیں۔" یہ کہتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی مگر لہجے سے ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ "ویسی ہی سیاہ اور گہری دوسرے نمبر پر تھوڑی ویسی ہی پتلی اور تیسرے نمبر پر---"[(6)]
غلام عباس کی مکالمہ نگاری میں صرف کرداروں کی معاشی حیثیت کی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کا انداز بھی شامل کیا جاتا ہے۔ "اس کی بیوی" میں (ا) کے مکالمے میں "نجمی" کا لفظ مستعمل ہے جو نوجوان لڑکا نجمہ کو پیار سے اس طرح پکارتا تھا اور یہ نوجوان دوسری خاتون کے سامنے بھی یہی لفظ استعمال کر رہا ہے۔ نسرین کی شکل نجمہ سے ملتی تو ہے مگر اسے پڑھتے ہوئے قاری کو اس لڑکے کا طفلانہ انداز نظر آتا ہے جیسے وہ ابھی تک ماں کا دودھ پینے والا بچہ ہو۔ اس افسانے کے آخر میں مصنف نے یہ لکھا ہے:

"پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں سسکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیئے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، کچھ دیر سوچتی رہی پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازو میں لے کر اسے اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔"(7)

'آنندی'

"(1)--- اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزر گاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔

(2) صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں---"(8)

"آنندی" کے ابتداء اور اختتام میں بلدیہ کے ارکان کی تقریریں پیش کی گئی ہیں اور انہیں پڑھ کر قاری کو ایسا احساس ہوتا ہے کہ یہ رکن واقعی یہاں تقریر کر رہا ہے (1) اور (2) میں جگہ جگہ "حضرات"، "صاحبان" جیسے الفاظ بھی مستعمل ہیں جن کی وجہ سے رکن کو خطاب کرتا معلوم ہوتا ہے اور یہ انداز "دھنک" میں بھی نظر آتا ہے۔

'دھنک'

"(1) ابھی ابھی میں نے اپنے ٹرانسسٹر پر یہ اعلان سنا ہے کہ پاکستان کا کوئی مردود شخص چاند پر پہنچ گیا ہے، خدا اس کو غارت کرے۔"

"(2) برادران اسلام یہ صریح کفر ہے کہ جن اشیاء پر مشیت ایزدی نے اسرار و رموز کے حجاب ڈال رکھے ہیں، انہیں سائنس اور نام نہاد ترقی کے نام پر بے نقاب کیا جائے۔"

"(3) بھائیو--- ہم نے اپنی اس چھچھوری حرکت سے باری تعالیٰ کی جانب میں سخت گستاخی کی ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ عنقریب ہم پر خدائے قہار کا غضب نازل ہونے والا ہے---"(9)

"(4) اللہ اللہ! انسان کے جنوں نخوت کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ اس نے فرشتوں کو تو صید زبوں قرار دے کر چھوڑ دیا اور خود یزداں ہی پر کمندیں پھینکنی شروع کر دیں، نعوذ باللہ من

ذالک---"(10)

"(5) مسلمانو! جاؤ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر لوگوں کو خبردار کر دو کہ انسان من حیث القوم توبہ واستغفار کرلے کیونکہ قیامت آنے والی ہے---"(11)

"دھنک" میں بھی "آنندی" کی طرح مکالمے میں کرداروں کی حیثیت کا اثر بخوبی نظر آتا ہے۔ ناظرین سے خطاب کرتے ہوئے یہاں "برادران اسلام(2)، بھائیو(3)، مسلمانو(5)" جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور (4) اور (5) میں عربی فقرہ (نعوذ باللہ من ذالک، من حیث القوم) بھی استعمال کیا گیا ہے۔

'گوندنی والا تکیہ'

"ادھر لڑکوں نے استاد فلک کو راستے ہی میں جالیا تھا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے:

"چچا فلک جی سلام! استاد فلک جی سلام!"

استاد جواب میں کہتا جاتا:

"(1) جیو مینڈھا لال، جیو مینڈھا سائیں!"(12)

لڑکوں کے سلام کے جواب میں استاد ملک "جیو مینڈھا لال" کہتا ہے جو سرائیکی بولی ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غلام عباس نے اپنے افسانوی کرداروں کو صرف جزئیات نگاری سے نہیں بلکہ مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی زندہ کر دیا۔

مکالمہ نگاری کے سلسلے میں غلام عباس کے افسانوں میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مکالموں میں "تابع مہمل" مستعمل ہے۔ جسے انگریزی میں "Echo Word" یا "Jingle Word" کہتے ہیں۔ خشونت سنگھ کے ناول "Dehli" جیسے اینگلوانڈین ادب کے ہاں یہ مثال جگہ جگہ نظر آتی ہے۔(13)

"تابع مہمل" سے مکالمہ میں روزمرہ کی بول چال کا انداز زیادہ دلچسپ انداز میں پیدا ہوتا ہے اور یہ طریقہ غلام عباس نے ابتدائی دور میں استعمال کیا۔

"مرزا جی! میری جان، گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

"(1) انتظام ونتظام خاک نہیں ہوگا۔"(14)

"وہ ہنس پڑا۔ "کہہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے--- اب تم کھلوا کے ہی رہو گے پر (2) ذکر وکر نہ کر بیٹھنا کسی سے ورنہ پھنس جاؤ گے۔"(15)

"(3) میں گواہی وواہی کچھ نہیں جانتا۔" سپاہی نے کہا۔"(16)

"دیکھئے سرکار!" رنگ علی نے کہا۔ "تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس

وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر پچاس منٹ، اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں۔۔۔"

"(4) اگر مگر نہیں جانتا۔" صحبت خاں نے کہا۔ "صاف بولو۔"(17)

"(5) رنڈی منڈی نہیں، (6) قلیاں ملیان نہیں، چرس نہیں، یہ تمہارا کیا طوائف کا مکان ہے؟"(18)

"تابع مہمل" سے مکالمے میں لطافت ضرور پیدا ہوتی ہے اور لہجے میں روانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ غلام عباس نے مکالمہ نگاری کے حوالے سے کردار کو اور زندہ بنانے کی کوشش کی۔

غلام عباس کی مکالمہ نگاری کے سلسلے میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں دو ایسے افسانے ہیں جن میں مرکزی کردار کا مکالمہ بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ یہ دو افسانے 'کتبہ' اور 'چکر' ہیں۔ افسانہ 'کتبہ' 224 لائنوں پر مشتمل ہے مگر ان میں سے صرف تین سطروں میں مکالمہ آیا ہے۔ باقی سارے کا سارا مصنف کا بیانیہ انداز ہے۔ 'کتبہ' کا مکالمہ دیکھئے:

"تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

(1) "کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا؟"

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا، دام اس قدر کم بتاؤ کہ کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"(2) ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جل جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

"(3) اجی سنئے تو، کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں۔۔۔ اچھا لے جایئے۔"(19)

اس افسانے میں مکالمے (1)، (2) اور (3) یہی ہیں اور مرکزی کردار کا مکالمہ صرف (2) ہے اور باقی سارے بیانیہ انداز میں مرکزی کردار شریف حسین کی کردار نگاری کی گئی ہے۔ گویا اس کہانی میں بیانیہ انداز کثرت سے ہونے کی وجہ سے مرکزی کردار کم گو معلوم ہوتا ہے بلکہ پورے افسانے میں خاص خاموشی بھی پیدا ہو گئی ہے اور یہ تاثر گویا شریف حسین کی زندگی کی مجبوریوں کی علامت سا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی شریف حسین کبھی ردعمل کے طور پر زور سے بات نہیں کرتا، چپ چاپ سے اپنی بے بسی کو قبول کرلیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال "چکر" ہے۔ اس میں ویسے مکالمہ نگاری افسانے کی ابتدائی اور اختتام میں نظر آتی ہے مگر مرکزی کردار چیلارام کا مکالمہ ابتداء میں صرف ایک مرتبہ نظر آتا ہے۔

"سیٹھ کے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ سیٹھ اس وقت گاؤ تکئے سے لگے بیٹھے پیچوان پی رہے تھے۔ انہوں نے چق کے اندر سے چلا کر کہا:

"اے جی! دیکھنا مال گودام جانا نہ بھول جانا اور بینک میں روپیہ بھی سب جمع ہو جائے اور ہاں وہ رجسٹریاں بھی تو ضروری ہیں۔۔۔ نسخہ اور کتابوں کی فہرست تو تم نے رکھ ہی لی ہوگی؟"

(۱) چیلارام نے کہا۔ "جی ہاں!" اور وہ روانہ ہو گیا۔"(20)

"معلوم ہوتا تھا اس کام میں ماشٹے کا کافی زور لگ رہا تھا کیونکہ ہر رگڑ کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ "ہوں" نکل جاتی تھی۔"(21)

اس افسانے میں مرکزی کردار کا مکالمہ دو مقامات پر (۱) اور (2) ہیں۔ باقی جتنے مکالمے ہیں ان میں چیلارام کا کوئی نہیں۔ پھر بھی مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ بیانیہ انداز اور کردار کی جزئیات نگاری کے ذریعے کردار کی وضع قطع اور حرکتیں پیش کرنے سے قاری کو یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ مرکزی کردار کا تاثر کم ہے بلکہ مرکزی کردار چیلارام کے کم گو ہونے کی وجہ سے "زندگی کی مجبوریوں کے سامنے خاموش رہنے والا انسان" کا تصور زیادہ مؤثر انداز میں سامنے آتا ہے اور اس کے مقابلے میں "ناک کاٹنے والے" جیسے کہانی میں کرداروں کے مکالموں سے کہانی آگے چلائی جاتی ہے اور "پٹھانوں کی اردو" مسلسل پیش کی جانے سے لطافت اور تضحیک پیدا ہوتی ہے اور مکالموں کے اس تسلسل سے کہانی میں سے ہمیشہ "آواز" سنائی دیتی ہے۔۔۔ چمک دمک کا سا انداز پیدا ہوتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں کردار نگاری بے شک اہم عنصر ہے اور خاص طور پر مرکزی کردار کے بارے میں وہ سوچ سمجھ کر اس کردار کے مزاج اور شخصیت کے مطابق کبھی کثرت سے مکالمہ پیش کرتے اور کبھی بہت ہی کم مکالمہ سے مدد لیتے ہیں اور اس مکالمہ نگاری سے قاری مرکزی کردار کے مزاج سے ہی نہیں بلکہ پوری کہانی کے مجموعہ تاثر سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس 'ناک کاٹنے والے'، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 102

(2) ایضاً ص 103

(3) ایضاً ص 105

(4) ایضاً ص 109

(5) غلام عباس 'اوور کوٹ' "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 20

(6) غلام عباس 'اس کی بیوی' "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 30

(7) ایضاً (طبع دوم) 1968ء

(8) غلام عباس 'آنندی' "آنندی" (طبع جدید) 1968ء ص 170

(9) غلام عباس "دھنک" کراچی 1969ء ص 15

(10) ایضاً ص 16

(11) ایضاً ص 17

(12) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" (طبع دوم) لاہور 1987ء ص 38

(13) خشونت سنگھ "Dehli" دہلی 1989ء ص 403

(14) غلام عباس 'جواری' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 15

(15) ایضاً ص 16

(16) ایضاً ص 21

(17) غلام عباس 'ناک کاٹنے والے' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 106

(18) ایضاً ص 109

(19) غلام عباس 'کتبہ' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 42 تا 43

(20) غلام عباس 'چکر' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 119

(21) ایضاً ص 125

2 — 3 — 2 غلام عباس کے افسانوں میں تشبیہ و استعارہ

تشبیہ و استعارہ ایک ایسی تکنیک ہے جس سے اسلوب میں خاصی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اسے یہ فن خطابت کا بنیادی عنصر کہا جاسکتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں بھی تشبیہ و استعارہ دونوں نظر آتے ہیں مگر اس کے ہاں زیادہ تر تشبیہ مستعمل ہوتی ہے۔ اس کی چند مثالیں دیکھیے:

"جتنی دیر سورج غائب رہتا ہے ہلکی ہلکی نیلی دھند مکڑی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا (ا) جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔" (1)

"لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح مایوس پلٹیں (2) گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو جسے دکاندار اپنی سستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔" (2)

"ان دونوں بھائیوں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ کر (3) وہ ایک جھونکے کی طرح ان کے پاس پہنچی۔" (3)

"وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں (4) جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔" (4)

"مگر وہ آپس میں ایسی خلط ملط ہو رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا (5) جیسے کوئی لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لحاف کی کہیں تو اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہے اور کہیں اندر کا خاکستر استر۔" (5)

"اس کی آنکھوں میں سرخی اس طرح نظر آتی تھی (6) لہو کی چھینٹ پڑ گئی۔" (6)

"اس کے سر پر بال صرف کنارے کنارے تھے۔ بیچ میں چاند ایسی لگ رہی تھی (7) جیسے انگور آیا ہوا پھوڑا۔" (7)

"لمحہ بھر کے لئے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی (8) جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔" (8)

"وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا(9) جس طرح کوئی دور دراز ملک کا رہنے والا منچلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کے ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے فرض کرلیتا ہے۔"(9)

"اور اگر کوئی سرکاری نل قریب ہی ہوتا تو جوتا اتار کر پاؤں بھگولیتا(10) جس طرح بعض دفعہ گاڑی بان گاڑی کے پہیوں کے گرم ہو جانے پر پانی ڈال کر انہیں ٹھنڈا کرلیتے ہیں۔"
(10)

"دن بھر دھوپ اور لو کے تھپیڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی(11) جیسے مرگھٹ کے اس مردے کی جس کے چہرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو۔"(11)

"فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا، جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرق مرمر زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا(12) گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔"(12)

"لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں(13) گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔"(13)

"یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا(14) گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں "فردوس سمیں" یا "خواب یاسمیں" وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔"(14)

"ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ(15) معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔"(15)

"جب سڑک پر چلتی تھی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا، اسے آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا(16) گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے۔"(16)

"دور دور تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت۔۔۔ اور پھر جب ان کے پیچھے سے سورج کی پہلی کرنیں پھوٹتی ہیں تو پھول پتیوں پر پڑی ہوئی شبنم کی بوندیں(17) موتیوں کی طرح دمکنے لگتی ہیں۔"(17)

اس طرح غلام عباس کے ہاں کئی مقامات پر تشبیہیں نظر آتی ہیں اور یہ ساری تشبیہیں منظر نگاری، جزئیات نگاری یا کردار نگاری میں استعمال کی گئی ہیں، مکالمہ نگاری میں نہیں۔ چونکہ غلام

عباس کی مکالمہ نگاری میں روزمرہ کی زبان کا انداز نمایاں ہے، تشبیہیں یا استعارات روزمرہ کے مکالمے کے لئے مناسب نہیں بلکہ اس سے بناوٹ کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے غلام عباس نے فن خطابت کو مکالمہ نگاری کے دائرے میں نہیں آنے دیا۔

(8)، (9)، (10)، (12) اور (14) کی تشبیہوں میں مقامیت سے زیادہ جدیدیت کا انداز موجود ہے اور اس کے مقابلے میں (13) کی تشبیہ میں خالص مقامی انداز ہے۔ تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ غلام عباس کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

"مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد (1) وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے، ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔"(18)

"بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ (2) ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔"(19)

یہ معلوم نہیں کہ غلام عباس نے کیوں استعارے سے زیادہ تشبیہ کی طرف توجہ دی۔ بہرحال یہ فن خطابت غلام عباس کے افسانوں میں کردار نگاری، جزئیات نگاری اور منظر نگاری میں کہانی کی لطافت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

حواشی

(1) غلام عباس "ہمسائے"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 24
(2) ایضاً ص 25
(3) ایضاً ص 30
(4) ایضاً ص 35
(5) ایضاً ص 35
(6) غلام عباس "ناک کاٹنے والے"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 104
(7) ایضاً ص 109 تا 110
(8) ایضاً ص 116
(9) غلام عباس "چکر"، "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 121

(10) ایضاً ص 121

(11) ایضاً ص 124

(12) غلام عباس 'آنندی' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 176

(13) غلام عباس 'اوورکوٹ' "جاڑے کی چاندنی" :طبع دوم) کراچی 1968ء ص 17

(14) غلام عباس 'اس کی بیوی' "جاڑے کی چاندنی" (طبع دوم) کراچی 1968ء ص 27

(15) ایضاً ص 31

(16) ایضاً ص 37

(17) غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" (طبع دوم) لاہور 1987ء ص 25

(18) غلام عباس 'کتبہ' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 39

(19) غلام عباس 'آنندی' "آنندی" (طبع جدید) لاہور 1968ء ص 170

کتابیات

- ڈاکٹر آصف فرخی "آتش فشاں پر کھلے گلاب" کراچی، 1982ء
- ڈاکٹر آصف فرخی (مرتبہ) "حرف من و تو" کراچی، 1989ء
- احمد علی "Selected Short Stories from Pakistan" اسلام آباد
- اطہر پرویز (مرتبہ) "اردو کے افسانے" لاہور، 1980ء
- انتظار حسین "ملاقاتیں" لاہور، 1988ء
- ڈاکٹر انوار احمد "اردو افسانہ، تحقیق و تنقید" ملتان، 1988ء
- ایوب خاں "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی 1967ء
- پطرس بخاری "پطرس کے خطوط" دہلی، 1978ء
- ڈاکٹر جمیل جالبی "معاصر ادب" لاہور، 1991ء
- ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتبہ) "ن۔م راشد ایک مطالعہ" کراچی، 1986ء
- حکیم احمد شجاع "لاہور کا چیلسی" لاہور، دسمبر 1988ء
- خالد حسین، فاروق حسن (مرتبہ)
  "Urdu Short Stories from Pakistan" دہلی، 1983ء
- زینب عباس "Folk Tales from Pakistan" کراچی، 1958ء
- ڈاکٹر سجاد باقر رضوی "باتیں" لاہور، 1990ء
- ڈاکٹر سلیم اختر "افسانے اور افسانہ نگار" (تنقیدی مطالعہ) لاہور، 1991ء
- ڈاکٹر سہیل احمد خاں "مقالات حلقہ ارباب ذوق" لاہور، 1990ء
- سویامانے (ترجمہ) "آنندی" اوساکا جاپان دسمبر 1991ء
- شہزاد منظر "غلام عباس، ایک مطالعہ" لاہور، جنوری 1991ء
- ڈاکٹر صادق محمد "A History of Urdu Literature" طبع دوم کراچی، 1985ء
- ڈاکٹر صادق محمد "Twentieth Century Urdu Literature" کراچی 1983ء
- ڈاکٹر صغیر افراہیم "اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل" علی گڑھ 1991ء
- طاہر مسعود "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" کراچی 1985ء
- عبادت بریلوی (ڈاکٹر) "افسانہ اور افسانے کی تنقید" لاہور 1986ء
- غلام عباس "آنندی" طبع دوم، لاہور 1955ء
- غلام عباس "آنندی" طبع جدید، لاہور 1968ء
- غلام عباس "الحمراء کے افسانے" لاہور 1930ء

- غلام عباس "پھول" کراچی 1963ء
- غلام عباس "جاڑے کی چاندنی" طبع اول کراچی جولائی 1960ء
- غلام عباس "جاڑے کی چاندنی" طبع دوم کراچی جون 1968ء
- غلام عباس "جاڑے کی چاندنی" خصوصی اشاعت، کراچی اکتوبر 1980ء
- غلام عباس "جزیرہ سخن وراں" طبع اول، دہلی 1941ء
- غلام عباس "جزیرہ سخن وراں" اشاعت دوم، کراچی 1961ء
- غلام عباس "جزیرہ سخن وراں" مارچ رام پور، 1966ء
- غلام عباس "چاند تارے" کراچی جولائی 1969ء
- غلام عباس "دھنک" کراچی 1969ء
- غلام عباس "زندگی نقاب چہرے" کراچی 1984ء
- غلام عباس "زندگی نقاب چہرے" طبع دوم، کراچی 1989ء
- غلام عباس "کن رس" لاہور جون 1969ء
- غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" طبع اول، لاہور 1982ء
- غلام عباس "گوندنی والا تکیہ" طبع دوم، لاہور 1987ء
- غلام عباس "محبت روتی ہے" دہلی جولائی 1954ء
- ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو افسانہ اور افسانہ نگاری" کراچی جنوری 1982ء
- گوپی چند نارنگ "ادبی تنقید اور اسلوبیات" نئی دہلی 1988ء
- گیان چند "تحقیق کا فن" نئی دہلی 1990ء
- محمد اسلم "خفتگان کراچی" لاہور 1991ء
- محمد اسلم "وفیات مشاہیر پاکستان" اسلام آباد، 1990ء
- محمد حسن عسکری "مجموعہ محمد حسن عسکری" لاہور 1994ء
- مرتضیٰ زیدی، سید "تنقید ادب" لاہور 1983ء
- مرزا خلیل بیگ "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" علی گڑھ 1989ء
- ڈاکٹر مغنی تبسم وحید انور (مرتبہ) "کہانیاں" (جلد اول) بمبئی 1983ء
- ڈاکٹر مغنی تبسم وحید انور (مرتبہ) "کہانیاں" (جلد دوم) بمبئی 1985ء
- ڈاکٹر وزیر آغا "عبدالرحمٰن چغتائی --- شخصیت اور فن" مجلس ترقی ادب لاہور 1980ء
- وقاص احمد خواجہ "Mornings in the Wilderness" لاہور 1988ء
- یونس جاوید "حلقہ ارباب ذوق" لاہور 1984ء
- "1971ء کے منتخب افسانے" لاہور 1972ء

رسائل

- "آہنگ" کراچی 22 نومبر 1982ء
- "ادب لطیف" دہلی 1940ء
  "ادب لطیف" لاہور 82/1981ء
- "اردو ادب" (1) اپریل ٹوکیو جاپان 1990ء
- "اردو بک ڈائجسٹ" کراچی یکم فروری 1979ء
- "الہام" اگست دہلی 1940ء
- "پندرہویں صدی" کراچی دسمبر 1982ء
- "پھول" نمبر 47، لاہور 24 نومبر 1928ء
- "پھول" نمبر 49، لاہور 8 دسمبر 1928ء
- "پھول" نمبر 51، لاہور 22 دسمبر 1928ء
- "پھول" نمبر 1، لاہور 5 جنوری 1929ء
- "پھول" نمبر 3، لاہور 19 جنوری 1929ء
- "پھول" نمبر 5، لاہور 2 فروری 1929ء
- "پھول" نمبر 7، لاہور 16 فروری 1929ء
- "پھول" نمبر 14، لاہور 6 اپریل 1929ء
- "پھول" نمبر 17، لاہور 27 اپریل 1929ء
- "پھول" نمبر 28، لاہور 13 جولائی 1929ء
- "پھول" نمبر 30، لاہور 27 اپریل
- "آئین" لاہور 7 جولائی 1968ء
- "ادب لطیف" افسانہ نمبر دہلی 1941ء
- "اردو نامہ" کراچی جون 1961ء
- "اردو ادب" (3) ٹوکیو جاپان ستمبر 1991ء
- "افکار" کراچی اکتوبر 1981ء
- "انصاری" دہلی یکم فروری 1945ء
- "پھول" نمبر 45، لاہور 10 نومبر 1928ء
- "پھول" نمبر 48، لاہور یکم دسمبر 1928ء
- "پھول" نمبر 50، لاہور 15 دسمبر 1928ء
- "پھول" نمبر 52، لاہور 29 دسمبر 1928ء
- "پھول" نمبر 2، لاہور 12 جنوری 1929ء
- "پھول" نمبر 4، لاہور 26 جنوری 1929ء
- "پھول" نمبر 6، لاہور 9 فروری 1929ء
- "پھول" نمبر 11، لاہور 16 فروری 1929ء
- "پھول" نمبر 16، لاہور 20 اپریل 1929ء
- "پھول" نمبر 25، لاہور 22 جون 1929ء
- "پھول" نمبر 29، لاہور 20 جولائی 1929ء

1929ء
- "پھول" نمبر؟ لاہور 19 مئی 1951ء
- "پھول" نمبر؟ لاہور 21 جولائی 1951ء
- "پھول" نمبر؟ لاہور 10 مئی 1952ء
- "تقاضے" لاہور یکم مئی 1985ء
- "تہذیب نسواں" لاہور یکم دسمبر 1928ء
- تہذیب نسواں" لاہور 4 جنوری 1930ء
- "جائزہ" پشاور 1983ء
- "خیال" لاہور فروری 1953ء
- "سات رنگ" کراچی اکتوبر 1991ء
- "سہیلی امرتسر" امرتسر مارچ 1926ء
- "شیرازہ" لاہور 8 فروری 1937ء
- "فردوس" لاہور 1928ء
- "فردوس" لاہور نومبر 1932ء
- "غالب" کراچی 1975ء
- "کارواں" لاہور 1933ء
- "کتاب" لاہور نومبر 1971ء
- "ماہ نو" کراچی مارچ 1954ء
- "ماہ نو" کراچی ستمبر 1955ء
- "ماہ نو" کراچی اپریل 1954ء
- "ماہ نو" کراچی اکتوبر 1955ء
- "ماہ نو" کراچی نومبر 1956ء
- "ماہ نو" کراچی مارچ 1957ء
- "ماہ نو" (انتخاب) کراچی 1987ء
- "مخزن" لاہور ستمبر 1928ء
- "نقوش افسانہ نمبر" لاہور 1955ء
- "پھول" نمبر 33، لاہور 17 اگست 1929ء
- "پھول" نمبر؟ لاہور 14 جولائی 1951ء
- "پھول" نمبر؟ لاہور 28 جولائی 1951ء
- "تخلیقی ادب" کراچی 1978ء
- "تقاضے" لاہور یکم جون 1985ء
- "تہذیب نسواں" لاہور 6 اپریل 1929ء
- "تہذیب نسواں" 5 جنوری لاہور 1935ء
- "جریدہ پشاور 2" پشاور، س ن
- "دائرے" کراچی جولائی۔ اگست
- "سوغات" 1994ء
- "شیرازہ" لاہور یکم جنوری 1937ء
- "شیرازہ" لاہور 12 فروری 1938ء
- "فردوس جلد 5 نمبر 1، لاہور 1932ء
- "فلستان" لاہور 1933ء
- "قومی زبان" کراچی جون 1991ء
- "کارواں" لاہور 1934ء
- "ماہ نو" کراچی فروری 1954ء
- "ماہ نو" کراچی اپریل 1954ء
- "ماہ نو" کراچی اکتوبر 1954ء
- "ماہ نو" کراچی جون 1955ء
- "ماہ نو" کراچی مارچ 1956ء
- "ماہ نو" کراچی جنوری 1957ء
- "ماہ نو" کراچی مارچ 1962ء
- "ماہ نو" کراچی جنوری 1991ء
- "مخزن" لاہور نومبر 1928ء
- "نقوش شخصیات نمبر" لاہور جنوری

1956ء

- "نقوش منٹو نمبر" لاہور، س ن
- "نیا افسانہ" دہلی 1946ء
- "نیادور" شمارہ نمبر 3-4، کراچی، س ن
- "نیا دور" کہانی نمبر شمارہ نمبر 31-32، کراچی، س ن
- "نیا دور" (ن- م راشد نمبر) کراچی 1946ء
- "نیادور" (افسانہ نمبر) کراچی، س ن
- "نیرنگ خیال" لاہور نومبر 1925ء
- "نیرنگ خیال" لاہور جنوری 1928ء
- "نیرنگ خیال" لاہور 1932ء
- "ہمایوں" لاہور فروری 1926ء
- "ہم قلم" کراچی 1961ء
- "ہندوستانی ادب" ٹوکیو جاپان 1985ء
- "MAG" کراچی 21 جون 1981ء
- "The Cultural Since in Pakistan, 1960-61" کراچی 1961ء
- "The Pakistan Times" کراچی 19 دسمبر 1986ء
- "نگار" نومبر 1928ء، ؟
- "نیادور" شمارہ نمبر 1-2، کراچی، س ن
- "نیا دور" (طویل کہانی نمبر) شمارہ نمبر 9-10، کراچی، س ن
- "نیادور" شمارہ نمبر 35-36، کراچی، س ن
- "نیادور" شمارہ نمبر 56-60، کراچی، س ن
- "نیرنگ خیال" لاہور ستمبر 1925ء
- "نیرنگ خیال" لاہور مارچ- اپریل 1929ء
- "نیرنگ خیال" لاہور اکتوبر 1928ء
- "ہزار داستان" لاہور جنوری 1925ء
- "ہمایوں" لاہور فروری 1927ء
- "ہندوستانی ادب" ٹوکیو جاپان 1982ء
- "Herald" کراچی فروری 1982ء
- "MAG" کراچی 11 نومبر 1982ء
- "The Pakistan Times" کراچی 20 فروری 1949ء
- "Third World International" کراچی 1983ء

اخبارات

- "امروز" لاہور 12 نومبر 1982ء
- "امروز" لاہور 19 نومبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 25 جون 1982ء
- "جسارت" کراچی 5 نومبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 12 نومبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 19 نومبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 3 دسمبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 24 دسمبر 1982ء
- "جسارت" کراچی 7 جنوری 1983ء
- "جسارت" کراچی 10 جنوری 1978ء
- "جنگ" کراچی 10 جولائی 1982ء
- "جنگ" کراچی 3 نومبر 1982ء
- "جنگ" کراچی 12 نومبر 1982ء
- "حریت" کراچی 19 جون 1981ء
- "حریت" کراچی 27 نومبر 1982ء
- "خواتین" کراچی 13 نومبر 1982ء
- "مشرق" لاہور 17 مارچ 1978ء
- "Blitz" کراچی 29 مئی 1948ء
- "Blitz" کراچی 11 دسمبر 1982ء
- "DAWN" کراچی 28 اگست 1981ء
- "DAWN" کراچی 18 فروری 1982ء
- "DAWN" کراچی 4 ستمبر 1982ء
- "DAWN" کراچی 2 نومبر 1982ء
- "DAWN" کراچی 3 نومبر 1982ء
- "DAWN" کراچی 5 نومبر 1982ء
- "DAWN" کراچی 7 نومبر 1982ء
- "The Frontier Post" 1990ء (تاریخ صحیح معلوم نہیں)
- "The Pakistan Times" کراچی 19 جولائی 1970ء

غیر مطبوعہ خطوط

(سارے خطوط مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہیں)

احمد ندیم قاسمی	بنام "غلام عباس"	2 مئی 1963ء
احمد ندیم قاسمی	بنام "غلام عباس"	15 جون 1965ء
احمد ندیم قاسمی	بنام "غلام عباس"	11 نومبر 1976ء
اسلوب احمد انصاری	بنام "غلام عباس"	26 دسمبر 1960ء
اشفاق احمد	بنام "غلام عباس"	3 اگست 1971ء
اطہر پرویز	بنام "غلام عباس"	23 جنوری 1980ء
الطاف گوہر	بنام "غلام عباس" (انگریزی کا ترجمہ)	4 مئی 1967ء
الطاف گوہر	بنام "غلام عباس"	15 اگست 1868ء
امتیاز علی تاج	بنام "غلام عباس"	س ن
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	3 فروری (1948ء؟)
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	2 مارچ 1948ء
پطرس	بنام "غلام عباس"	5 دسمبر 1950ء
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	17 جولائی 1951ء
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	8 مئی 1952ء
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	6 فروری 1953ء
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	2 مارچ 1953ء
پطرس بخاری	بنام "غلام عباس"	9 جون 1958ء
ڈاکٹر تاثیر	بنام "غلام عباس"	13 اپریل 1944ء
ڈاکٹر تاثیر	بنام "غلام عباس"	13 فروری 1950ء
خواجہ شہاب الدین	بنام "غلام عباس"	15 اگست 1968ء
ن۔ م راشد	بنام "غلام عباس"	16 فروری 1942ء
ن۔ م راشد	بنام "غلام عباس"	9 مئی 1944ء
ن۔ م راشد	بنام "غلام عباس"	28 فروری 1946ء

ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	27 اکتوبر 1952ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	25 نومبر 1955ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	یکم اکتوبر 1957ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	9 جولائی 1958ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	5 فروری 1963ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	25 مئی 1965ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	19 اکتوبر 1966ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	5 دسمبر 1966ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	23 جولائی 1968ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	3 اگست 1968ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	20 اگست 1968ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	23 ستمبر 1968ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	26 اکتوبر 1968ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	12 نومبر 1969ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	14 اپریل 1970ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	16 جولائی 1970ء
ن-م راشد	بنام "غلام عباس"	29 جنوری 1975ء
سعادت حسن منٹو	بنام "غلام عباس"	3 نومبر 1948ء
شان الحق	بنام "غلام عباس"	23 مئی 1952ء
شان الحق	بنام "غلام عباس"	23 اپریل 1961ء
شاہد احمد دہلوی	بنام "غلام عباس"	8 مئی 1947ء
صلاح الدین محمود	بنام "غلام عباس"	مئی 1974ء
صوفی ایم ایچ	بنام "غلام عباس" (انگریزی)	14 اگست 1968ء
طفیل محمد	بنام "غلام عباس"	27 مئی 1959ء
عبدالرحمٰن چغتائی	بنام "غلام عباس"	7 نومبر 1949ء
عبدالرحمٰن چغتائی	بنام "غلام عباس"	1959ء
عسکری، محمد حسن	بنام "غلام عباس"	30 اکتوبر 1948ء

غلام عباس	"کرس کے نام ایک خط"	12جولائی1952ء
غلام عباس	"کرس کے نام ایک خط"	18جولائی1952ء
غلام عباس	"زینب عباس کے نام ایک خط"	25اکتوبر1958ء
غلام عباس	"محمد طفیل کے نام ایک خط"	8جون1959ء
غلام عباس	"قیوم نظر کے نام ایک خط"	21نومبر1959ء
غلام عباس	"حکومت پاکستان کے نام ایک خط" (انگریزی)	20 ستمبر1968ء
فیض احمد فیض	"غلام عباس کے نام ایک خط"	8مارچ1976ء
فیض احمد فیض	"غلام عباس کے نام ایک خط"	30اگست1977ء
قیوم نظر	"غلام عباس کے نام ایک خط"	5فروری1959ء
قیوم نظر	"غلام عباس کے نام ایک خط"	9نومبر1959ء
قیوم نظر	"غلام عباس کے نام ایک خط"	23نومبر1959ء
منیر نیازی	"غلام عباس کے نام ایک خط"	7جون1969ء
منیر نیازی	"غلام عباس کے نام ایک خط"	18دسمبر1969ء
منیر نیازی	"غلام عباس کے نام ایک خط"	27فروری1970ء
میاں بشیر احمد	"غلام عباس کے نام ایک خط"	4دسمبر1957ء
ڈاکٹر نذیر احمد	"غلام عباس کے نام ایک خط"	31جنوری1977ء
ڈاکٹر نذیر احمد	"غلام عباس کے نام ایک خط"	21فروری1981ء
ڈاکٹر نذیر احمد	"بیگم غلام عباس کے نام ایک خط"	25نومبر1982ء
یوسف ظفر	"غلام عباس کے نام ایک خط"	16اگست1968ء

غیر مطبوعہ مضامین

(مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ہیں)

- ڈاکٹر آصف فرخی "فہرست" س،ن
- ڈاکٹر انور سدید "غلام عباس کا فن" س،ن
- زینب عباس "You Never Can Tell" (Out of Paddington) کراچی، س ن
- سید انور "غلام عباس کی یاد میں" 1982ء
- سید انور "غلام عباس کی برسی پر عقیدت کے پھول) یکم نومبر 1983ء
- ڈاکٹر صفدر حسین "جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ" 25 فروری 1961ء
- غلام عباس "آل انڈیا ریڈیو" س،ن
- غلام عباس "آنندی کا پس منظر" س،ن
- غلام عباس "اردو افسانے کی ترقی" س،ن
- غلام عباس "اغواء" س،ن
- غلام عباس "انگریزی کے تین بڑے شاعر" س،ن
- غلام عباس "پطرس بخاری" س،ن
- غلام عباس "تتلی اور گلاب" س،ن
- غلام عباس "تنکے کا سہارا" پر نوٹ --- س،ن
- غلام عباس "ٹامس مَن" س،ن
- غلام عباس "چکر" پر نوٹ --- س،ن
- غلام عباس "سید امتیاز علی تاج" س،ن
- غلام عباس "شاعر اعظم" س،ن
- غلام عباس "شخصی تعارف نامہ" (انگریزی) س،ن
- غلام عباس "صوفی غلام مصطفیٰ تبسم" 28 مارچ 1978ء
- غلام عباس "غالب کے کلام میں صنائع بدائع" س،ن
- غلام عباس "فہرست خوان یغما" س،ن

- غلام عباس "گل کرسٹ صاحب کی داناد شمنی" س،ن
- غلام عباس "نقطہ اور بے نقطہ" س،ن
- غلام عباس "یہ ننھی منی چڑیاں" س،ن
- غلام عباس "All India Urdu Writers Convention" 22 اپریل 1960ء
- غلام عباس "Declaration" 1980ء یا 1981ء
- فیض احمد فیض "Jazeera-e-Sukanwaran" 25 دسمبر 1961ء
- قرۃ العین حیدر "جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ" س،ن
- مظفر علی سید "غلام عباس--- آنندی کے بعد" س،ن

”انٹرویو“

محمود ہاشمی	24 اپریل 1991ء (بمقام دہلی)
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	11 اگست 1991ء (بمقام لاہور)
ریاض احمد چوہدری	19 اگست 1991ء (بمقام لاہور)
فخرالحق نوری	10 ستمبر 1991ء (بمقام لاہور)
گریش بخشی	10 مئی 1993ء (بمقام اوساکا)

مقالہ

نادیہ جلیل ”مختصر افسانے کے نظریاتی مباحث اور غلام عباس کی افسانہ نگاری“ برائے ایم۔ اے (اردو) یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور 1983ء

غلام عباس شناسی کے متعلق تحریروں کی فہرست
(تاریخی ترتیب سے)

1925ء

جنوری	'جلاوطن'	رسالہ "ہزار داستان" لاہور، ص 32 تا 39
ستمبر	'بچوں کی محبوبہ'	رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، ص 38 تا 39
نومبر	'غم نصیب سپاہی'	رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، ص 41 تا 42

1926ء

فروری	'آسیا'	رسالہ "ہمایوں" لاہور، ص 143 تا 145
مارچ	'؟'	رسالہ "سہیلی امرتسر" امرتسر، ص 39 (یہ صرف صفحہ 39 دستیاب ہے)
؟	'چاند کی بیٹی'	(جاپانی اور دوسری کہانیاں) (کتابچہ) لاہور
؟	'جادو کا لفظ'	(ماخوذ شدہ ڈرامہ)

1927ء

فروری	'نگار خانہ چین'	(چین کی مختصر کہانیاں) رسالہ "ہمایوں" لاہور، ص 145 تا 165
	کہانیوں کے عنوانات:	"ماہی گیر، زی کی دوشیزہ لڑکیاں، طلوع ماہتاب، کشتی کی سیر، ایک نوجوان عریاں لڑکی"
مارچ	'ترکی ٹوپی'	"نیرنگ خیال" لاہور ص ؟

؟	'برف کی بیٹی'	(دوسری اور دیگر کہانیاں) (کتابچہ) لاہور
؟	'ثریا کی گڑیا'	(ڈرامہ) (کتابچہ) لاہور

1928ء

جنوری	'بھکاری ادیب'	رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور
ستمبر	'قربانی'	رسالہ "مخزن" لاہور، ص 13 تا 16
اکتوبر	'قاصد گل'	رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، ص 81 تا 86
	(شریمتی سیتادیوی، بی اے کے افسانے کا ترجمہ ہے--- مترجم غلام عباس ہیں)	
10 نومبر	'شطرنج کا کھیل'	رسالہ "پھول" نمبر 45 لاہور، ص 668 تا 671
24 نومبر	'کھلونوں کی بستی'	رسالہ "پھول" نمبر 47 لاہور، ص 687 تا 691
نومبر	'محتاج کا دل'	رسالہ "مخزن" لاہور
یکم دسمبر	'نظربندی کا کھیل'	رسالہ "پھول" نمبر 48 لاہور، ص 712 تا 713
یکم دسمبر	'جنتی چڑیا'	رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور، ص 1168
8 دسمبر	'ننھا چڑا'	رسالہ "پھول" نمبر 49 لاہور، ص 715 تا 719
15 دسمبر	'سبز گیند'	رسالہ "پھول" نمبر 50 لاہور، ص 729 تا 732
22 دسمبر	'چوں چڑ چوں'	رسالہ "پھول" نمبر 51 لاہور، ص 750 تا 756
29 دسمبر	'نظربندی کا کھیل'	رسالہ "پھول" نمبر 52 لاہور، ص 768 تا 769
؟	'پیغام' (افسانہ)	رسالہ "فردوس" لاہور، ص 38 تا 40
؟	'دیوتاؤں کا رقص'	رسالہ "کارواں" لاہور، ص 68
؟	'جھوٹ سچ'	رسالہ "آہنگ" لاہور، ص 7 تا 8
؟	'دلہری'	رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، ص 73، 74

1929ء

5 جنوری	'سورج کی رتھ'	رسالہ "پھول" نمبر لاہور، 9 تا 13
12 جنوری	'ملکہ مہرنگار'	رسالہ "پھول" نمبر 2 لاہور، ص 15 تا 19
19 جنوری	'ملکہ مہرنگار'	رسالہ "پھول" نمبر 3 لاہور، ص 29 تا 32

26 جنوری	'ملکہ مہر نگار'	رسالہ "پھول" نمبر4 لاہور، ص 43 تا 47
2 فروری	'ملکہ مہر نگار'	رسالہ "پھول" نمبر5 لاہور، ص 57 تا 61
9 فروری	'ملکہ مہر نگار'	رسالہ "پھول" نمبر6 لاہور، ص 71 تا 75
16 فروری	'ملکہ مہر نگار'	رسالہ "پھول" نمبر7 لاہور، ص 85 تا 88
16 مارچ	'رونے والا درخت'	رسالہ "پھول" نمبر11 لاہور، ص 146 تا 152
6 اپریل	'برف کی بیٹی'	رسالہ "پھول" نمبر14 لاہور، ص 183 تا 186
6 اپریل	'خاندانی تحفہ'	رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور، ص 328 تا 230
20 اپریل	'شہزادہ اور گلاب'	رسالہ "پھول" نمبر16 لاہور، ص 211 تا 217
27 اپریل	'دھنک کی سیڑھیاں'	رسالہ "پھول" نمبر17 لاہور، ص 225 تا 231
22 جون	'ہڈیوں کا محل'	رسالہ "پھول" نمبر25 لاہور، ص 337 تا 341
13 جولائی	'ایک ٹانگ کا بادشاہ'	رسالہ "پھول" نمبر28 لاہور، ص 379 تا 382
13 جولائی	'جگنوؤں کا بادشاہ'	رسالہ "پھول" نمبر28 لاہور، ص 382 تا 384
20 جولائی	'ایک ٹانگ کا بادشاہ'	رسالہ "پھول" نمبر29 لاہور، 393 تا 397
28 جولائی	'ننھی چڑیا'	رسالہ "پھول" نمبر30 لاہور، ص 415 تا 418
17 اگست	'ہاتھیوں کی رانی'	رسالہ "پھول" نمبر33 لاہور، ص 453 تا 457
	'سورج مکھی کا پھول'	رسالہ "پھول" نمبر؟ لاہور، ص 577 تا 583
	'کنول کی شہزادی'	رسالہ "پھول" نمبر؟ لاہور، ص 603 تا 607
	'جاپان کے بونے درخت'	رسالہ "پھول" نمبر؟ لاہور، ص 609 تا 611
	'لیلیٰ کی کہانی تصویروں کی زبان'	رسالہ "پھول" نمبر؟ لاہور، ص 618 تا 620

1930ء

4 جولائی	'جلاوطن'	رسالہ "پھول" نمبر4 لاہور، ص 6 تا 9
4 جنوری	'سبز طوطہ (ایک افسانہ'	رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور، ص 26 تا 31
11 جنوری	'جلاوطن'	رسالہ "پھول" نمبر2 لاہور، ص 15 تا 18
18 جنوری	'جلاوطن'	رسالہ "پھول" نمبر3 لاہور، ص 29 تا 32
25 جنوری	'جلاوطن'	رسالہ "پھول" نمبر4 لاہور، ص 43 تا 48
15 فروری	'دنیا کی پہلی تیتری'	رسالہ "پھول" نمبر7 لاہور، ص 94 تا 96

19اپریل	'شہزادی سلوری'	رسالہ "پھول" نمبر26لاہور، ص 211 تا216
17 مئی	'بدصورت چڑیا'	رسالہ "پھول" نمبر20لاہور، ص 272 تا274
14جون	'سوئی ہوئی شہزادی'	رسالہ "پھول" نمبر24لاہور، ص 323 تا325
11اکتوبر	'میں گول ہے'	رسالہ "پھول" نمبر41لاہور، ص 577 تا585
	'الحمرا کے افسانے'	(واشنگٹن ارونگ کی مشہور تصنیف کا ترجمہ) لاہور

1931ء

14 مئی	'بہادر اقبال'	رسالہ "پھول" نمبر20لاہور، ص 267 تا269 (اناطول فرانس کی کہانی کا ترجمہ)
4جون	'بھوت کی آنکھیں'	رسالہ "پھول" نمبر23لاہور، ص 365 تا368

1932ء

نومبر	'جاپان کی شاعرہ عورتیں'	رسالہ "فردوس" جلد5 نمبر1لاہور، ص 5 تا7
نومبر	'دنیا کی پہلی تیتری'	رسالہ "فردوس" جلد5 نمبر1لاہور، ص 11 تا13
	'شہزادی کا سپنا'	(طبع زاد) رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، ص 76 (یہ کہانی صرف ایک صفحہ میں مکمل ہے)

1933ء

	'؟'	رسالہ "فلمستان" (خاص نمبر) لاہور (صرف صفحہ 43، 44 دستیاب ہیں)
	'مجسمہ'	رسالہ "کارواں" (سالنامہ) دہلی
	'محبت کا گیت'	رسالہ "کارواں" (سالنامہ) دہلی

1934ء

	'؟'	رسالہ "پھول" لاہور، ص 409 تا410

1935ء

5 جنوری	'ناول نویس'	رسالہ "تہذیب نسواں" لاہور
29 جون	"؟"	رسالہ "پھول" لاہور (صرف صفحہ 339 تا 341 دستیاب ہیں)
12 اکتوبر	"؟"	رسالہ "پھول" لاہور (صرف صفحہ 591 تا 592 دستیاب ہیں)

1936ء

'جزیرہ سخن وراں' (ناولٹ) رسالہ "شیرازہ" (ہفت روزہ) دہلی
(یہ ناولٹ 1936ء میں شائع ہونے لگا اور 1937ء تک جاری رہا)

1937ء

یکم جنوری	'بیری کا درخت'	رسالہ "شیرازہ" دہلی، ص 5، 6
8	'قوت ارادی کی درسگاہ' (ڈرامہ)	رسالہ "شیرازہ" نمبر 8 دہلی، ص 139 تا 191

1938ء

12	'دیوانہ شوہر' (ڈرامہ)	رسالہ "شیرازہ" نمبر 3 دہلی، ص 35 تا 39

1939ء

"آنندی"
"اندھیرے میں"
(مجموعہ "آنندی" میں ان دونوں افسانوں کا سن تصنیف 1939ء لکھا گیا ہے)

1940ء

12
"حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی" (شخصی خاکہ)

(غیر مطبوعہ؟)

اگست — '؟' — رسالہ "الہام" دہلی (صرف صفحہ 35 دستیاب ہے)

'کتبہ' — رسالہ "ادب لطیف" دہلی،

'سیاہ و سفید'

1941ء

"جزیرہ سخن وراں" کتاب خانہ ہزار داستان، نئی دہلی

'آنندی'، رسالہ "ادب لطیف" (افسانہ نمبر) دہلی

1942ء

1943ء

"سمجھوتہ"

1944ء

1945ء

یکم فروری — عسکری، محمد حسن "کچھ آنندی کے بارے میں" رسالہ "انصاری" (ماہنامہ) دہلی

26 اگست — 'ناک کاٹنے والے'، (قلمی مسودے کے آخر میں یہ تاریخ درج کی گئی ہے)

'چکر'

1946ء

30 جنوری — 'آنندی' (ریڈیو ڈرامہ)

'جادو کا لفظ یا گستاخ لڑکا' (بچوں کے لئے دو ایکٹ میں ایک کھیل) طبع دوم دارالاشاعت پنجاب،

لاہور

'آنندی'، 'ناک کاٹنے والے'، 'کتبہ'، رسالہ "نیا افسانہ" دہلی

(اس رسالے میں مجموعہ "آنندی" کے متعدد افسانے شائع ہوئے ہیں: مظفر علی سید)

'جل پری'

1947ء

'جواری'

'ہمسائے'

'حمام میں'

1948ء

29 مئی — خواجہ محمد عباس 'A Solid Tale of of Two Cities' اخبار "Blitz" کراچی

جولائی — 'ترکی ٹوپی'

رسالہ "ماہ نو" (فرانسیسی افسانے کا ترجمہ)

"آنندی" (افسانوی مجموعہ) مکتبہ جدید، لاہور

(اس مجموعے میں "جواری، ہمسائے، کتبہ، حمام میں، ناک کاٹنے والے، چکر، اندھیرے میں، سمجھوتہ، سیاہ و سفید اور آنندی" شامل ہیں)

نومبر — 'آنندی پر تبصرہ'، رسالہ "نگار" لاہور، ص 56

23 دسمبر — احتشام حسین 'آنندی پر تبصرہ' (یہ ریڈیو سے نشر کیا گیا)

1949ء

20 فروری — ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر "Anandi" (انگریزی ترجمہ)

تاریخ	عنوان	ماخذ
		اخبار "The Pakistan Times" کراچی
28 اپریل		ایس ایم عمر فاروق 'آنندی اور خم کاکل پر تبصرہ' (ریڈیو سے نشر کیا گیا)

1950ء

تاریخ	عنوان	ماخذ
جنوری		انتظار حسین 'تین افسانہ نگار' (غلام عباس، احمد علی، ممتاز مفتی) رسالہ "ماہ نو" کراچی، ص 22 تا 26
25 اکتوبر		"چند خطوط" (قلمی مسودہ)

1951ء

تاریخ	عنوان	ماخذ
12 مئی	'ایک آنکھ والا دیو'	رسالہ "پھول" لاہور
19 مئی	'؟'	رسالہ "پھول" لاہور
14 جولائی	'؟'	رسالہ "پھول" لاہور
21 جولائی	'؟'	رسالہ "پھول" لاہور
28 جولائی	'؟'	رسالہ "پھول" لاہور

1952ء

تاریخ	عنوان	ماخذ
10 مئی	'بھوت کی آنکھیں'	رسالہ "پھول" لاہور

1953ء

تاریخ	عنوان	ماخذ
فروری		خیال آراء (انتظار حسین) "اس تحریر میں، کتبہ" پر تبصرہ) رسالہ "خیال" لاہور، ص 31
فروری	'گوندنی والا تکیہ، قسط 1	رسالہ "ماہ نو" کراچی
مارچ	'گوندنی والا تکیہ، قسط 2	رسالہ "ماہ نو" کراچی
اپریل	'گوندنی والا تکیہ، قسط 3	رسالہ "ماہ نو" کراچی
مئی	'گوندنی والا تکیہ، قسط 4	رسالہ "ماہ نو" کراچی

جون	'گوندنی والا تکیہ' قسط 5	رسالہ "ماہ نو" کراچی
جولائی	'گوندنی والا تکیہ' قسط 6	رسالہ "ماہ نو" کراچی
اگست	'گوندنی والا تکیہ' قسط 7	رسالہ "ماہ نو" کراچی
ستمبر	'گوندنی والا تکیہ' قسط 8	رسالہ "ماہ نو" کراچی
اکتوبر	'گوندنی والا تکیہ' قسط 9	رسالہ "ماہ نو" کراچی
نومبر	'گوندنی والا تکیہ' قسط 10	رسالہ "ماہ نو" کراچی
دسمبر	'گوندنی والا تکیہ' قسط 11	رسالہ "ماہ نو" کراچی

1954ء

جنوری	'گوندنی والا تکیہ' قسط 12	رسالہ "ماہ نو" کراچی
فروری	'پتلی بائی'	رسالہ "ماہ نو" کراچی
اپریل	'ایک درد مند دل'	رسالہ "ماہ نو" کراچی
جولائی	"محبت روتی ہے" پبلشرز ادبی مرکز، دہلی	
اگست	'عسکری، محمد حسن، غلام عباس' رسالہ "سیارہ" لاہور	
ستمبر	'صغریٰ و کبریٰ'	رسالہ "ماہ نو" کراچی
اکتوبر	'حیا' (ڈرامہ)	رسالہ "ماہ نو" کراچی

1955ء

مارچ	'منٹو کی موت'	رسالہ "نقوش" (منٹو نمبر) لاہور ص 353 تا 354
اپریل	'چند خطوط'	رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 33 تا 35
جون	'اردو کا ایک غیر معروف ناول'	
	'افتاد جوانی'	رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 7 تا 11
اکتوبر	'اردو کے غیر معروف ناول (2) جنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا'	
		رسالہ "ماہ نو" کراچی
		"آنندی" (افسانوی مجموعہ) طبع دوم مکتبہ جدید لاہور

'آنندی' (افسانہ) رسالہ "نقوش" افسانہ نمبر لاہور ص 532 تا 548

1956ء

مارچ 'آپ بیتی' (افسانہ) رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 14 تا 16

اپریل 'زہریلی مکھی' (افسانہ) رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 26 تا 30

'انگریزی کے تین بڑے شاعر ملٹن، جان ڈرائڈن، الگزینڈر پوپ'
(غیر مطبوعہ)

1957ء

جنوری 'جیب کترا' (افسانہ) رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 24 تا 26

فروری 'حاضرات' (ڈرامہ) رسالہ "ماہ نو" کراچی ص 16 تا 20 ن 52

مارچ 'بامے والے' رسالہ "ماہ نو" کراچی

زینب عباس "Folk Tales of Pakistan"
کراچی

1958ء

1959ء

1960ء

جولائی

"جاڑے کی چاندنی" (افسانوی مجموعہ) سجاد کامران، کراچی
(اس مجموعے میں "اوورکوٹ، اس کی بیوی، بھنور، بامے والا، سایہ، سرخ جلوس، فینسی ہیر کٹنگ سیلون، بردہ فروش، تنکے کا سہارا، تیلی بائی، مکرجی بابو کی ڈائری، ایک دردمند دل، دو تماشے اور غازی مرد" شامل ہیں۔)

اکتوبر	'کتابوں کی باتیں' ("جاڑے کی چاندنی" پر تبصرہ) رسالہ "سات رنگ" کراچی، ص 59، 60

1961ء

25 جنوری	صفدر حسین (ڈاکٹر) 'جاڑے کی چاندنی پر تبصرہ' (یہ مضمون ریڈیو سے نشر کیا گیا۔)
جون	'ڈاکٹر گل کرسٹ کی عجیب لغت نگاری' رسالہ "اردو نامہ" (سہ ماہی) کراچی، ص 39 تا 43
جون	'For the Love of Her' ("اس کی بیوی" کا ترجمہ)
	رسالہ 1960-61ء "The Cultural Scene in Pakistan" کراچی، ص 5 تا 22
30 جولائی	بشیر نیاز 'غلام عباس سے ایک ملاقات' رسالہ "نصرت" (ہفت روزہ) لاہور
25 دسمبر	فیض احمد فیض 'Jazeera-e-Sukanwaran' (یہ مضمون ریڈیو سے نشر کیا گیا)
	'افسانہ میری نظر میں' رسالہ "ہم قلم" (ماہنامہ) کراچی، ص 9 تا 11
	"جزیرہ سخن وراں" (طبع دوم) سجاد کامران، کراچی

1962ء

18 فروری	'Jazeera-i-Sukhanwara' (تبصرہ) اخبار "DAWN"

1963ء

مارچ	'پھول' (رسالہ "پھول" کی 52 سالہ فائل کا

انتخاب) سجاد کامران، کراچی

20 اگست — 'کتابوں پر تبصرہ'، ("پھول" پر تبصرہ)

1964ء

1965ء

جولائی — 'چاند تارے'، (بچوں کے لئے نظمیں) گلڈ اشاعت گھر، کراچی

1966ء

مارچ — "جزیرہ سخن وراں" کتاب کار پبلی کیشنز، رام پور

1967ء

ایوب خاں "جس رزق سے آئی ہو پرواز میں کوتاہی" (ترجمہ غلام عباس) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی

1968ء

7 جولائی — الف جیم 'کہانی ایک افسانہ کی'، رسالہ "آئین" لاہور، ص 4

"جاڑے کی چاندنی" (دوسری اشاعت) سجاد کامران، کراچی

"آنندی" (طبع جدید) مکتبہ جدید، لاہور

'اوتار'، رسالہ "نیا دور" (افسانہ نمبر) کراچی، ص 167 تا 183

1969ء

جون — "کن رس" (افسانوی مجموعہ) المثال، لاہور

(اس مجموعے میں "کن رس، بہروپیا، جوار بھاٹہ، یہ پری چہرہ لوگ، بحران، سرخ گلاب، بچک اور اوتار" شامل ہیں)

جون
"دھنک" (ناولٹ) سجاد کامران، کراچی

1970ء

19 جولائی
'A Great Fiction Writer' ("کن رس" پر تبصرہ)
"The Pakistan Times" کراچی

اس زمانے میں 'آنندی' ماخوذ فلم "منڈی" بنائی گئی اور ڈرامہ 'گوندنی والا تکیہ' ٹی وی میں نشر کیا گیا۔

1971ء

نومبر
ستار طاہر 'غلام عباس کا افسانہ، دھنک' رسالہ "کتاب" لاہور، ص 23 تا 34
"نواب صاحب کا بنگلہ"

1972ء

'نواب صاحب کا بنگلہ' "1971ء کے منتخب افسانے" کراچی، ص 9 تا 11

1973ء

1974ء

'کن رس' ٹی وی میں ڈرامائی گئی۔
'رینگنے والے' رسالہ "نیا دور" شمارہ نمبر 56 تا 60 س ن کراچی، ص 13 تا 24

'رینگنے والے'، رسالہ "جریدہ پشاور" (2) پشاور، ص 249 تا 259

1975ء

1976ء

'راشد، چند یادیں'، رسالہ "نیا دور" (راشد نمبر) کراچی

1977ء

1978ء

17 مارچ — انتظار حسین 'غلام عباس افسانہ نگار نہ ہوتے تو موسیقار ہوتے'، اخبار "مشرق" لاہور

28 مارچ — 'صوفی غلام مصطفیٰ تبسم'، (غیر مطبوعہ)

10 جولائی — الف نون 'افسانہ کیا ہے'، (مشہور افسانہ نگار غلام عباس سے ایک گفتگو) اخبار "جنگ" کراچی، ص 2

1979ء

یکم فروری — 'دھنک'، رسالہ "اردو بک ڈائجسٹ" کراچی، ص 5 تا 24

1980ء

مئی — 'چغتائی کی چند یادیں'، "عبدالرحمٰن چغتائی --- شخصیت اور فن" (مرتبہ وزیر آغا ڈاکٹر) لاہور، ص 85 تا 109

1981ء

19جون	انجم رشید 'اردو کے معروف افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات' اخبار "حریت" کراچی
21جون	'غلام عباس سے انٹرویو' انگریزی رسالہ "MAG" کراچی
28اگست	'Honouring the Living Master' اخبار "DAWN" کراچی
4 ستمبر	'Is Short Story a Minor Genre?' اخبار "DAWN" کراچی
اکتوبر	'بندروالا' رسالہ "افکار" کراچی، ص 53 تا 59
اکتوبر	صہبا لکھنوی 'غلام عباس' (سوانحی خاکہ) رسالہ "افکار" کراچی، ص 27، 28
اکتوبر	ممتاز احمد خاں 'غلام عباس---بحیثیت افسانہ نگار' رسالہ "افکار" کراچی، ص 29 تا 31
27نومبر	عقیل عباس جعفری 'اردو کے اہم افسانہ نگار غلام عباس سے ملاقات' اخبار "حریت"

1982ء

جنوری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اردو افسانہ اور افسانہ نگاری" کراچی (اس میں "مجسمہ" (ص 109 تا 111) شامل ہے)
16جنوری	ڈاکٹر عبادت بریلوی 'غلام عباس کی افسانہ نگاری'
فروری	ڈاکٹر آصف فرخی Asif Aslam '3 Hours With Ghulam Abbas' رسالہ "Herald" کراچی
	"گوندنی والا تکیہ" آئینہ ادب، لاہور

25 جون	طاہر مسعود 'میرا اوور کوٹ گوگول کے اوور کوٹ سے مختلف ہے' اخبار "جسارت" کراچی
	ڈاکٹر آصف فرخی "آتش فشاں پر کھلے گلاب" کراچی
2 نومبر	'غلام عباس کے انتقال کے متعلق خبر' اخبار "DAWN" کراچی
4 نومبر	'غلام عباس کے انتقال کے متعلق خبر' اخبار "جنگ" کراچی
5 نومبر	علی حیدر ملک 'غلام عباس کے انتقال پر مضمون' اخبار "جسارت" کراچی
7 نومبر	سید انور 'غلام عباس پر مضمون' اخبار "DAWN" کراچی
11 نومبر	'Ghulam Abbas of Anandi' رسالہ "MAG" کراچی، ص 5 تا 7
12 نومبر	علی حیدر ملک 'ہم سب غلام عباس کے "اوور کوٹ" سے نکلے ہیں' اخبار "جسارت" کراچی
12 نومبر	سید انور 'غلام عباس کی یاد میں' اخبار "جسارت" کراچی
12 نومبر	سید انور 'غلام عباس کے لئے تعزیت' اخبار "امروز" لاہور، ص 18
12 نومبر	ستار طاہر 'غلام عباس کی یاد میں' اخبار "امروز" لاہور، ص 20
12 نومبر	'غلام عباس پر مضامین' اخبار "جنگ" کراچی
12 نومبر	'میں نے آنندی افسانہ کیوں لکھا' اخبار "جنگ" کراچی
12 نومبر	عصمت چغتائی 'غلام عباس کا افسانہ "سمجھوتہ"'

اخبار "جنگ" کراچی

12 نومبر	احتشام حسین 'غلام عباس پر مضمون' اخبار "جنگ" کراچی
12 نومبر	خالد احمد 'غلام عباس پر مضمون' اخبار "جنگ" کراچی
13 نومبر	'غلام عباس کا فن عالمگیر اور لازوال ہے' اخبار "اخبار خواتین" کراچی
19 نومبر	راغب شکیب 'جدید لکھاری کا خط غلام عباس کے نام' اخبار "جسارت" کراچی
19 نومبر	منظر امکانی 'ادب میں دردمندی' اخبار "امروز" لاہور
22 نومبر	شہزاد منظر 'عام انسانوں کا داستان گو غلام عباس' رسالہ "آہنگ" کراچی، ص 13، 14
22 نومبر	محشر بدایونی 'چند یادیں--- غلام عباس' رسالہ "آہنگ" کراچی، ص 15
22 نومبر	'اوورکوٹ' رسالہ "آہنگ" کراچی، ص 16، 17
3 دسمبر	علی حیدر ملک 'پریس کلب میں غلام عباس مرحوم کی یاد' اخبار "جسارت" کراچی
11 دسمبر	خواجہ احمد عباس 'جہاں لنگڑے لولے مسکراتے رہے--- میں! (غلام عباس کی یاد میں)' اخبار "Blitz" کراچی
24 دسمبر	راغب شکیب 'غلام عباس کی یاد میں' اخبار "جسارت" کراچی
دسمبر	'غلام عباس--- دھیمے لہجے کا افسانہ نگار' رسالہ "پندرہویں صدی" کراچی، ص 45، 46
	شہزاد منظر 'غلام عباس سے انٹرویو' رسالہ "ادب لطیف" لاہور

1983ء

7 جنوری	راغب شکیب 'غلام عباس کی یاد میں'، اخبار "جسارت" کراچی
جولائی	قائم نقوی 'افسانے کا ایک دور غلام عباس'، رسالہ "ماہ نو" لاہور
جولائی	محمود الحسن 'غلام عباس کا چھوٹا تجربہ--- آنندی'، رسالہ "ماہ نو" لاہور
جولائی	عالم خاں 'غلام عباس--- نئے عہد کا داستان گو'، رسالہ "ماہ نو" لاہور
جولائی	'یہ پری چہرہ لوگ'، رسالہ "ماہ نو" لاہور
یکم نومبر	سید انور 'غلام عباس کی برسی پر عقیدت کے پھول'، (غیر مطبوعہ)
	'ناک کاٹنے والے'، "کہانیاں" (مرتبہ، ڈاکٹر مغنی تبسم، وحید انور) بمبئی، ص 350 تا 359
	'چشم و چراغ'، "کہانیاں" (مرتبہ، ڈاکٹر مغنی تبسم، وحید انور) بمبئی، 360 تا 363
	'White Man' s Burden' (ترجمہ، خالد حسن) "Urdu Short Stories from Pakistan" دہلی، ص 11 تا 21
	'The Overcoat' ترجمہ زینب عباس "Urdu Short Stories from Pakistan" دہلی، ص 135 تا 141
	محمد صادق "Twentieth Century Urdu Literature" کراچی
	آصف فرخی 'غلام عباس سے انٹرویو'، رسالہ "جائزہ" پشاور

1984ء

"اوورکوٹ" (انگریزی ترجمہ، زینب عباس)
"Selected Short Stories
from Pakistan" (مرتبہ احمد علی) اسلام آباد،
ص 99 تا 106
"زندگی، نقاب، چہرے" مکتبہ دانیال، کراچی

1985ء

مئی — ستار طاہر "آئینہ وطن" (فینسی ہیر کٹنگ سیلون) رسالہ "تقاضے" لاہور

جون — ستار طاہر "آئینہ وطن" (دھنک) رسالہ "تقاضے" لاہور

'اوورکوٹ' (جاپانی ترجمہ آسادہ یوتاکا) رسالہ "ہندوستانی ادب" ٹوکیو
یونس جاوید 'حلقہ ارباب ذوق' لاہور
طاہر مسعود 'یہ صورت گر کچھ خوابوں کے' کراچی
محمد صادق "A History of Urdu Literature" طبع دوم کراچی، ص 591
رام لعل 'اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا' دہلی، ص 12، 15، 56

1986ء

'راشد چند یادیں' "ن۔ م راشد--- ایک مطالعہ" (مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی) کراچی، ص 54 تا 60

19 نومبر — 'اوورکوٹ' (انگریزی ترجمہ اشفاق نقوی، اخبار

"The Pakistan Times" ص 3، 4

1987ء

"گوندنی والا تکیہ" (دوسری اشاعت) آئینہ ادب، لاہور

1988ء

"فینسی ہیر کٹنگ سیلون" (انگریزی ترجمہ، وقاص احمد خواجہ) لاہور، ص 169، تا 182

ڈاکٹر انور احمد 'اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ملتان، ص 253 تا 274

انتظار حسین 'غلام عباس ملاقاتیں، لاہور، ص 20 تا 22

حکیم احمد شجاع 'لاہور کا چیلسی، لاہور

1989ء

ڈاکٹر آصف فرخی 'حرف من و تو، کراچی، ص 29 تا 48

1990ء

ڈاکٹر فردوس انور قاضی "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" کوئٹہ، ص 367 تا 376

اپریل — 'گوندنی والا تکیہ، (جاپانی ترجمہ، سویامانے) رسالہ "اردو ادب (۱)" ٹوکیو

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی 'غلام عباس، "باتیں" لاہور ص 39 تا 42

"زندگی، نقاب، چہرے" (طبع دوم) مکتبہ دانیال،

کراچی

1991ء

جنوری	ڈاکٹر سلیم اختر 'غلام عباس کے مرد و زن کی دنیا' رسالہ "ماہ نو" لاہور، ص 18 تا 24
مارچ	شہزاد منظر "غلام عباس--- ایک مطالعہ" لاہور
مارچ	ڈاکٹر صغیر افراہیم "اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل" علی گڑھ، ص 193 تا195، 210، 211
جون	ممتاز احمد خاں 'گوندنی والا تکیہ'، رسالہ "قومی زبان" جلد 23 کراچی، ص 55 تا 58
جولائی	شمیم احمد 'غلام عباس کے افسانے'، رسالہ "دائرے" کراچی، ص 9 تا 24
	ڈاکٹر جمیل جالبی "معاصر ادب" لاہور
نومبر	'گوندنی والا تکیہ'، (جاپانی ترجمہ، سویامانے) رسالہ "اردو ادب (3)" ٹوکیو
دسمبر	"آنندی" (11 افسانوں کا جاپانی ترجمہ، سویامانے) اوساکا جاپان
	ڈاکٹر سلیم اختر "افسانہ اور افسانہ نگار" لاہور

1992ء

اگست	"دھنک" (طبع دوم) مکتبہ دانیال، کراچی
	"زندگی، نقاب، چہرے" (طبع سوم) مکتبہ دانیال، کراچی
دسمبر	'دھنک (۱)' (جاپانی ترجمہ: سویامانے) رسالہ "اردو ادب (4)" ٹوکیو

1993ء

'دھنک (2)' (جاپانی ترجمہ : سویامانے) رسالہ "اردو ادب (5)" ٹوکیو سویامانے 'دھنک کی اشاعت پر تحقیقی جائزہ' رسالہ "اردو ادب (5)" ٹوکیو

1994ء

فضل جعفری 'غلام عباس کا افسانوی ادب' رسالہ "سوغات" محمد حسن عسکری "مجموعہ محمد حسن عسکری" لاہور

ضمیمہ

غلام عباس کی تحریروں کے عکس

(مشفق خواجہ کے پاس محفوظ ہیں)

بہ انتہائی ... مس گلبرٹ سے بات ... کرنے سے پہلے
(بس مزاج پرسی کرتے) ... ناواقف کراچی

ریاض نے جھٹ جواب دیا "یہ بیڑی بیچنے والوں کے نمائندے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں ہماری ہمدردی ساتھیوں کے ساتھ ہے۔"

اب سونٹے دار مست فقیر مس گلبرٹ کی بالکنی کے بالکل نیچے پہنچ گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے "شاہ مدو" کا نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی مس گلبرٹ کے چہرہ پر بھی نظر پڑی اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ مس گلبرٹ نے خاص طور پر اس فقیر کے کئی فوٹو لیے۔

پانچ سات منٹ کے بعد یہ جلوس دوسرے موڑ پر پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے چائے کی پیالیاں اور دوسرا سامان ٹوکری میں ڈالا اور بالکنی سے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مس گلبرٹ راستہ بھر میرا اور ریاض کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ اس نے کہا:

"میں اس جلوس کا حال اپنی ممی اور پاپا کو آج ہی لکھ کر بھیجوں گی۔"

ٹیکسی ہوٹل کے پاس پہنچی تو میری جان میں جان آئی۔ ریاض کا چہرہ کامرانی سے چمک رہا تھا اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔ مس گلبرٹ کے رخصت ہونے سے پہلے ریاض نے پیش بندی کے طور پر اس کو بتا دیا کہ آج کل چونکہ حکومت اور رعایا میں مفاہمت ہو چکی ہے اس لیے ہمارے لیڈروں نے تمام اخبارات کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی ایسی تصویر یا خبر چھپنے نہ پائے جس سے دونوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اخبار اس جلوس کی خبر یا تصویر چھاپے۔

مس گلبرٹ کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ایک معقول رقم کا چیک کاٹ کر ریاض کو دیا اور کہا "جہاں آپ نے میرے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے وہاں اتنی تکلیف اور کیجیے گا کہ یہ حقیر سی رقم میری طرف سے ان غریب ساتھیوں کو دے دیجیے گا۔"

چیک لے کر ریاض جلد ہی رخصت ہو گیا۔ اس سوانگ کے یوں خیر و خوبی سے سرانجام پا جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کر ریاض بھاگا ...

"ارے غضب ہو گیا" اس نے کہا "اس دن والے مذاق نے کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیا ہے۔"

پھر کچھ بتائے بغیر وہ مجھے زبردستی کھینچتا ہوا ہوٹل سے باہر لے گیا جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی اور ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

Name : Ghulam Abbas

Date of Birth : 17th. Nov. 1909

Place of Birth : Amritsar (India)

Education :

High Proficiency (Urdu) } Punjab University
Faculty of Arts (English) }

Career :

1928 to 1937 : Editor Phool (Children's weekly in Urdu) Lahore
Asstt. Editor Tehzib-i-Niswan (women's weekly in Urdu) Lahore
Also wrote several plays for All India Radio, Delhi

1937 to 1938 : Hindustani News Translator, All India Radio, Delhi
~~Also broadcast literary talks ... produced ... plays ... features~~

1938 to 1947 : Editor Awaz (Urdu) and Sarang (Hindi) — fortnightly journals of All India Radio, Delhi
Also broadcast stories, and literary talks and produced plays & features.

1947 to 1948 : Editor Ahang — Urdu ~~journal~~ fortnightly journal of Radio Pakistan, Karachi

1948 to 1949 : Assistant Director of Public Relations Ministry for Kashmir Affairs, Government of Pakistan

غلام عباس کے مختصر حالات ان کے اپنے قلم سے۔

1947 — In B.B.C. as writer & producer of Urdu features talks etc.

Some of the Published works :

(1) Alhamra ke Afsane - An Urdu translation of Washington Irving's Alhambra (1936)

(2) Jazeera-i-Sukhanwaran - A novel (1941)

(3) Anandi - A collection of ten short stories, awarded Government Literary prize for the best book of 1948.

Hobby : Music.

اوورکوٹ

جنوری کی ایک ٹھٹھرتی شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے
گزر کر مال روڈ پر پہنچا۔ اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں
پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم
ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے
کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج
میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا۔
سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی۔ سفید سلک کا
گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا۔ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں
بید کی ایک چھوٹی سی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے
گھمانے لگتا تھا۔

یہ بھرپور جاڑے کا زمانہ تھا۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی
طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی۔ مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم
ہوتا تھا۔ اور لوگ اپنے کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر
اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے
ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے
دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے۔ مگر وہ چھڑی کے
اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کے رکی۔ مگر اس نے
"نو تھینک یو" کہہ کے اسے بھی ٹال دیا۔

جوں جوں وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا۔
اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک
انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے
اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا۔ تو یکبارگی کچھ ایسا
جوش آیا۔ کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی۔

مشہور افسانہ اوورکوٹ کے مسودے کے ابتدائی دو صفحات۔

گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی۔ جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ مگر
اس وقت شام کے دھندلکے اور سرد کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اُداسی
برس رہی تھی۔ کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ اور سیدھا چیرنگ کراس کی
طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بُت کے قریب پہنچ کے اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت
پیدا ہو گئی۔ اُس نے اپنا رومال نکالا۔ جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے
کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا۔ اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ
کچھ گرد جم گئی ہو تو جھڑ جائے۔ پاس ہی گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز
بچے ایک موٹی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل
دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تک تو اس کی نظروں کی پروا کیے بغیر کھیل میں
مصروف رہے۔ مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا۔ تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے
لگے۔ اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے
ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی۔ اور
وہ اس پر آکے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ
سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر اس کی یہ شدت ناگوار نہ تھی
بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا
وہ تو اس سردی میں کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا تھا۔ تنہائی میں بسر کرنے
والے بھی اس سردی سے ورغلائے جاتے تھے۔ اور وہ اپنے کونوں
کھدروں سے نکل کر محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگے تھے تاکہ جسم
کا قرب حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی
تھی۔ اور وہ حسب توفیق تھیٹروں، ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں،
سنیماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا تو بندھا ہوا تھا
ہی مگر پٹڑیوں پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی

دفتر آہنگ

١٧ - گارڈن روڈ

کراچی ۔ ٣

محترمہ مسز حجاب امتیاز علی

تسلیم - میں پچھلے دنوں بہت علیل ہوگیا اور ابھی تک ہوں ۔ اسلئے آپکے ارشاد کی فوری طور پر تعمیل نہ کرسکا - بہرحال میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ساقی کے چار پرچے ایسے نکالے ہیں جن میں آپکی تحریریں شامل ہیں - یہ سب پرچے تقسیم ہند سے پہلے کے ہیں - تفصیل یہ ہے:

١ - "میری نانی کی طرف دیکھئے" ساقی مئی ١٩٤٤ء

٢ - "وہ دوپہر" ساقی جنوری ١٩٤٥ء

٣ - "بلانوش" ساقی مشترکہ جنوری فروری ١٩٤٧ء

٤ - "دروازے" ساقی مشترکہ جولائی اگست ١٩٤٧ء

اب آپ کہئے - کہ آپ کو ان چاروں افسانوں کی

حجاب امتیاز علی تاج کے نام خط کا ابتدائی مسودہ۔

اردو افسانے کی ترقی

غلام عباس کے ایک نامکمل مضمون کا پہلا صفحہ۔

سویا مانے یاسر

ISBN - 969 - 35 - 0647 - 2

Rs. 210.00